ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کمرہ عدالت میں ابھی جج صاحب تشریف نہیں لائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرہ مختلف افراد کی باتوں کی بھنبھناہٹ سے گونج رہا تھا۔نشستیں تقریباً سب ہی پُر تھیں۔ ان میں مقدمے سے متعلقہ افراد کے علاوہ فرنٹ پینل پر موجود رہنے والے جیوری کے چند ارکان، سینئر وکلاء، پی پی، اسسٹنٹ پبلک پراسیکیوٹر بشمول اپرنٹس وکیل اور صحافی برادری سے متعلق بھی کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ بیک وقت ان سب افراد کی موجودگی زیرِ سماعت مقدمے کی اہمیت کو نمایاں کر رہی تھی۔ یہ کیس دراصل ملزم کی طرف کی گئی نظرِ ثانی کی اپیل اور وکیل صفائی کی جج کو دی گئی خصوصی درخواست کی منظوری کے بعد ایک عدالت (ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن) سے دوسری عدالت (ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ) میں نظرِ ثانی کے لئے آیا تھا۔ملزم قتل کے جرم میں ماخوذ تھا جو صحت جرم سے انکاری تھا۔

ایک ڈیڑھ ماہ قبل...... جس عدالت میں یہ کیس لڑا جا رہا تھا...... وہاں مذکورہ قابل وکیل صفائی کی گھاگ نظروں نے متعلقہ کورٹ کے جج کی جانبداری اور استغاثہ سے درونِ خانہ معاملہ داری کو بھانپتے ہوئے اوپری عدالت میں درخواست منتقلی کیس دے دی تھی جو بعدہ منظور بھی کر لی گئی...... اس قابل وکیل کا نام سعدیہ سعید تھا جو متحیر کر دینے والی شخصیت کے ساتھ اپنی سیٹ پر براجمان تھی۔ اس کے کومل چہرے کی ملاحت سے یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ایسی نازک اندام دوشیزہ بھی وکالت جیسے خشک اور دماغ سوز پیشے سے تعلق رکھ سکتی ہے۔ اسے تو یہاں ہونے کے بجائے خواہشوں اور آرزوؤں کے پُر بہار گلشن میں چنچل سی فضاؤں کے سنگ اپنے کسی من موہن سے خوابوں کے شہزادے کا محوِ انتظار ہونا چاہئے تھا۔ بھلا عدالت کی اس خشک فضا میں اس سندر کلی اور قوس قزح کے رنگوں والی تتلی کا کیا کام......؟ مگر وہ تتلی عزمِ مصمم کی طرح

یہاں موجود تھی...... لیکن وہ شوخ رنگوں سے مبرا تھی اس کا بظاہر نرم وجود جو سیاہ گاؤن میں ملفوف تھا۔ بڑی بڑی آندھیوں کے آگے خم ٹھونک کر ان سے نبرد آزما ہونے کا عزم رکھتا تھا...... وہ بمشکل اٹھائیس کے پیٹے میں تھی...... چہرے میں گہری جاذبیت اور کشش تھی۔ چہرے پر بردبارانہ اور سنجیدہ سی مسکراہٹ تھی۔ سانولی رنگت میں بھی اس میں ایک انوکھا نکھار تھا۔

جب ریڈر اپنی میز پر رکھی دیوہیکل الیکٹرونک ٹائپنگ مشین کے سامنے کچھ دیر بعد شروع ہونے والے مقدمے کی روداد کو لفظوں کے ذریعے صفحۂ قرطاس میں منتقل کرنے کے لئے آ کر براجمان ہوا تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد...... جج صاحب بھی تشریف لے آئے، یکبارگی کمرۂ عدالت میں بارعب سناٹا سا چھا گیا۔ جج کے چہرے پر سیاہ فریم کی نفیس عینک تھی۔ عمر پچاس سے کسی قدر متجاوز تھی۔ جج نے اپنے سامنے رکھی کیس کی فائل کو سرسری سا دیکھا...... پھر عینک کے اوپر سے وکیل سرکار کی طرف گمبھیر نگاہوں سے دیکھا اور وکیل سرکار جج کا اشارہ سمجھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا...... اثنائے راہ...... ملزم کو بھی ہتھکڑیوں سمیت کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ پچیس چھبیس سال کا ایک سادہ لوح نوجوان نظر آ رہا تھا...... اپنی وضع قطع سے وہ اندرون سندھ کے کسی دور افتادہ گوٹھ کا باسی محسوس ہوتا تھا...... لیکن اس وقت وہ کسی عقوبت خانے کا گھائل زنداں نشین نظر آ رہا تھا۔

"جی......!" جج نے وکیل سرکار کو قریب آتے دیکھ کر گمبھیر آواز میں کہا۔ مقصد سماعت شروع کرنا تھا۔

"جناب عالی!" وکیل سرکار نے کہنا شروع کیا۔ "ملزم قتل جیسے سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے اور کسی بھی طور پر ضمانت کا حقدار نہیں۔"

"مسٹر پراسیکیوٹر! بہتر ہوگا کہ آپ پہلے عدالت کو ملزم کے جرم سے متعلق مختصراً آگاہ کریں...... کیونکہ واقعاتی بحث کا مرحلہ ابھی آگے ہے۔" جج نے معاً بارعب انداز میں وکیل سرکار کو ٹوکتے ہوئے کہا اور وہ خفیف سا نظر آنے لگا...... درحقیقت اسے اس بات کا ادراک پہلے ہی سے ہو چکا تھا کہ وکیل صفائی ملزم کی سب سے پہلے ضمانت کروانے پر زور دے گا اور کوئی بعید بھی نہ تھا کہ وہ درخواست ضمانت جمع بھی کروا چکا



ہو۔ بہتر طور، وہ پھر یکدم ذرا محتاط انداز میں بولنا شروع ہوا۔

"جناب عالی! ملزم دادمحمد عرف دادو...... جو اندرون سندھ کے کسی گمنام علاقے سے تعلق رکھتا ہے وہ لگ بھگ چار ماہ قبل شہر آیا اور مقتول خورشید احمد نامی مالک مکان کی بالائی منزل میں کرائے دار کی حیثیت سے رہنے لگا۔ اسی دوران ملزم دادو اپنے مالک مکان، جو ملزم دادو کا ایک طرح سے محسن بھی تھا، کیونکہ مقتول نے اسے نہ صرف اپنے مکان کی بالائی منزل میں پناہ دی تھی بلکہ روزگار سے بھی لگوایا تھا، کی اکلوتی جوان بیٹی پر بری نگاہ رکھی اور اس معصوم کو چکنی چپڑی باتوں میں لا کر پھانسنے کی کوشش کی...... لیکن ادھر لڑکی کے باپ یعنی مقتول خورشید احمد نے بھانپ لیا کہ ملزم دادمحمد عرف دادو نے محسن کشی کرتے ہوئے اس کے گھر میں سیندھ لگانے کی قبیح حرکت کی ہے...... تو اس نے ملزم دادو کو متنبہ کرتے ہوئے فی الفور اپنے مکان کی بالائی منزل خالی کرنے کا حکم دیا۔ ادھر جب ملزم نے دیکھا کہ اس کی "چوری" پکڑ لی گئی ہے تو اس نے اپنے گھناؤنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اپنی راہ کے "کانٹے" خورشید احمد کو چھ مارچ بروز منگل، پانچ بجے موقع پاتے ہی قتل کر ڈالا۔ اسی اثناء میں مقتول کی اکلوتی بیٹی شمائلہ بھی سوئے اتفاق واردات کے وقت وہاں آن پہنچی اور ملزم کو آلۂ قتل سمیت اور اپنے باپ کی خون میں لت پت لاش کو دیکھ کر غش کھا کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ تب محلے کے دیگر لوگ بھی جائے وقوع پر آناً فاناً جمع ہو گئے اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملزم کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر حوالہ پولیس کر دیا۔ جناب والا...... وکیل استغاثہ آخر میں گویا اپنی ذہانت کی آخری کیل ٹھونکتے ہوئے پرزور لہجے میں بولا۔ "ملزم دادمحمد عرف دادو ان نکمے اور نکھٹو جرائم پیشہ نوجوانوں سے تعلق رکھتا ہے جو کسی تاریک اور پسماندہ گوٹھ یا گاؤں سے شہر کے خواب دیکھ کر اور راتوں رات دولت مند بننے کے چکر میں شارٹ کٹ مارنے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں اور پھر اپنی حد سے بڑھی ہوئی طمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے...... لہٰذا میری معزز عدالت سے گزارش ہے کہ ملزم دادمحمد عرف دادو کو قتل جیسے سنگین اور بہیمانہ جرم کی پاداش میں قرار واقعی سزا سنائے۔ تھینک یو...... یور آنر......!" وکیل استغاثہ اپنی پیشانی پر رومال پھیرنے لگا۔ اس کی بات مکمل ہوتے ہی جج نے پوچھا۔ "استغاثہ کے گواہ کتنے

ہیں؟"

"جناب والا! یوں تو پورا محلہ ہی گواہ ہے مگر میں معزز عدالت کے قیمتی وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف چھ چشم دید گواہوں کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا...... جن میں سے ایک مقتول کی بیٹی شائلہ بھی ہے۔" وکیل استغاثہ کی اس بات پر اپنی باری کی منتظر وکیل صفائی سعدیہ سعید ذرا چونکی...... لیکن پھر پُرسکون نظر آنے لگی۔

ادھر جج نے وکیل سرکار کی بات سننے کے بعد فی الحال گواہ پیش کرنے کی اجازت کا فیصلہ محفوظ رکھتے ہوئے وکیل صفائی سعدیہ سعید کی طرف دیکھا۔

"جناب عالی......!" وکیل صفائی سعدیہ سعید اپنی باری آتے ہی چہرے پر ہلکی سی بردبارانہ مسکراہٹ لئے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔"یوں تو فاضل وکیل نے اپنے تئیں میرے مؤکل داد محمد عرف دادو کے بارے میں عدالت کو دانستہ کچھ حقائق چھپاتے ہوئے جس تفصیل سے آگاہ کیا ہے ان میں کئی اہم باتیں ابھی قابل ذکر ہیں...... جو بلا شبہ میرے موکل داد محمد عرف دادو کی بے گناہی کا پورا پورا احاطہ کرتی ہیں۔ بہر کیف سب سے پہلے معزز عدالت کے نوٹس میں ایک بات لانا چاہوں گی کہ مقتول خورشید احمد کی بیٹی شائلہ استغاثہ کے گواہان میں شامل نہیں ہے۔" سعدیہ سعید اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

جج نے قدرے تیز لہجے میں وکیل استغاثہ سے پوچھا۔"کیا یہ بات درست ہے کہ مقتول کی بیٹی شائلہ استغاثہ کے گواہوں میں شامل نہیں......"

وکیل استغاثہ کچھ ششپٹا سا گیا مگر اپنی ہٹ پر قائم رہا اور ڈھٹائی سے بولا۔"جی...... جی...... بالکل جناب والا......" اس پر وکیل صفائی سعدیہ سعید ترنت بولی۔"جناب والا اگر یہ سچ ہے تو استغاثہ کو حکم دیا جائے کہ سب سے اہم گواہ مقتول کی بیٹی شائلہ کو پیش کریں۔ کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے معزز عدالت کے استفسار پر اقرار کیا تھا کہ استغاثہ کے تمام گواہ بشمول مقتول کی بیٹی شائلہ یہاں موجود ہیں۔"

اب وکیل استغاثہ کی گھبراہٹ دیدنی تھی اور سعدیہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ استغاثے کی اہم گواہ شائلہ سے متعلق وکیل سرکار نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا ہے۔



جج نے سعدیہ کی بات پر ایک بار پھر قدرے تیز نگاہوں سے وکیل سرکار کی جانب دیکھا......"جی! اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں مسٹر پراسیکیوٹر......! کیا آپ کے کہنے کے مطابق استغاثے کی اہم گواہ شائلہ یہاں موجود ہیں۔"

جج کی بات پر وکیل استغاثہ پھر جزبز سا ہوا۔ غالباً اسے بالکل اس بات کی توقع نہ تھی کہ اس کی چوری یوں فوراً پکڑ لی جائے گی تاہم وہ جواباً قدرے سنبھل کر بولا۔

"جج...... جی...... جناب والا......! میں معافی چاہتا ہوں کہ روا روی میں یہ کہہ گیا...... دراصل باپ کے اچانک قتل ہونے پر اس کی حالت ابھی صحیح طرح سنبھل نہیں پائی ہے۔ لہٰذا فی الحال میں اسے پیش نہیں کر سکتا۔"

جج نے ذرا برہمی سے وکیل استغاثہ کو گھورا اور پھر وکیل صفائی سعدیہ سعید کی طرف متوجہ ہوا۔"جی محترمہ! آپ اپنی تفصیل شروع کریں۔"

"تھینک یو...... یور آنر......" وکیل صفائی سعدیہ نے کہا اور ازسرنو بولنا شروع کیا۔

"جناب عالی! میرا مؤکل داد محمد عرف دادو اندرون سندھ کے کسی گمنام علاقے سے نہیں بلکہ دیہہ گڑھی خیر محمد سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بلاشبہ وادئ مہران کا ایک خوبصورت اور معروف قصبہ ہے اور میرا مؤکل وہاں ایک اچھا ریکارڈ رکھتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ غربت کی چکی اور کچھ وہاں کے وڈیرا شاہی......"

"آبجیکشن یور آنر......" وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض کیا۔

"آبجیکشن اوور رول......" جج نے اعتراض مسترد کرتے ہوئے کہا۔"ابھی عدالت کیس سے متعلق طرفین سے آگاہی لے رہی ہے لہٰذا جب عدالت باقاعدہ کارروائی اور جرح کے مرحلے میں داخل ہو گی، تب اعتراضات کا حق دیا جائے گا آپ کو...... جی محترمہ......!" جج نے آخر میں سعدیہ کو مخاطب کیا۔

"تھینک یو...... یور آنر......" سعدیہ نے پھر کہنا شروع کیا۔"جناب والا! میرا موکل داد محمد عرف دادو اپنے گوٹھ کے جابرانہ ماحول سے تنگ آ کر اور اپنے بوڑھے ماں باپ کو قرض کی زنجیروں سے نجات دلانے کی خاطر...... شہر محنت مزدوری کے لئے آیا تا کہ واپس گوٹھ جا کر وڈیرے کا کبھی نہ ختم ہونے والا قرض لوٹا کر اور اس کی نجی قید میں اس کی زمینوں پر بیگار کاٹتے ہوئے اپنے ماں باپ کو بھی آزاد کروا سکے۔ بہر طور شہر آ کر

میرے سادہ لوح اور معصوم مؤکل دادو سے خورشید احمد کی ڈرامائی بلکہ کسی قدر قابل رحم حالت میں ملاقات ہوئی۔ مقتول خورشید جو کافی عرصے سے بلڈ پریشر کا مریض تھا، راہ چلتے اچانک چکرا کر گر پڑا...... اور دادو...... سوئے اتفاق وہاں موجود تھا۔ یاد رہے میرا مؤکل چونکہ اپنے گوٹھ کے ایک حکیم کے پاس بھی کام کرتا رہا تھا جو حکمت کے علاوہ ایلوپیتھک علاج بھی کرتا تھا...... لہٰذا میرے مؤکل کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے پاس چند مخصوص امراض میں فوری مستعمل جڑی بوٹیاں رکھتا تھا لہٰذا اس نے فوراً مقتول خورشید احمد کو سنبھالا اور جیب سے کوئی بوٹی نکال کر اسے سنگھائی تب مقتول خورشید احمد کی طبیعت حیرت انگیز طور پر سنبھلنے لگی اور پھر میرا مؤکل اسے انسانی ہمدردی کے تحت خورشید احمد کو اس کے بتائے ہوئے گھر کے پتے پر چھوڑنے بھی آیا۔ ادھر خورشید احمد کو دادو کی انسانی ہمدردی نے بڑا متاثر کیا...... اور تب اس نے بھی میرے مؤکل دادو کی مدد کرنی چاہی اور اسے اپنے مکان کی بالائی منزل جہاں صرف ایک ہی کمرہ اور صحن تھا، رہنے کے لئے دیا لیکن میرے مؤکل کو یہ منظور نہ تھا لہٰذا اس نے پھر اس شرط پر رہنے کی حامی بھری کہ وہ خورشید احمد کو باقاعدہ کرایہ ادا کرے گا۔ خورشید احمد کو بالآخر دادو کی خودداری اور وضع داری کے آگے مجبور ہوکر کرایہ طے کرنا پڑا یوں ایک ہزار ماہانہ کرایہ طے پایا۔ جس کی ادائیگی کی باقاعدہ رسیدیں میرے پاس محفوظ ہیں جو بعد میں معزز عدالت کے سامنے پیش کروں گی۔ ادھر میرا مؤکل شہر ہی کے ایک کوئکس (کمپاؤنڈر ڈاکٹر) کے پاس شام کو اس کی چھوٹی ڈسپنسری میں کام کرنے لگا اور صبح میں ایک میڈیکل اینڈ جنرل اسٹور میں بطور سیلز مین کے مصروف کار رہا۔ میرا مؤکل اپنے گوٹھ کے اسکول سے مڈل پاس ہے......" وکیل سعدیہ نے لمحہ بھر توقف کے بعد پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "جناب والا! واردات کے روز میرا مؤکل دادو پورے دو بجے صبح کی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر گھر آیا۔ یاد رہے کہ بالائی منزل کے لئے الگ راستہ تھا جو مالک مکان کی نچلی منزل کے داخلی دروازے کے بازو پر ہی سیڑھیوں کی صورت میں اوپر چلا جاتا تھا۔ بہر طور میرا مؤکل دادو اپنی بالائی منزل پر واقع کمرے کی سیڑھیوں کے دروازے کا تالا کھول کر سب سے پہلے اپنے کمرے میں آیا...... وہاں دو گھنٹے اس نے آرام کیا پھر ٹھیک چار بجے وہ مذکورہ ڈسپنسری چلا گیا جو محلے ہی میں واقع تھی۔ وہاں پہنچ



کر اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے کچھ گولیوں کا بلسٹر خورشید احمد کو دینا تھا...... جو اس نے صبح کو دادو سے اپنے لئے منگوائی تھیں۔ لہٰذا خورشید احمد کو مذکورہ گولیوں کا بلسٹر پیکٹ دینے کے لئے دادو پھر گھر لوٹا۔ ہر چند کہ میرے مؤکل کو بلا روک ٹوک مالک مکان کے گھر آنے جانے کی اجازت تھی مگر باوجود اس کے وہ ہمیشہ دروازے پر دستک دے کر ہی اندر داخل ہوتا تھا۔ وقوعے والے روز بھی اس نے پہلے دروازے پر ٹھیک پانچ بجے دستک دی مگر جواب ندارد...... میرے مؤکل نے چونکہ مقتول خورشید احمد کو بہر صورت دوائیں دینی تھیں...... لہٰذا اس نے جب ذرا ہمت کر کے دروازے کو دھکیلا تو وہ اندر سے کھلا ہوا تھا وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا تو صحن میں مقتول خورشید احمد کو خون میں لت پت دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ وہ فوراً اس کی جانب بڑھا۔ اسی اثناء میں مقتول کی بیٹی شمائلہ بھی آن پہنچی۔ یاد رہے...... وقوعے کے وقت شمائلہ بھی گھر موجود نہ تھی...... وہ پڑوس میں تھی۔ باپ کی لاش دیکھ کر وہ ہذیانی انداز میں چیخیں مارنے لگی اور بے ہوش ہوگئی۔ پھر محلے کے کچھ لوگ وہاں اکٹھے ہوتے چلے گئے...... نتیجتاً انہوں نے میرے سادہ لوح مؤکل دادو کو خورشید احمد کا قاتل سمجھ لیا اور اسے حوالۂ پولیس کر دیا...... یور آنر......" وکیل صفائی سعدیہ سعید چند ثانیے تھمنے کے بعد پرزور لہجے میں دوبارہ بولی۔

"ان تمام باتوں کے تناظر میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ میرے مؤکل کے جائے واردات پر پہنچنے سے قبل ہی مقتول خورشید احمد کو کوئی دوسرا شخص قتل کر کے جا چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق قتل ساڑھے چار بجے ہوا جبکہ میرا مؤکل چار بج کر پینتالیس منٹ پر مذکورہ ڈسپنسری سے نکلا اور راہ میں مزید پندرہ منٹ صرف ہوئے۔ ان سب باتوں کے گواہ اور ثبوت میں معزز عدالت کو پیش کروں گی...... لیکن اس سے پہلے میری عدالت سے درخواست ہے کہ میرے مؤکل کو...... جو پہلے ہی جیل میں ہے، فوری ضمانت کا مستحق ہے کیونکہ یور آنر......" وکیل صفائی آخر میں گویا انکشاف کرنے والے انداز میں بولی۔ "پولیس ابھی تک آلہ قتل ہی برآمد نہیں کر پائی لہٰذا میرے مؤکل کا مزید جیل میں رہنا انصاف کے تقاضوں کی نفی کرتا ہے۔ شکریہ جناب والا......" وکیل صفائی سعدیہ نے اپنی بات مکمل کی تو وکیل استغاثہ فوراً سامنے آتے ہوئے بولا۔

"یور آنر......! ملزم قتل جیسے سنگین جرم میں ماخوذ ہے اور جائے وقوعہ پر وہ تمام علامات

موجود ہیں جو اسے مجرم ٹھہراتی ہیں۔ وہ کسی طور بھی ضمانت کا مستحق نہیں...... بلکہ میری عدالت سے استدعا ہے کہ پولیس کو مزید پندرہ دنوں کا ریمانڈ دے کر اسے اپنی تفتیش کو کسی نتیجے تک پہنچنے میں مدد دی جائے۔"

"آبجیکشن یور آنر......" سعدیہ یکدم بولی۔ "میرا مؤکل! ڈھائی ماہ سے پولیس کی تحویل میں ہے اور اب تک وہ آلۂ قتل بھی برآمد نہیں کر پائی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ فاضل وکیل پولیس کو کس قسم کی نتیجہ خیز تفتیش میں مدد دینا چاہتے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ مزید پولیس کی تحویل میں رہتے ہوئے میرے مؤکل دادو کی جان ہی کہیں نتیجہ خیز انجام تک نہ پہنچ جائے۔" وکیل صفائی سعدیہ سعید کی طنز میں لپٹے ہوئے نکتے کو غالباً جج نے بھی محسوس کر لیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ کٹہرے میں موجود دادو کو ایک بار پھر گہری نظروں سے تکنے لگا۔ پھر ذرا دیر بعد جج نے ضمانت منظور کیے بغیر دونوں کی فوری پیشی کی تاریخ دیتے ہوئے گواہوں کو مقررہ تاریخ میں حاضر کرنے کا حکم جاری کرنے کے بعد عدالت برخاست کر دی۔

❁❁❁

"مجھے پورا یقین ہے سعدیہ کہ اگلی پیشی میں نہ صرف تمہارا مؤکل ضمانت پر رہا ہو جائے گا بلکہ اس کے بری ہونے کے بھی امکانات روشن ہو جائیں گے۔" کمرۂ عدالت سے نکلتے ہوئے ایک خوش شکل نوجوان کمال احمد نے سعدیہ کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ اپرنٹس وکیل تھا...... اور وہ دونوں ایک ہی سینئر وکیل الطاف رانا کے چیمبر میں کام کرتے تھے۔ کمال احمد کی بات پر سعدیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے برآمدے تک پہنچے تو اس وقت پولیس والے دادو کی بیڑیاں تھامے اسے باہر احاطے میں کھڑی وین کی طرف لے جا رہے تھے۔ سعدیہ کے ساتھی وکیل کمال احمد نے وی کا نشان بناتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ دادو کی بجھی ہوئی نگاہوں نے مخصوص چمک کے ساتھ ان دونوں کی طرف دیکھا پھر پولیس اسے وین میں بٹھا کر روانہ ہو گئی اور وہ دونوں بھی اپنے دفتر آ گئے۔

سعدیہ کے چہرے پر اس وقت گہری متانت تھی۔ اس کے نازک چہرے پر جوش کی تمازت رقصاں تھی۔ پھر وہ اپنے ساتھی وکیل کمال احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔



"مجھے بھی پورا یقین ہے کمال کہ اگلی پیشی میں انشاء اللہ دادو محمد کی کم از کم ضمانت ضرور ہو جائے گی۔" اس کی اس بات پر کمال بہ غور اس کا ملیح چہرہ تکتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر کر قدرے توصیفی لہجے میں بولا۔ "ویسے ہم نے اچھا اور بروقت فیصلہ کیا تھا کہ یہ کیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ کورٹ سے یہاں ٹرانسفر کروا لیا۔ پچھلے جج پر مجھے بس شبہ ہوا تھا کہ وہ دانستہ جانبداری برتتے ہوئے ایک سیدھے سادے کیس کو طول دے کر پولیس کو ملزم کے خلاف کوئی خاص قسم کا موقع دینا چاہ رہا ہے...... اور استغاثہ بھی اس چالاکی میں برابر کا شریک تھا...... لیکن ان جج صاحب کی ترنت مگر غیر جانبدار کارروائی سے مجھے اب امید ہونے لگی ہے کہ ہمارا کیس عنقریب ضرور کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔"

"مجھے یقین تھا کہ اگر تفتیشی افسر بھی وہاں موجود ہوتا تو جج صاحب اسے کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے اپنی سست رفتار تفتیش کو تیز تر کرنے کی بھی تنبیہ کرتے۔" سعدیہ نے کہا۔ "ویسے جج صاحب کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کیس اتنا مشکل یا الجھا ہوا نہیں ہے جبکہ پچھلی عدالت میں لمبی لمبی تاریخیں ڈال کر اسے دانستہ طول دیا جا رہا تھا۔" سعدیہ کی آخری بات پر کمال احمد نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی اور قدرے بے تکلفی سے بولا۔ "اچھا اب ذرا چائے منگوا لو میرے سر میں جکڑن ہو رہی ہے بڑی......"

"ارے...... رے عدالت میں مغز ماری تو میں کر رہی تھی، مجھے تو اپنے دماغ میں کوئی جکڑن محسوس نہیں ہو رہی تمہیں پھر کیسے؟" سعدیہ نے مسکرا کر کہا اور کمال جلدی سے ازراہ تفنن بولا۔ "محترمہ! جس کے سر میں دماغ نام کی کوئی چیز موجود ہوتی ہے تو اسے ہی کسی تکلیف کا احساس ہوتا ہے جبکہ آپ کا سر......"

"دماغ سے عاری ہے یہی کہنا چاہ رہے ہو ناں تم......" سعدیہ مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر بولی اور ساتھ ہی اس نے ملازم کو بلانے کے لئے گھنٹی کے بٹن پر اپنی انگلی رکھ دی۔

کمال احمد ایک سلجھا ہوا اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ وکالت کا شوق جیسے اس کی گھٹی میں پڑا تھا...... اور حقیقتاً تھی بھی یہی بات...... گھٹی اسے ایک بڑے وکیل نے ہی اپنے

ہاتھوں سے دی تھی...... رانا الطاف اس کے والد تھے، جن کے چیمبر میں بطور اپرنٹس یہ دونوں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ کمال سے چھوٹا ایک بھائی اور تھا جمال احمد...... وہ پری میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

سعدیہ سعید ایک عزم کے تحت میدان وکالت میں اتری تھی۔ جس کی تپش اس کی سرمگیں آنکھوں میں سلگتی رہتی تھی...... اور یہ آگ کمال احمد سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ ایم اے اور پھر ایل ایل بی کیا تھا۔ زمانہ طالب علمی کی دوستی اب باہمی قربت میں بدل چکی تھی۔ اگرچہ تعلیم سے فراغت پاتے ہی کمال نے اشاروں اشاروں میں اس قربت کو "ملن" کا روپ دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر جواباً سعدیہ نے کمال سے انتہائی سنجیدگی اور دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔ "کمال......! میں تمہاری بے لوث محبت کی قدر کرتی ہوں...... اور خود بھی تمہیں پسند کرتی ہوں۔ تم نے اگر میری آنکھوں میں اپنے لئے محبت کے روشن دیپ جلتے دیکھے ہوں گے تو ضرور تمہیں ان کی تھرتھراتی لو میں ایک عزم کی پرچھائیں بھی لرزیدہ سی محسوس ہوئی ہوگی ......اور جب تک کمال میرا وہ عزم پورا نہیں ہو جاتا زندگی ایک بوجھ کی طرح تاعمر مجھے محسوس ہوتی رہے گی۔"

کمال احمد نے سعدیہ کے لہجے میں گہرے دکھ کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔ وہ خودغرض یا کوئی لاابالی سا نوجوان نہ تھا۔ وہ جان گیا کہ بظاہر نرم و نازک سی نظر آنے والی لڑکی کے اندر ایک ایسا طوفان بلاخیز کروٹیں لے رہا ہے جس نے بلاشبہ اس کی زندگی کو متلاطم کر دیا تھا اور تب وہ سب کچھ فراموش کر کے اس کے ساتھ شریک عزم ہو گیا تھا لیکن سعدیہ جیسی خوددار لڑکی کے ساتھ شریک عزم ہونے میں بھی اسے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ کیونکہ سعدیہ تن تنہا اپنی "جنگ" لڑنے پر بضد تھی...... لیکن کمال کو اس کی ایک معصوم سی جذباتی کمزوری کا بخوبی علم تھا اس نے ایک دن اس کمزوری کا سہارا لیتے ہوئے اس سے کہا۔ "دیکھو سعدیہ......! اگر تمہارے دل میں واقعی میرے لئے محبت ہے تو تم مجھے اپنے ساتھ ضرور اپنی "جنگ" میں شریک عزم کرو۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے تنہا جنگ لڑنے سے کیا میری انا، میری محبت، عزت نفس مجروح نہیں ہوگی؟ اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ تم خود کو مجھ سے الگ سمجھتی ہو۔"



اس کے یوں خفا ہونے کی دیر تھی کہ سعدیہ پسیج گئی اور پھر اس نے اپنی گزری ہوئی زندگی کا وہ تلخ ترین باب گوش گزار کر دیا جسے اب تک وہ صرف اپنے سینے تک محدود رکھتی چلی آئی تھی مگر آج جیسے اس کی تلخ یادوں کا کمال احمد نے پوسٹ مارٹم کر ڈالا تھا۔

کمال احمد سعدیہ کی داستان الم سن کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ تب پھر باقاعدہ اس نے اپنے باپ رانا الطاف ایڈووکیٹ سے سعدیہ کے معاملے پر تفصیلی اور پُرمتانت بات کی تو انہوں نے نہ صرف پورا پورا ساتھ دینے کا وعدہ کیا بلکہ بطور اپرنٹس اپنے چیمبر میں سعدیہ کو اپنے بیٹے کمال احمد کے ساتھ رکھ لیا اور یہی نہیں بلکہ رانا الطاف کئی چھوٹے موٹے کیس بھی سعدیہ کو دینے لگے تاکہ اس کے اندر رفتہ رفتہ فائٹنگ اسپرٹ ڈیولپ ہو سکے۔

داد محمد عرف دادو کے سلسلے کا کیس بھی انہی کا "ریفر" کردہ تھا جسے بڑی کامیابی سے اب تک وہ ڈیل کرتی چلی آئی تھی۔

"بیٹی سعدیہ! میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم اپنے اوپر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف خود جنگ لڑو۔" ایک دن چیمبر میں وہ سعدیہ کو مربیانہ لہجے میں بتانے لگے۔ "میں چاہتا ہوں تمہارے اندر اتنا اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم حریف کو پہلے ہی ہلّے میں پچھاڑ کر رکھ دو۔ کسی ایک عام سے نکتے کو اپنے دلائل کے زور پر اتنا اہم بنا دو کہ مد مقابل بوکھلا جائے۔ بس پھر یہیں سے تمہاری جیت اور حریف کی ہار قریب سے قریب تر ہونا شروع ہو جائے گی۔" یہ وہ سب باتیں تھیں جو اس پروفیشن میں "گُرز" کہلائی تھیں اور یہ سب "گُرز" سعدیہ جیسے حفظ کر چکی تھی۔ رانا الطاف بلاشبہ ایک شفیق اور مہربان انسان ثابت ہوئے تھے اور ان دونوں باپ بیٹوں کے ساتھ کو سعدیہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی۔ رانا الطاف نے اسے مزید الجھے ہوئے کیس میں رواں کرنے کے لئے داد محمد عرف دادو کا کیس بطور خاص سونپا تھا...... لیکن اس کیس میں ایک بات اور بھی تھی کہ داد محمد عرف دادو سعید کا پڑوسی تھا۔

"کمال! اب تم جلد ہی چائے ختم کرو...... اور ذرا میرے ساتھ چلو۔" دفتر میں بیٹھی سعدیہ نے اپنا خالی چائے کا کپ سامنے میز پر رکھتے ہوئے قدرے عجلت میں کہا تو کمال چونک کر بولا۔ "کہاں......؟" وہ بھی اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔ سعدیہ

اٹھتے اٹھتے بولی۔ ''آؤ جلدی سوال راستے میں کر لینا۔'' پھر وہ باہر نکل گئی اور کمال کندھے اچکاتا ہوا اس کے عقب میں ہولیا۔

❁❁❁

اس وقت دیوار گیر کلاک میں سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ طائر شام نے ابھی اپنے سرمئی پنکھ نہیں پھیلائے تھے۔ یہ ایک چھوٹا مگر ضروریات زندگی سے مزین صاف ستھرا کمرہ تھا۔ غم واندوہ کی تصویر بنی اس لڑکی کی عمر بہ مشکل انیس برس رہی ہوگی۔ وہ مقتول خورشید احمد کی اکلوتی جوان بیٹی شائلہ تھی۔ جس کا اب دنیا میں سوائے اللہ کے اور کوئی نہ تھا۔ وہ چارپائی پر بچھے صاف ستھرے بستر پر اپنے گھٹنے سکیڑے بیٹھی سسک رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی اسے دلاسے دے رہی تھی۔ یہ شائلہ کی دور پرے کی رشتے کی خالہ تھی۔ اس کا بھی دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اس کا نام نعمت خالہ تھا۔

''بس کر میری بچی...... تو اس طرح روتی رہے گی تو خورشید کو کتنی تکلیف ہوگی۔'' نعمت خالہ اپنے رندھے ہوئے لہجے پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''دیکھ تجھے کروشیے کے کام کا بہت شوق ہے نا...... میں تیرے لئے کتنا کام لائی ہوں...... اور یہ دیکھ ذرا خالہ نصیبن نے بھی تجھے کتنا خوبصورت کار چوب دیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے خالہ نعمت نے گویا اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے ایک کپڑے کی بڑی سی گٹھڑی اس کے سامنے رکھ کر کھولنے لگی۔ سسکتی ہوئی شائلہ اپنی بھیگی آنکھوں سے خالہ نعمت کو گٹھڑی کھولتے تکنے لگی۔ معاً گھنٹی بجی۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' نعمت خالہ جلدی سے بولی۔ پھر کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی پھر دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا بلند آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''خالہ دروازہ کھولو...... میں ہوں سعدیہ۔'' دوسری جانب سے وکیل سعدیہ کی آواز پہچانتے ہوئے خالہ نعمت نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور سامنے سعدیہ کے ساتھ کمال کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ایک جانب ہٹتے ہوئے بولی۔ ''آؤ...... آؤ...... بچو اندر آجاؤ......'' اور وہ دونوں نعمت خالہ کو سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔



صحن خاصا کشادہ اور پختہ تھا۔ سامنے برآمدہ تھا جہاں ساتھ ساتھ دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ سامنے انہیں شائلہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ وہ بھی ان کی آواز پہچان کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ''یہ تم نے پھر رونا دھونا شروع کر دیا۔ بھول گئی تم اپنا وعدہ......؟'' سعدیہ اس کے قریب آتے ہوئے مصنوعی خفگی سے اس کی جانب دیکھ کر بولی...... اور شائلہ نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

پھر وہ سب باہر قدرے کشادہ برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھ گئے۔ خالہ نعمت چائے وغیرہ کے سلسلے میں وہاں سے غائب ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کی آپس میں بے تکلفانہ گفتگو سے پرانی شناسائی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ ''دیکھو شائلہ! تمہیں اب ہمت سے کام لینا ہوگا، کچھ بولنا ہوگا، بتانا ہوگا۔ یقین کرو ہمارا شائلہ...... ہم کیس جیتنے والے ہیں۔'' سعدیہ نے شائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ لیکن جانے کیوں اسے اپنے لفظوں میں پھیکے پن کا احساس ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بات پر شائلہ کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بوجھل سے لہجے میں بولی۔ ''باجی! آپ کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ آپ لوگ یہاں آجاتے ہو اور کیس جیتنے سے کون سے میرے ابو......'' اس کا لہجہ رقت آمیز ہوگیا۔

''نہیں...... شائلہ ایسا مت سوچو...... پھر تم غیریت دکھا رہی ہو ناں...... مجھے باجی بھی کہتی ہو اور...... اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نہیں چاہتیں کہ داد محمد بری ہو جائے۔ جو بے چارہ بے گناہ سزا کاٹ رہا ہے۔'' سعدیہ نے کہا تو شائلہ نے قدرے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی موٹی موٹی آنکھیں نمناک تھیں۔

''میرا خیال ہے سعدیہ! شائلہ ابھی تک اس بیچارے داد محمد کو ہی اصل مجرم......'' کمال بولا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔'' شائلہ، کمال احمد کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولی۔ ''درحقیقت حالات کچھ اچانک اس طرح میری نظروں کے سامنے پیش آئے تھے کہ ایک لمحہ کو میں بھی واقعی داد محمد کو ہی ابو کا قاتل سمجھی تھی...... لیکن مجھے یقین ہے کہ داد و میرے ابو کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ وہ بے چارہ ایک سادہ لوح شخص ہے۔'' شائلہ نے صاف گوئی سے کہا تو سعدیہ تہنیت آمیز لہجے میں اس سے بولی۔ ''شاباش......! ہمیں

بھی پورا یقین ہے کہ داد محمد قاتل نہیں ہو سکتا، آخر کو وہ میرا بھی دیکھا بھالا ہے، میرا پڑوسی تھا...... سب اسے جانتے تھے۔ بلکہ اسے کسی سازش کے طور پر پھنسایا گیا ہے۔ پہلے ہمیں کسی سازش کا اندازہ نہیں ہو پایا تھا، کیونکہ عین وقوعے کے روز حالات خود بخود داد محمد کے خلاف ہوتے چلے گئے تھے...... اتنے کہ خود تمہیں بھی پہلے اس پر ہی قاتل ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ مگر جب ہم نے پچھلی عدالت میں دادو کے حق میں کیس لڑنے کی کوشش کی تو ہمیں محسوس ہوا کہ استغاثہ دانستہ طور پر دادو کو مجرم ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے...... لگتا ہے اس قتل کے پیچھے کئی افراد کا ہاتھ ہے جو خفیہ طور پر دادو کو پھنسانا چاہتے ہیں۔" سعدیہ نے لمحہ بھر توقف کیا۔ شائلہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ کمال فوراً پُرسوچ انداز میں سعدیہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "سعدیہ! تم بالکل درست کہتی ہو۔ دادو کو واقعی ایک سازش کے تحت پھنسایا...... یا یوں کہا جائے کہ قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ جو حادثاتی طور پر اصل قاتل کی چھری تلے آ گیا ہے اور اصل قاتل سے تعلق رکھنے والے افراد غالباً اتنے اثر و رسوخ والے ہیں کہ انہوں نے پچھلی عدالت میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی کوشش کی جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ دو ڈھائی ماہ تک مذکورہ عدالت میں کیس چلتا رہا۔ دادو کی بے گناہی کا اس سے بڑھ کر بھلا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس پر اب تک فرد جرم عائد نہیں ہو سکی لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ بے چارہ نہ باعزت بری ہو سکا اور نہ ہی اس کی ضمانت ہو سکی، بے چارہ بیچ میں ہی لٹکا ہوا ہے۔"

"اسی لئے اب ہم نے جس کورٹ میں کیس ٹرانسفر کروایا ہے...... اس کے جج پر ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ وہ غیر جانبدار شخص ہے۔" سعدیہ نے کہنا شروع کیا۔ "تب ہی تو جج صاحب نے پہلے مرحلے میں ہی باقاعدہ کیس سے متعلق تفاصیل کو بھری عدالت میں ظاہر کیا۔ مجھے یقین ہے کہ چند ہی پیشیوں میں دادو کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" بے اختیار شائلہ کے منہ سے نکلا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ سرخ سا ہو گیا۔ اس کے لہجے کا بے اختیار ہونا دادو سے اس کے کسی تعلق خاطر کی غمازی کر رہا تھا...... تاہم بات بدلتے ہوئے دوبارہ بولی۔ "مگر باجی......! آخر میرے ابو کا قاتل کب پکڑا جائے گا۔ اسے بھی تو پھانسی چڑھنا چاہئے ناں۔"



"ہاں شائلہ......! ضرور...... تم کیا سمجھتی ہو، ہم دادو کو باعزت بری کرانے کے بعد چپ کر کے بیٹھ رہیں گے؟ ہرگز نہیں ہم نے ہر صورت اصل قاتل تک پہنچ کر دم لینا ہے۔"

"باجی! اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟" بالآخر شائلہ نے سعدیہ سے پوچھا تو وہ بولی۔

"دیکھو شائلہ! استغاثہ کا وکیل بڑا چالاک ہے۔ وہ بڑی چالاکی سے تمہیں اپنے جھوٹے گواہوں میں شامل کرنے کی کوشش کرے گا یا تمہیں میڈیکل ان فٹ قرار دیتے ہوئے تمہاری گواہی کی اہمیت کو کالعدم قرار دینے کی سعی کرے گا...... چونکہ تم عین وقوعے والے وقت بے ہوش ہو گئی تھیں۔" سعدیہ نے اپنی بات مکمل کی تو کمال براہ راست سعدیہ سے بولا۔ "محترمہ! اب تم ذرا شائلہ کو گواہ کی حیثیت سے تیار کرو اور اسے بتاؤ کہ اسے کس طرح بیان دینا ہے پرسوں ہی کی تو تاریخ ہے۔"

"اشائے راہ، نعمت خالہ چائے وغیرہ کی ٹرے اٹھائے وہاں آن موجود ہوئی۔ وہ دونوں بہ مشکل چائے پینے پر راضی ہوئے...... تاہم اس دوران سعدیہ شائلہ سے گواہی وغیرہ دینے سے متعلق کچھ باتیں اسے سمجھاتی رہی پھر جب وہ وہاں سے جانے لگے تو سعدیہ نے ایک بار پھر انتہائی سنجیدگی اور عزم صمیم کے ساتھ شائلہ سے کہا۔ "شائلہ! یہ مت سمجھنا کہ دادو کی رہائی کے بعد ہم خاموش ہو رہیں گے۔ ہمارا اصل مقصد تمہارے ابو کے اصل قاتل کی گردن میں پھانسی کا پھندہ ڈالنا ہے۔" سعدیہ کے لہجے میں ایک ایسی جوش بھری تمتماہٹ عود کر آئی تھی اور شائلہ اسے ممنون نگاہوں سے تکنے لگی جیسے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو...... معاً ایسے میں کمال احمد کی رگ مزاح پھڑکی اور اس نے لقمہ دیا۔ "شائلہ! تم ہمیں صرف وکیل ہی نہ سمجھنا ہم پکے سراغ رساں بھی ہیں۔" اس کی اس بات پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔

❁❁❁

دیوار گیر کلاک نے رات کے بارہ بجے کا اعلان کیا۔ آمنہ بیگم کی آنکھوں سے نیند آج بھی غائب تھی۔ ماضی کی تلخ یادوں سے ان کے حلق اور سینے میں کڑواہٹ سی گھل گئی تھی۔ ماحول میں کسی قدر گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ چھت پر لگے پنکھے کی ہوا اس چھوٹے مگر نفاست سے سجے ہوئے کمرے میں سرسرا رہی تھی۔ آمنہ بیگم ایک چالیس

پچاس سالہ پُروقار خاتون تھیں۔ رنگت قدرے صاف تھی مگر ان کی مجموعی صحت اور ان کی آنکھوں پر لگے موٹے عدسوں والے چشمے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے انہوں نے ماضی میں بہت تلخ اور سخت زندگی گزاری ہو۔ ان کے ساتھ والے بیڈ پر منہ تک لحاف اوڑھے کوئی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ آمنہ بیگم نے محبت بھری ایک نگاہ بیڈ پر ڈالی۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ وہ چند ثانیے اپنے بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر آہستگی سے اٹھی۔ آمنہ بیگم مدہم روشنی میں راہ پاتی ہوئی کمرے کے ایک کونے میں رکھی میز کی طرف آئی اور پھر قریب ہی پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر اس نے اپنی گردن گھما کر بیڈ پر محوخواب کسی کو دیکھا۔ پھر ٹیبل کی دراز سے فیروزی رنگ کی خاصی ضخیم ڈائری نکالی۔ میز پر رکھے ٹیبل لیمپ کو آن کیا پھر ڈائری کھولنے لگی۔ یہ ڈائری خود انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ جب بھی انہیں نیند نہیں آتی یا طبیعت میں بے چینی محسوس ہوتی تو وہ اپنی لکھی ہوئی ڈائری کھول کر پڑھنا شروع کر دیتی۔ ایک عجیب بات تھی اسے پڑھ کر اپنے اندر کا کوئی غم آمیز بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگتا تھا۔ شاید یہ کوئی اعتراف نامہ تھا۔ وہ بغور ڈائری کا مطالعہ کرنے لگی لکھا تھا......

"انسان اپنی زندگی سے بہت کچھ سیکھتا ہے...... اور اپنی آئندہ کی باقی زندگی کو گزشتہ زندگی کے تجربات سے سنوارنے کی بھی سعی کرتا ہے۔ مگر میں وہ بدنصیب عورت ہوں جس کی زندگی میں صرف تجربات ہی آتے رہے...... منفعت کوئی نہیں ...... یعنی میری زندگی کے تلخ تجربات نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا مجھے نہیں...... لیکن مجھے اس کا بھی کوئی گلہ نہیں، اس لئے کہ اپنی زندگی کے خرمن میں خود میں نے ہی چنگاری بھڑکائی تھی۔ مگر مجھے دکھ تو بہر حال ہوتا ہی ہے یہ سوچ کر کہ میں نے کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ پھر کٹھور تقدیر نے کیوں میرے ساتھ دھوکا کیا۔

وہ ایک منحوس شام تھی جسے میں اپنی نادانی میں شام محبت سمجھ بیٹھی تھی۔ ایک ایسی شام محبت جسے میں اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھنے لگی تھی...... وہ بظاہر ایک "گیٹ ٹوگیدر" پارٹی تھی مگر مخصوص جام سے لبالب چھلکتے پیمانوں کے "چیرز" کے درمیان کہیں بزنس ڈیلنگ ہو رہی تھی تو کہیں نئے کنٹریکٹ پر دستخط ہو رہے تھے...... کہیں کوئی مشترکہ فیکٹری یا مل لگانے کی بات کر رہا تھا تو کوئی کاروباری شراکت کے ساتھ رشتے داری جوڑنے



میں مگن تھا۔

حسین شام کو بقعۂ نور بناتی ہوئی شاندار تقریب...... "سعید مینشن" جیسی عالی شان کوٹھی میں منعقد ہو رہی تھی۔ جہاں صرف ہم دونوں باپ بیٹی یعنی سیٹھ شوکت سعید اور آمنہ سعید اکیلے رہتے تھے۔ پپا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور یہ ان کے بے جا لاڈ پیار کا ہی نتیجہ تھا کہ جس نے میری شخصیت میں بگاڑ پیدا کر دیا تھا اس حد تک کہ میں پپا کی بے انتہا محبت کے زعم میں ان سے اپنی ہر جائز و ناجائز باتیں منوا لیا کرتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ میرے اندر شروع سے پلنے والا احساس محرومی رہا ہوگا اور وہ محرومی تھی ایک ماں کی...... جو ایک بیٹی کی نہ صرف سہیلی بھی ہوتی ہے بلکہ راز دار بھی...... پپا بتاتے ہیں کہ میری کم سنی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ بہر طور میں ذکر کر رہی تھی اس حسین سرسراتی ہوئی گداز شام کا...... نئے نویلے جذبوں کے سنگ پیار بھری سرگوشیوں میں مصروف محبت آمیز شام کا...... ہر سو نور نکہت کا سماں تھا۔ نہ صرف ہال بلکہ کوٹھی کے وسیع اور خوبصورت انداز کے تراشیدہ لان میں مہمانوں کی چنیدہ تعداد بکھری ہوئی تھی۔ وہ سب زرق برق اور انتہائی بیش قیمت ملبوسات اور جیولری سے لدے پھندے تھے۔ کئی نوجوان جوڑے اپنے بڑوں کے "پروں" سے نکل کر اپنے "مطلب" کے ویران اور آوارہ کنج میں جا آباد ہوئے تھے۔ ایسے ہی ایک "آوارہ" کنج میں میری ملاقات واثق علی سے ہوئی۔ پچیس تیس سالہ وہ ایک خوبرو شخص تھا۔ یونانی مردانہ وجاہت کا حامل...... اس کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ جس نے مجھ جیسی "ریزرو" رہنے والی لڑکی کو بھی مائل بہ الفت کر دیا تھا۔ قصہ کوتاہ...... پھر ہم دونوں روشنی سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ واثق سیٹھ عثمان کا بیٹا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پپا سیٹھ عثمان میرے پپا کے بزنس پارٹنر تھے یعنی ہمارے ایک ہونے میں کوئی بھی روایتی رکاوٹ نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پپا کو اس رشتے میں ہرگز تامل نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے باقاعدہ پپا کے سامنے اپنا پرپوزل رکھا تھا تو انہوں نے واثق علی کو بری طرح "ریجیکٹ" کر کے رکھ دیا۔ "بیٹی! میں سیٹھ عثمان کو پسند نہیں کرتا۔" انہوں نے سنجیدگی سے واثق اور میری راہیں جدا کرنے کا جواز بتاتے ہوئے کہا۔

اور میں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گئی۔ "لیکن پپا! میں تو واثق سے شادی کر رہی ہوں اور......اور...... پپا واثق کے ڈیڈی سیٹھ عثمان تو آپ کے بزنس پارٹنر بھی ہیں۔"

"وہ میری کاروباری مجبوری ہے۔ تمہیں بتانا فضول ہے۔ جس دن میری وہ مجبوری ختم ہو گئی، میں عثمان کو بزنس سے علیحدہ کر دوں گا۔"

"مگر پپا یہ تو خود غرضی اور دھوکا ہوا۔" میں جل کر بولی تو پپا نے پہلی بار میری طرف گھور کر دیکھا اور قدرے درشت لہجے میں بولے۔ "آمنہ! اپنا لہجہ درست کرو۔ یہ سب کاروبار "گڈز" ہیں تم نہیں سمجھو گی انہیں...... جاؤ اپنے کمرے میں......"

میں بھی آخر انہی کی بیٹی تھی...... لہٰذا قطعیت بھرے لہجے میں بولی۔ "سوری پپا! میں اپنی محبت کو آپ کے ذاتی اور کاروباری "گڈز" کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔" میرے لہجے میں حد درجہ تلخی عود کر آئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی اور بیڈ پر اوندھی گر کر رو پڑی۔

تب مجھے ذرا دیر بعد اپنے عقب میں پپا کی نرم آواز سنائی دی۔ میں چونک کر مڑی سامنے پپا چہرے پر ملائمت لئے موجود تھے۔ میرا منہ مزید سوج گیا۔

"آمی بیٹا! تم ابھی بچی ہو...... اتنی جلدی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ نہ کرو۔ چلو میں تمہیں ملنے جلنے سے نہیں روکتا لیکن...... میں چاہتا ہوں کہ اس دوران تم واثق علی اور اس کے گھر والوں کی عادات و اطوار کو جانچنے کی کوشش کرو۔"

"پپا! وہ سب میرے دیکھے ہوئے ہیں اور واثق کو بھی میں اچھی طرح جاننے لگی ہوں۔ بھلا پپا...... میں اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ یکدم کیسے کر سکتی ہوں۔ ضرور میں نے واثق کو پرکھنے کے بعد ہی یہ اہم فیصلہ کیا ہوگا۔" میں نے کہا تو پپا کے چہرے پر ایک بار پھر گہری سوچ کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر جب وہ بولے تو ان کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ "اچھا بیٹی! میری تو یہی دعا ہے کہ تم خوش رہو اور کبھی دکھ نہ دیکھو۔" ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں خوشی سے "سویٹ پپا" کہتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

درحقیقت میں اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے پپا کے انکار کو ان کی کسی کاروباری رنجش پر معمول کر رہی تھی۔ جس کا احساس مجھے آگے چل کر ہوا کہ بات کوئی اور ہی تھی۔ قصہ کوتاہ ایک ریشمیں شام واثق اور میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔"



مچا کمرے کی خاموش فضا میں ہلکا سا کھٹکا ہوا اور آمنہ بیگم نے فوراً ڈائری بند کر دی۔ انہوں نے چونک کر بیڈ کی طرف دیکھا کوئی ان سے کہہ رہا تھا۔ "امی! آپ نے پھر ڈائری پڑھنا شروع کر دی، میں نے منع کیا تھا ناں آپ کو......" وہ اس کی بیٹی تھی ...... سعدیہ وکیل سعدیہ سعید۔

آمنہ بیگم کی آنکھوں میں افسردگی اتر آئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سعدیہ سعید کی بات سن کر ہولے سے بولی...... "بیٹی اس ڈائری کو پڑھ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگتا ہے۔ یہ میرے اندر کی بے کلی کو کم کرنے والا وہ اعتراف نامہ ہے جسے جتنی بار پڑھتی ہوں اتنا ہی مجھے سکون ملتا ہے۔"

سعدیہ اپنی ماں آمنہ بیگم کی بات سن کر بیڈ سے اٹھی...... میز کے قریب آئی اور قدرے جھک کر ان کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کرتے ہوئے رسان سے بولی۔ "امی! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ ڈائری جسے آپ اعتراف نامہ کہتی ہیں...... یہ ہرگز آپ کو سکون نہیں پہنچاتی۔ بلکہ یہ آپ کے اندر کی دبی ہوئی آگ کو مزید بھڑکا کر آپ کو جلاتی ہے...... اور خود کو جلانا آپ کو اچھا لگتا ہے......"

آمنہ بیگم نے قدرے چونک کر اپنا سر گھماتے ہوئے سعدیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے ان کی بیٹی ان کے چہرے کی جانب نہیں بلکہ ان کے "اندر" تک جھانک رہی ہو۔

لحہ بھر توقف کے بعد سعدیہ نے ماں کو سہارا دیتے ہوئے انہیں کرسی سے اٹھایا...... ٹیبل لیمپ کی روشنی گل کی پھر ماں کو لئے بیڈ تک آئی...... اسے بہ آہستگی سہارا دیتے ہوئے بٹھایا...... پھر خود بھی بیٹھ گئی...... اور دوبارہ نرم لہجے میں بولی۔ "امی! خود کو دھوکا مت دیں۔ جن لوگوں نے آپ کے ساتھ ناانصافیاں کی ہیں...... انہیں اب "کٹہرے" تک پہنچانے کا وقت آ گیا ہے...... یوں راتوں کو جاگ کر ماضی کی راکھ کریدنے سے بھلا کیا فائدہ؟ اس طرح تو آپ بے حوصلہ ہو جائیں گی۔"

آمنہ بیگم کے چہرے پر ہلکی رقت آمیز کپکپاہٹ اتر آئی۔ چشمے کے عقب میں ان کی بوجھل بوجھل سی آنکھیں نمناک سی ہو رہی تھیں۔

رات دبے پاؤں اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی...... ہلکے پاور کے بلب کی مدھم

روشنی سوگوار سی محسوس ہو رہی تھی...... سعدیہ کے لہجے میں حوصلے کی گونج نمایاں تھی......
اور یہ بات باعث حیرت تھی کہ یہ حوصلہ آمنہ بیگم کا ہی سعدیہ کو عطا کردہ تھا...... اور اسی
حوصلے میں گندھی ہوئی ایک الم نصیب دکھیاری عورت کی کتھا سنتے ہوئے آج سعدیہ
ایک قابل وکیل کی صورت میں اس کے سامنے تھی...... اور ماں کا زخم نہاں اس کی
آنکھوں میں ایک عزم کی پتلی بن کر چسپاں ہو گیا تھا اور اس پتلی سے وہ ایک جنگ کا
تصور کئے ان لوگوں کو انصاف کی صلیب پر چڑھانے کی آرزومند تھی۔ جنہوں نے اس
کی ماں کی زندگی میں دکھوں کی چنگاریاں بھر دی تھیں...... اور جو اس کے حقوق غصب
کئے بیٹھے تھے...... سعدیہ نے قانون کا لبادہ انہیں غاصبوں کو کٹہرے تک لانے کے لئے
پہنا تھا۔

❁❁❁



آج عدالت میں فیصلہ کن پیشی کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور استغاثہ
کے پہلے گواہ عمر دین ولد خیر دین کو ملزم داد محمد عرف دادو کے خلاف بیان دینے کے لئے
کٹہرے میں لایا جا چکا تھا۔ عمر دین کا، مقتول خورشید احمد کے مکان کی گلی کے قریبی نکڑ
پر پان، سگریٹ کا کیبن تھا۔ وہ 35,30 سالہ دبلا پتلا اور سیاہ رنگت کا شخص تھا......
صورت سے وہ اوباش نظر آ رہا تھا...... اس سرخ اور مسوڑوں سے بے نیاز بدہیت
دانتوں اور خاکستری ہونٹوں سے یوں لگتا تھا جیسے وہ چوبیس گھنٹے پان کی جگالی کرتا رہتا
ہو...... لیکن اس وقت وہ پان نہیں چبا رہا تھا...... اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا تو وکیل
سرکار اس کے قریب آ کر بولا...... ”عمر دین! کیا تم عدالت کو بتاؤ گے کہ تم نے وقوعے
کے روز ملزم دادو کو خورشید احمد کا خون کرتے ہوئے کس طرح دیکھا۔“
”جی! دادو کو میں نے کوئی پانچ بجے کے قریب خورشید کے مکان کا دروازہ
کھٹکھٹاتے ہوئے دیکھا......“ عمر دین نے اپنی کھردری آواز میں کہنا شروع کیا......
”پھر جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی خورشید کی بیٹی کی چیخیں مجھے
سنائی دیں...... محلے داری تھی اور سب سے پہلے خیر خبر لینا مجھ پر ہی فرض بنتا تھا۔ اس
لئے میں دوڑا بھاگا خورشید کے مکان میں داخل ہوا تو دہل کر رہ گیا۔ سامنے خورشید احمد
کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی اور ملزم دادو خون آلود چاقو لئے کھڑا تھا۔ مجھے
دیکھتے ہی وہ گھبرا گیا اور ابھی چاہتا ہی تھا کہ وہاں سے بھاگ لے مگر جناب اپن بھی
دیوار بن کر کھڑا ہو گیا...... اتنے میں وہاں اور بھی محلے والے آن پہنچے اور یوں وہ پکڑا
گیا......“ اس نے اپنا بیان ختم کیا تو وکیل صفائی سعدیہ سعید اپنی جگہ سے اٹھی اور عمر
دین کے لمبوترے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑے ہوئے جرح کے لئے اس کی جانب
بڑھی۔ اسے عمر دین کا بیان رٹا رٹا سا لگا تھا۔ سعدیہ لمحہ بھر اسے ایسی نظروں سے گھورنے

لگی جیسے ابھی اس کے جھوٹ کا پول کھول کر رکھ دے گی۔

تاہم اس نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "عمر دین! تم نے دادو کو خورشید احمد کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے دیکھا۔۔۔۔ ٹھیک۔۔۔۔ ضرور پھر تم نے پہلے اسے اپنے کیبن کے سامنے سے بھی گزرتے دیکھا ہوگا۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔ دادو کا گزر تمہارے کیبن کے سامنے سے ہوتا تھا۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ ہاں دادو کو میں نے اپنے سامنے ہی سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔۔ کیونکہ میرے کیبن کی طرف ہی۔۔۔۔ صرف تین گھر چھوڑ کر خورشید کا گھر تھا۔" عمر دین ہوشیار بننے کی کوشش کرتے ہوئے بلا کے اعتماد سے بولا۔

تب وکیل صفائی سعدیہ سعید دوبارہ مستفسر ہوئی۔۔۔۔ "عمر دین صاحب! بہ قول آپ کے کہ آپ نے ملزم دادو کو آلۂ قتل سمیت۔۔۔۔ یعنی اس کے ہاتھ میں خون آلود چاقو بھی دیکھا تھا۔۔۔۔ لیکن اس کے برعکس وہاں آلۂ قتل یعنی وہ خون آلود چاقو برآمد نہ ہوسکا۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ گویا اپنے گواہ عمر دین کے دفاع میں آگے بڑھ کر جج سے مخاطب ہوا۔۔۔۔ "فاضل وکیل صاحبہ! عمر دین سے ایک غیر اہم سوال کر کے عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے آخر الذکر سوال سے استغاثہ کے گواہ عمر دین کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔۔۔۔"

"تعلق بنتا ہے یور آنر۔۔۔۔" وکیل صفائی سعدیہ پُرزور لہجے میں جج سے مخاطب ہوئی اور اضافہ کیا۔۔۔۔ "کیونکہ یور آنر!۔۔۔۔ میں یہ بات پہلے بھی معزز عدالت کو ریکارڈ کروا چکی ہوں کہ جائے واردات یا میرے موکل ملزم دادو کے قبضے سے کسی قسم کا کوئی آلۂ قتل برآمد نہیں ہوسکا۔۔۔۔ لہٰذا استغاثے کے گواہ عمر دین کا یہ بیان کہ اس نے دادو کو خون آلود چاقو سمیت دیکھا ہے محض جھوٹ پر مبنی ہے۔۔۔۔"

جج نے قدرے تیز نگاہوں سے عمر دین کی طرف دیکھا۔ عمر دین ذرا بدحواس سا ہوا۔۔۔۔ جج نے آبجیکشن مسترد کیا تو وکیل صفائی نے ملزم کی صفائی میں اپنے ایک اہم گواہ مقتول خورشید احمد کی بیٹی شائلہ کو پیش کرنے کی اجازت چاہی۔۔۔۔ اجازت ملتے ہی شائلہ دوسرے کٹہرے میں آ گئی۔ استغاثے کے وکیل کے چہرے پر شائلہ کو دیکھ کر قدرے الجھن کے تاثرات ابھرے مگر خاموش رہا شائلہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔



وکیل سعدیہ کے سوال پر بولی۔ "یہ بات درست ہے کہ جب ابو کا قتل ہوا تو میں گھر میں موجود تھی۔" شائلہ لحہ بھر رکی۔۔۔۔ اس کے کپکپاتے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے یہ سب کچھ بتا رہی ہو۔ "جب میں گھر میں داخل ہوئی تو اندر صحن میں ابو کی خون آلود لاش پڑی تھی۔۔۔۔"

"مس شائلہ! کیا تم عدالت کو بتاؤ گی کہ اس وقت داد محمد عرف دادو کس حالت میں تھا۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا تم نے اسے کس مشتبہ حالت میں کھڑے پایا؟" وکیل صفائی سعدیہ نے نرمی سے پوچھا تو شائلہ بولی۔ "درحقیقت۔۔۔۔ میں ابو کی لاش کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی لیکن پھر بھی بے ہوش ہونے سے قبل میں نے دادو کو کسی مشتبہ حالت میں وہاں نہیں پایا یعنی اس کے ہاتھ میں مجھے کوئی ایسی شے نظر نہ آئی تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ میرے ابو کو قتل کرنے والا دادو ہوسکتا ہے۔۔۔۔"

"آبجیکشن یور آنر۔۔۔۔" استغاثہ یعنی سرکاری وکیل چہرے پر جوش لئے آگے بڑھا۔۔۔۔ اس کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس نے گواہ کے بیان میں اپنے مطلب کا کوئی پوائنٹ نوٹ کرلیا ہو۔

"آبجیکشن سسٹینڈ" جج نے وکیل سرکار کا اعتراض منظور کرتے ہوئے اسے بولنے کا موقع فراہم کیا۔

"تھینک یو یور آنر! مس شائلہ کے اس بیان میں ابہام پایا جاتا ہے ایک جانب تو وہ فرماتی ہیں کہ ابو کی خون آلود لاش کو دیکھ کر میں اپنے حواس میں نہیں رہی۔۔۔۔ لیکن باوجود اس کے بے ہوش ہوتے ہوتے انہوں نے ملزم دادو کے ہاتھ میں آلۂ قتل جیسی شے نہیں دیکھی۔۔۔۔ سراسر من گھڑت اور جھوٹ ہے۔ یور آنر! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شائلہ اپنے باپ کے قاتل دادو کو قتل کے جرم سے بچانا چاہتی ہے۔ اس لئے یور آنر! کہ شائلہ اور دادو کے درمیان پرانا گٹھ جوڑ ہے۔" وکیل سرکار نے اپنی بات مکمل کی تو شائلہ سسک پڑی اور تڑپ کر چیخی۔ "نہیں۔۔۔۔ نہیں یہ غلط ہے کوئی بیٹی اپنے باپ کے قاتل کو بھلا کیوں بچانا چاہے گی جج صاحب۔"

ادھر وکیل صفائی سعدیہ کو وکیل سرکار کے اس اوچھے سوال پر طیش سا آیا مگر ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جج سے بولی۔ "یور آنر۔۔۔۔ فاضل وکیل کو میرے معزز گواہ پر کیچڑ

اچھالنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ ہی اس سے ذاتی قسم کے سوال کرنے کا حق ہے۔"

"یہ غلط ہے یور آنر......" وکیل سرکار جج سے مخاطب ہو کر بولا۔ "درحقیقت اس "ذاتی" سوال کے بطن میں بھی ایک گھناؤنی سازش چھپی ہے۔" جو بالآخر باہمی گٹھ جوڑ کے بعد خورشید احمد کے قتل پر منتج ہوئی۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھر شائلہ سے مخاطب ہوا۔ "مس شائلہ! کیا یہ غلط ہے کہ تم داود کو پسند کرتی تھیں اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتی تھیں؟"

اس سوال پر شائلہ بھی تڑپ گئی اور یونہی اس کی نگاہ سامنے کٹہرے پر موجود نڈھال داود پر پڑ گئی، پھر یکدم اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں..... جیسے باعث شرم اس کی قوت نطق جواب دے گئی ہو..... ایسے میں وکیل صفائی سعدیہ فوری اس کے دفاع میں بولی۔ "یور آنر! فاضل وکیل مسلسل میری معزز گواہ کی توہین کر رہے ہیں، جو انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ مجھے پہلے استغاثے کے گواہ سے جرح مکمل کرنے دی جائے۔"

جج نے اسے اجازت دی تو سعدیہ پُرجوش لہجے میں عمر وین سے مخاطب ہوئی۔ "عمر وین صاحب! کیا آپ شائلہ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

اس کی بات پر عمر وین مکاری سے اپنے دونوں گال پیٹتے ہوئے بولا۔ "توبہ توبہ...... جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... شائلہ کو تو میں اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا ہوں۔"

"یور آنر......" سعدیہ فوراً جج سے مخاطب ہو کر بولی۔ "استغاثہ کے گواہ کا یہ پوائنٹ نوٹ کیا جائے کہ وہ مس شائلہ کو اپنی بہن سمجھتا ہے۔ کیونکہ اب میں جو اپنے اگلے گواہ پیش کروں گی اس کا تعلق عمر دین کے اس جھوٹے بیان سے ہے۔"

عدالت میں جیسے سناٹا چھا گیا...... پھر تھوڑی دیر بعد ایک ساٹھ سالہ عورت کو پیش کیا گیا اتنی عمر کے باوجود وہ خاصی مضبوط عورت دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے پر جھریاں بھی خال خال ہی نظر آ رہی تھیں۔ عمر وین اس عورت کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹھک گیا اور پھر معاً اس کے چہرے پر بلا کی گھبراہٹ طاری ہونے لگی اور تھوک نگل کر رہ گیا۔ زیرک وکیل صفائی سعدیہ کی نظروں سے اس کی بدلتی کیفیات چھپی نہ رہ سکی تھیں۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ "یور آنر...... میرے اس بزرگ گواہ کو پورا محلہ جانتا ہے اور ان کی عزت بھی کرتا ہے مزید براں انہیں محلے کی اماں کا بھی خطاب حاصل ہے۔ سچ یہ ہے



کہ شائلہ کو بہن کہنے والا عمر وین مقتول خورشید احمد کی بیٹی شائلہ سے شادی کا خواہاں تھا اور اس نے اپنی بات زیادہ "معزز" طریقے سے مقتول خورشید احمد تک پہنچانے کے لئے اماں جی کی مدد حاصل کی۔" پھر سعدیہ، اس بوڑھی خاتون المعروف "اماں جی" سے مخاطب ہوئی۔ "اماں جی! کیا آپ سامنے موجود اس شخص کو جانتی ہیں...... نیز کیا آپ عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ موصوف نے آپ سے کبھی رشتے سے متعلق خدمات لینی چاہی تھیں۔" وکیل سعدیہ کا اشارہ استغاثے کے گواہ عمر وین کی طرف تھا...... موصوفہ خاتون ذرا بُر کو واقع ہوئی تھیں...... لہٰذا وہ اپنے مخصوص لہجے میں اور پان چباتی ہوئی گویا ہوئیں۔ "اے ہے...... مؤا...... اس لمڈے کو بھلا کیسے نہیں پہچانتی میں...... اس کے کہنے پر تو میں بے چارے خورشید کی بیٹی شائلہ کا رشتہ مانگنے گئی تھی۔"

"یور آنر! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عمر وین نے بھری عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے واضح لفظوں میں کتنا قبیح قسم کا جھوٹ بولا۔ ایسے جھوٹے گواہ کو اسی کوڑوں کی سزا سنائی جائے۔"

جج نے تیز نظروں سے عمر وین کی طرف گھورا...... عمر وین کی حالت ناگفتہ بہ ہونے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا کر "اماں جی" کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بڑھیا جھوٹ بولتی ہے۔ میں...... میں اسے نہیں جانتا۔"

اس پر "اماں جی" عمر وین کو گھور کر اور ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "اے موئے...... تیرا منہ کالا...... مجھے نہیں پہچانتا...... تیرے سے اگر میں نے مفت کی گلوریاں نہ کھائی ہوتی تو ابھی جوتے مار مار کر تیرا سر پلپلا کر دیتی......" اس کے اس دلچسپ تبصرے پر حاضرین عدالت کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

جج نے فوراً عمر وین کی جانب تیز نگاہوں سے دیکھ کر درشت لہجے میں کہا۔ "اب بھی وقت ہے۔ سچ سچ عدالت کو بتاؤ کہ تم نے کیا ملزم داود کو آلۂ قتل سمیت دیکھا تھا؟ ورنہ جھوٹی گواہی ثابت ہونے پر تمہیں کوڑوں کی سزا ہو سکتی ہے۔" جج کے چھوٹ دینے کی دیر تھی کہ عمر وین اپنی گلوخلاصی کی راہ پاتے ہی فرفر اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ "جج صاحب! معافی چاہتا ہوں۔ روا روی...... میں ذرا غلط بول گیا تھا کہ میں نے داود کو آلۂ قتل سمیت دیکھا تھا جبکہ حقیقت یہی ہے کہ میں شائلہ کی چیخیں سن کر اس کے گھر میں

ضرور داخل ہوا تھا مگر میں نے دادو کے ہاتھ میں کسی قسم کا کوئی آلہ قتل یعنی چاقو وغیرہ نہیں دیکھا تھا۔"

وکیل صفائی سعدیہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی جبکہ وکیل استغاثہ خاصے غصے میں عمر دین کو گھور کر رہ گیا...... تب بالترتیب وکیل صفائی سعدیہ نے مزید تین گواہ اور پیش کئے جن پر استغاثے کے وکیل نے لنگڑی لولی جرح بھی کی۔ مذکورہ گواہان نے اپنا بیان عدالت کے روبرو ریکارڈ کراتے ہوئے دادو کی نیک نیتی اور سادہ لوحی کے بارے میں بتایا کہ دادو موقع واردات پر موجود ضرور تھا مگر وہاں پائی جانے والی علامات سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ خورشید احمد کا قاتل ہے۔

مزید یہ کہ دادو اور خورشید احمد کے مابین تعلقات بھی اچھے رہے تھے...... بلکہ انہوں نے خورشید احمد کو دادو کو "بیٹا...... بیٹا" کہتے بھی سنا تھا۔

بہر طور ادھر عمر دین کے میدان چھوڑتے ہی دیگر استغاثے کے "رٹافیکیٹ" گواہان نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے سیدھے سبھاؤ ایسا ہی بیان ریکارڈ کروایا جیسا کہ صفائی کے گواہان نے دیا تھا۔ اس دوران عدالت کا وقت ختم ہو گیا...... مگر پھر بعد کی چند ایک "فوری" پیشیوں کے بعد جج نے دادو کی پچیس ہزار کی ذاتی مچلکے پر ضمانت منظور کرتے ہوئے رہائی کا حکم دیا...... علاوہ ازیں تفتیشی افسر فیاض جو اے ایس آئی تھا کو بھی سختی سے تاکید کی کہ وہ بوگس کارروائیوں سے اجتناب برتتے ہوئے عدالت کا قیمتی وقت ضائع نہ کرے...... اور جلد نیا چالان پیش کرے۔"

❁❁❁

دادو بے چارہ رہائی پاتے ہی جب کمال احمد اور سعدیہ کے روبرو آیا تو اس کی آنکھوں میں فرط جذبات سے امڈنے والے آنسوؤں کی نمی تیر رہی تھی۔

"حوصلہ رکھو دادو......! تم ہمت ہار دو گے تو بے چاری شائلہ کا کیا بنے گا؟" وکیل سعدیہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ شائلہ بھی مغموم چہرے کے ساتھ وہاں موجود تھی...... سعدیہ کی بات پر اس نے دادو کو کن انکھیوں سے دیکھا پھر اپنی نگاہیں جھکا لیں...... دادو کی بھی نظر شائلہ پر پڑی اور اس نے خود کو سنبھال لیا...... وہ چاروں اس وقت رانا الطاف کے دفتر میں موجود تھے۔ شائلہ کے بیچ تعلق خاطر کا سعدیہ اور کمال احمد



کو بھی بخوبی علم تھا...... وہ دادو کی ضمانت پر رہائی پر کافی خوش تھے لیکن شائلہ کے ابو کے قتل اور اس کے گمنام قاتل پر رنج کی کیفیت بھی ان سب کے چہروں پر ثبت تھی...... تاہم خوشی اور غم کی اس ملی جلی فضاء میں مسکراہٹ بکھیرنے کی غرض سے کمال سعدیہ کو مخاطب کرتے ہوئے ازراہ تفنن بولا۔ "محترمہ وکیل صاحبہ! اب ہمیں وکالت کا لبادہ اتار کر شرلاک ہومز بننا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک ہم بذات خود قاتل کا سراغ نہیں لگائیں گے تب تک کوئی پیش رفت عمل میں نہیں آئے گی...... پولیس کی کارکردگی تو سب نے دیکھ ہی لی۔ وہ پھر کسی دوسرے غریب کو "مرغا" بنا دے گی۔"

"لیکن کمال! اس مقصد کے لئے ہمیں کہیں نہ کہیں پولیس کو بھی ساتھ ملانا پڑے گا۔" سعدیہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے پھر تفتیشی افسر فیاض ٹھیک رہے گا۔" کمال بولا تو سعدیہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ "وہ کہاں ہم سے تعاون کرے گا۔ وہ تو پہلے ہی بھنایا ہوا ہے...... ہم نے اس کی دال جو نہیں گلنے دی۔"

"لیکن سعدیہ! باوجود اس کے وہ ہم سے تعاون پر مجبور ہو جائے گا یہ میرا کام ہے۔ ہمیں ایک بار تھانے جا کر اس سے اس ضمن میں ملاقات کرنی پڑے گی۔" کمال نے کہا۔ پھر دادو کی طرف متوجہ ہوا۔ "دادو تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟"

دادو جو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "کمال سائیں! ارادہ تو میرا پہلے اپنے گوٹھ جانے کا تھا...... پتہ نہیں وہاں میرے ماں باپ کس حال میں ہوں گے پر......" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے شائلہ کی طرف دیکھا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

کمال اور سعدیہ جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس کی معنی خیز خود قطع کلامی اور نظروں کے خفیف سے اشارے کو بھانپ گئے۔ لہٰذا سعدیہ بولی۔ "دادو تم شائلہ کی فکر نہ کرو...... ہم ہیں نا اس کے ساتھ...... میرا خیال ہے تمہیں اپنے گوٹھ کا ایک چکر ضرور لگا لینا چاہئے۔"

اس کی بات سن کر دادو کے مغموم چہرے پر پھیکی مسکراہٹ سی دوڑ گئی اور وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ "ادی! سوچا تو میں نے یہ تھا کہ گوٹھ اس دن ہی جاؤں گا جب میں

بچاس ہزار کی رقم جمع کرلوں گا تا کہ گوٹھ جا کر وڈیرے کے منہ پر ماروں...... اور اپنے ماں باپ کو اس کی بیگار کاٹنے سے آزاد کروالوں۔ پر......" یہ کہتے ہوئے دادو کا لہجہ بھر آیا۔ اس کے سادہ اور درد بھرے لہجے نے وہاں موجود سبھی کو دُکھی سا کر دیا۔ زیادہ دکھ شائلہ کو اپنے دل میں محسوس ہو رہا تھا...... تاہم وہ وہاں اس کا اظہار کرنے سے قاصر تھی۔ دادو کی سادہ لوحی اور سچائی اور لہجے کا معصومانہ کھرا پن ہمیشہ اس کے دل میں اپنی اثر پذیری دکھاتا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا دادو! اب دیکھو اللہ نے تمہیں کتنی بڑی مشکل سے چھٹکارا دلا دیا...... اب وہی آگے بھی تمہاری مدد کرے گا۔ مگر ہمارا مشورہ یہی ہے کہ پھر بھی ایک چکر لگا لو اپنے گوٹھ کا......" کمال احمد نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ پھر ایک لمحے کو اسے خیال بھی آیا کہ وہ مالی طور پر اس کی کچھ مدد بھی کر ڈالے۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دادو کو یہ بات پسند نہیں آئے گی اس لئے چپ رہا۔

دادو کمال کی بات سن کر قدرے ممنون لہجے میں بولا۔ "ادا کمال سائیں! آپ لوگوں کی وجہ سے واقعی مجھے اللہ نے ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ میں آپ لوگوں کا یہ احسان......"

"نہیں...... نہیں یہ احسان ویسان...... والی باتیں کرو گے تو سمجھو ہماری تمہاری دوستی ختم......" کمال یک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

دادو چپ ہو رہا...... مگر چند ثانیے بعد قدرے پر جوش لہجے میں بولا۔ "سائیں میرا دل کرتا ہے اپنے محسن خورشید سائیں کا قاتل جب تک پکڑا نہیں جاتا میں یہاں سے نہ ہلوں...... میں سچ بولتا ہوں کمال سائیں! میرے دل کو تب تک چین نصیب نہیں ہوگا جب تک اسے پھانسی کے پھندے پر چڑھتا نہ دیکھ لوں۔"

اس کی بات پر سعدیہ نرم لہجے میں بولی۔ "دادو! ہم تمہارے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں...... اور خورشید احمد کے قاتل کو ہم سب ہی مل کر پھانسی کے پھندے پر چڑھائیں گے لیکن دادو بھائی! تم ایک مرتبہ اپنے گوٹھ تو ہو آؤ۔"

"وہ تو میں جاؤں گا ہی ادی!" دادو ایک گہری سانس لے کر بولا، اور سب مطمئن سے ہو گئے۔



❁❁❁

تھانے کے بیرونی احاطے میں ایک آلٹو کار آ کے رکی اس کی فرنٹ اور ڈرائیونگ سیٹوں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ یہ وکیل سعدیہ سعید اور کمال احمد تھے۔ جو اس وقت تھانے خورشید قتل کیس کے سلسلے میں فیاض سے ملنے آئے تھے۔ پیلی سالخوردہ سی عمارت کے وسطی دروازے پر چند سپاہیوں نے ان کی جانب دیکھا...... اور انہیں سفید وردی اور کالے کوٹ میں ملبوس دیکھ کر ذرا مرعوب سے نظر آنے لگے۔

"انسپکٹر فیاض سے ملنا تھا ہمیں......" کمال احمد نے پُر متانت لہجے میں وہاں موجود ایک سپاہی سے کہا۔

"صاحب اندر موجود ہیں...... آپ کو کس سلسلے میں ملنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو ہم انہیں ہی بتائیں گے۔ براہ مہربانی آپ ہماری ان کے کمرے تک رہنمائی کر دیں۔ سعدیہ نے سپاہی سے مخاطب ہو کے کہا۔ تو وہ دانت نکالتا انہیں اپنے عقب میں آنے کا کہہ کر ایک برآمدے میں آ گیا۔ وہاں موجود ایک اردلی سے سرگوشی کی پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ آپ لوگ اندر جائیں صاحب اکیلے ہیں۔"

وہ دونوں چق اٹھا کر اندر آ گئے۔ سامنے میز پر گھٹی ہوئی جسامت والا انسپکٹر فیاض موجود تھا۔ سعدیہ اور کمال کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے تاہم جی کڑا کر کے انہیں سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر بولا۔ "جی کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی......" اس کے کھر کھراتے لہجے میں کہیں طنز چھپا ہوا تھا۔

اس کی بات سن کر کمال اپنے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔

"خدمت تو ہمیں آپ کی کرنی ہے۔ مگر آپ موقع دیں تب ناں۔"

کمال کی بات پر انسپکٹر فیاض قدرے جز بز سا نظر آنے لگا...... وہ ذرا پریشان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ شاید دادو جیسے معصوم شخص کو بے گناہ پھنسا کر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ خورشید احمد قتل کیس سے اب اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ مگر یہ نہیں ہو سکا تھا۔ اب "اوپر والوں" نے اس پر دباؤ بڑھا دیا تھا کہ وہ جلد سے جلد اس کیس کو حل کر کے اصل مجرم کو گرفتار کر کے فوری عدالت میں نیا چالان پیش کرے۔ بہر طور انسپکٹر فیاض نے اپنے سیاہی مائل ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے وکیل صاحب آپ بجائے گھما پھرا کر بات کرنے کے سیدھے سبھاؤ ہی کہہ ڈالیں تو اچھا ہے۔"

اس پر سعدیہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ انسپکٹر فیاض کی طرف دیکھتے ہوئے بولی.
"انسپکٹر صاحب! دراصل ہم خورشید قتل کیس کے سلسلے میں آپ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔"

"سبحان اللہ...... تو گویا اب آپ حضرات نے سراغ رسانی بھی شروع کر دی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس کو آپ تنہا ہی یہ کام کرنے دیں تو بہتر ہے۔ دادو کی ضمانت کروا کر آپ لوگ کب سے خود کو پھنے خاں سمجھنے لگے ہیں۔" انسپکٹر فیاض اچانک ہی ہتھے سے اکھڑنے لگا تھا۔ وہ ان دونوں کی جانب معاندانہ نظروں سے گھورتے ہوئے مزید بولا۔ "ایک بات آپ لوگ کان کھول کر سن لو خورشید احمد کا اصل قاتل دادو ہی ہے۔ جس دن مجھے آلۂ قتل یا اور کوئی ٹھوس ثبوت مل گیا دادو کو میں دوبارہ گرفتار کرلوں گا۔"

اس اثناء میں میز پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انسپکٹر فیاض نے اپنے جوش پر قدرے قابو پاتے ہوئے ریسیور کانوں سے لگایا مگر اپنی نظریں کرسیوں پر براجمان سعدیہ اور کمال پر جماتے ہوئے بولا۔ "ہیلو! انسپکٹر فیاض اسپیکنگ......"

ادھر کمال اور سعدیہ ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ وہ ابھی اپنی جگہ سے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک انسپکٹر فیاض دوسری طرف کسی کی آواز پہچان کر یک دم مرعوب ہوتے ہوئے بولا۔ "ارے...... واثق علی صاحب آپ۔ نہیں...... نہیں...... میں خود حاضر ہو جاؤں گا...... ہاں ایک منٹ جناب......" پھر وہ ریسیور پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے کمال کی طرف مصافحے کے لئے اپنا دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ مقصد انہیں وہاں سے فوری رخصت کرنے کا تھا۔

سعدیہ کے دماغ میں اس نام نے بھونچال سا پیدا کر دیا۔ "واثق علی..... واثق علی۔" اور جب وہ دونوں تھانے کی عمارت سے باہر نکلے تو سعدیہ انسپکٹر فیاض کے منہ سے نکلے ہوئے نام واثق علی میں کھوئی ہوئی تھی۔

۞۞۞

آمنہ بیگم پر آج پھر اعصاب کو جھنجھوڑ دینے والی بے چینی نے حملہ کیا تھا۔ سعدیہ اس



وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ خورشید احمد والے قتل کیس میں وہ اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ اکثر کئی کئی گھنٹے اسے باہر رہنا پڑتا تھا۔ بہر طور...... شام پَر تولے کھڑی تھی۔ آمنہ بیگم نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنی خالات زندگی پر مبنی فیروزی رنگ کی ڈائری سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس کے تئیں یہ ڈائری پڑھنے کا بہترین موقع تھا کیونکہ ان کی بیٹی سعدیہ فی الوقت موجود نہ تھی۔ اس نے ڈائری کے ابتدائی چند وہ صفحات پلٹے جنہیں وہ پہلے ہی پڑھ چکی تھی اس کے بعد اپنا مطلوبہ صفحہ سامنے آتے ہی پڑھنا شروع کر دیا۔

"واثق علی، مجھے کیا ملے کہ زندگی ہی بدل گئی میری۔ پہلے میری ذات احساس محرومی اور تنہائی کے خول میں بند رہتی تھی۔ مگر اب میری ذات کے سیپ نے جیسے اپنا آپ کھول کر رکھ دیا...... اور واثق علی کی صورت میں مجھے گویا ساری عمر کے لئے سچا موتی بطور انعام مل گیا...... واثق علی کو پا کر میں بہت خوش تھی۔ اس سے پہلے میری زندگی میں صرف باپ کی شفقت تھی۔ مگر اب اس کے ساتھ ساتھ واثق علی کی بطور شوہر محبت بھی میسر آ گئی تھی۔ غرض واثق کی سنگت میسر آتے ہی میں اپنے گرد و پیش سے قطعاً بے خبر ہو گئی...... یہاں تک کہ اپنے جی جان سے مجھے پیار کرنے والے پپا کی جانب سے بھی غافل ہو گئی...... ہوش مجھے تب آیا، جب انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا پھر مجھے اندازہ ہوا کہ پپا کی صحت پہلے سے کس قدر ڈاؤن ہو چکی تھی...... وہ دل کے پہلے حملے سے بچ تو گئے تھے لیکن صحت کے معاملے میں وہ بالکل آدھے ہو چکے تھے۔ اس کا سبب بھی مجھے معلوم تھا۔ وہ اس شادی سے خوش نہ تھے مگر میری ضد کے سامنے مجبور ہو کر انہوں نے مجھے واثق علی سے شادی کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اس غم میں اندر ہی اندر کڑھتے رہے تھے۔ اتنا کہ یہ بات انہوں نے دل پر لے لی تھی مجھے بھی حیرت ہوتی تھی کہ آخر پپا کو واثق علی کیوں نہیں پسند تھا اور اس کی میں وجہ جاننے کی بھی حقدار تھی لیکن عجیب بات تھی کہ انہوں نے واثق علی یا اس کے ڈیڈی سیٹھ عثمان کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ بتائی تھی۔ بس وہ چپ چپ اور گم صم رہنے لگے تھے۔ ان کی تنہائی کا قلق مجھے بھی ہوتا تھا۔ مگر واثق علی اتنے اچھے ثابت ہوئے تھے کہ جب سے میں "سعید مینشن" سے "عثمان ولا" بیاہ کر آئی تھی کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا تھا کہ جب واثق علی مجھے پپا سے ملانے "سعید مینشن" نہیں لے کر گئے ہوں۔ کیونکہ میں نے خصوصی طور پر واثق علی سے

یہ وعدہ لیا تھا کہ میری شادی کے بعد چونکہ پپا بالکل تنہا رہ جائیں گے اس لئے میں ہفتے میں ضرور ایک بار ان سے ملنے جایا کروں گی۔ اور واثق علی نے اپنے وعدے سے آج تک انحراف نہیں کیا تھا۔ باوصف اس کے مجھے معلوم تھا کہ آخر پپا اب تک اپنی ''ہٹ'' پر کیوں قائم ہیں۔ یہاں تک کہ اس غم میں وہ گھل کر رہ گئے تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ شاید تنہا ہو جانے سے پپا کی صحت متاثر ہوئی ہو..... مگر یہ بات مجھے زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں اکثر مصنوعی خفگی سے اس سلسلے میں ٹوک کر پپا کو کہتی..... ''پپا! آپ بہت خراب۔ ہیں آپ نے مجھے معاف نہیں کیا ہے ناں..... پلیز پپا کم آن! واثق علی بہت اچھے انسان ہیں۔ آپ نے دیکھا شادی کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ آج تک مجھ سے کئے گئے اپنے وعدے پر پابند ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ.....'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور منہ پھلا لیا..... مقصد یہی تھا کہ کسی طور پر پپا کے دل سے واثق کی کدورت ڈھل جائے۔ مگر یہ میری بھول ہی رہی پتہ نہیں ایسا کیا پپا نے واثق اور ان کے ڈیڈی میں دیکھا تھا کہ وہ ان سے کاروباری تعلق رکھنے پر مجبور تھے لیکن رشتے داری نہیں..... مزید براں وہ اپنی اس پر اسرار ناراضگی کی وجہ بھی بتانے سے قاصر تھے۔ بہر طور میں تو اپنے تئیں واثق یا ان کے ڈیڈی عثمان سے پپا کی اس پر اسرار ناراضگی کو ان کی کاروباری رقابت پر محمول کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا میری بات پر پپا کا چہرہ کچھ خالی خالی نظر آنے لگا..... ایک تکلیف دہ اداسی کی پر تفکر لکیری ان کے چہرے پر دراڑ ڈالے ہوئے تھی۔ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''بیٹی خدا کرے کہ واثق علی تمہارے ساتھ اچھا ہی رہے اور تم دونوں کبھی دکھ نہ دیکھو، لیکن بیٹی انسان کو خوشیوں کے ساتھ ساتھ خود کو کسی اچانک پیش آنے والے تلخ حالات کے لئے بھی پہلے سے ذہنی طور پر تیار کر لینا چاہئے۔ کیونکہ پھر اسے زیادہ شاک نہیں لگتا۔ ان کا چہرہ ایک بار پھر بجھ گیا اور میں ہک بک سی رہ گئی۔ ان کی اس ذومعنی بات پر، آخر وہ اشاروں کنائیوں میں مجھے آئندہ کے کون سے تلخ حالات سے پیشگی محتاط رہنے کی تاکید کر رہے تھے۔ پپا کی اس ذومعنی گفتگو نے مجھے یک دم اتنا بے چین کر دیا کہ میں نے دوٹوک الفاظ میں پوچھ ہی لیا۔ ''پپا! پلیز آپ کھل کر کیوں نہیں بتاتے کہ مجھے آخر مستقبل میں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جنہیں آپ ابھی سے ہی اتنا محسوس



کرنے لگے ہیں کہ آپ کی صحت بھی آدھی ہو کر رہ گئی ہے۔''

میری بات پر پپا نے..... جو بیڈ پر نیم دراز تھے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے سے بڑبڑائے..... ''بس بیٹی میں نے جو بات تمہارے دل و دماغ میں ڈالنی تھی سو ڈال دی..... آگے تمہارا اللہ نگہبان! بس میری دعا ہے کہ تمہیں کبھی اپنی ضد پر پچھتاوا نہ ہو۔''

پھر..... پپا ہمیشہ کے لئے گویا مجھ سے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی سے بھی ناراض ہو کر اتنا دور چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ میں غم و اندوہ کے مارے گنگ ہو گئی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھتے ہی مجھے صحیح معنی میں احساس ہونے لگا کہ یتیمی کیا ہوتی ہے۔ دھن، دولت، اچھا شوہر ہونے کے باوصف مجھے اندازہ ہوا کہ سایہ پدر کیا شے ہوتا ہے۔ واثق علی کے ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنے اندر یکا یک ایک خلاء سا محسوس ہونے لگا اور میرا ازلی احساس محرومی ایک بار پھر میرے آگے استہزائی ہنسی کے ساتھ سامنے آن کھڑا ہوا۔ بہر طور ان غمناک لمحوں میں واثق نے مجھے بہت سہارا دیا۔ وقت واقعی بے رحم اور بے حس ہے۔ انسانی جذبات پر سرد مہری کی ایسی پردہ پوشی کرتا ہے کہ انسان بالآخر زمانے کے سرد و گرم میں گم ہو کر اپنے پیاروں کو ذہن سے محو کرنے لگتا ہے۔ بہر کیف مجھے اب یوں لگتا تھا کہ زندگی نیا رخ اور نئی کروٹ لینے والی ہے۔ اندیشوں اور بھیدوں بھری پر اسرار کروٹ میرا میکہ..... بالفاظ دیگر، سعید مینشن اب ویران ہو چکا تھا جہاں چیختے سناٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ادھر واثق علی کی محبت و انسیت بھی میرے ساتھ سوا ہونے لگی تھی وہ جب بھی مجھے پپا کی یاد میں ذرا بھی اداس محسوس کرتے تھے تو فوراً اچانک ان کا پیار بھادوں ساون بن کر میرے اداس آنگن میں ٹھنڈی پھوار بن کر برسنے لگتا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی جب میں یونہی ضد کر کے واثق علی سمیت اپنی کوٹھی ''سعید مینشن'' میں کچھ روز کے لئے آ کر رہنے لگی تو ایک دن پپا کے بیڈ روم میں اداس بیٹھا پا کر واثق علی نے مجھے آ گھیرا اور مجھے میٹھے درد بھرے شکنجے میں جکڑ کر محبت سے لبریز لہجے میں بولے۔ ''کم آن..... آمنہ..... میں چاہتا ہوں تم بس میری محبت کے حصار سے نہ نکلو، میں تمہاری اداسی کی وجہ جانتا ہوں بے شک ایک باپ کا خلاء کوئی اور پر نہیں کر سکتا لیکن آمنہ! ایک پر خلوص دوست ہر طرح کا خلا پر کرنے کی اہلیت رکھتا

ہے اور وہ دوست ......"

میں نے فوراً مسکرا کر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا..... "اور وہ دوست آپ ہیں..... پُرخلوص دوست ..... ہر طرح کا خلاء پُر کرنے والے۔" میری بات پر ان کی باریک مونچھوں تلے ہلکے سرمئی لبوں پر وجاہت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

ہم دونوں ڈنر وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ماہِ اپریل کی سہانی رات کا آغاز تھا۔ تب تھوڑی دیر بعد واثق علی ایک دم سنجیدہ سے نظر آنے لگے اور اس لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوئے۔ "آمنہ میں چاہتا ہوں تم میری قربت میں کسی بھی دکھ کو یاد نہ رکھو۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ..... کہ..... تم یہ..... میرا مطلب ہے سعید مینشن کو فروخت کر دو۔"

واثق علی کی بات پر میں چونک کر ان کی جانب تکنے لگی..... وہ میری چونکتی ہوئی نگاہوں کو محسوس کر کے فوراً بولے۔ "یہ محض میں تمہاری بھلائی ہی کی خاطر بول رہا ہوں..... کیونکہ تم جب بھی یہاں آتی ہو دکھی ہو جاتی ہو۔"

میں نے چپ ہو کر اپنی نگاہیں جھکا لیں اور پھر ایک دن مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ واثق علی نے میری اس دن کی خاموشی کو انہوں نے رضامندی پر محمول کیا تھا اور وہ "سعید مینشن" کا باقاعدہ ایک دن گاہک بھی ڈھونڈ لائے تھے۔ وہ ایک اشاعتی ادارے کا مالک و بانی تھا۔ اور بیک وقت اس کے ادارے سے چار عدد مجلے، ایک ہفت روزہ اور ایک روزنامہ نکلتا تھا۔ اب وہ اپنا مذکورہ پورا دفتر کسی لمبی چوڑی عمارت میں منتقل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لئے اس نے سعید مینشن کا انتخاب کیا تھا اور اس کی منہ مانگی قیمت بھی دینے پر آمادہ تھا۔

"ویسے تمہاری مرضی ہے کہ تم اپنی کوٹھی فروخت کرتی ہو یا نہیں..... لیکن یقین مانو آمنہ..... درحقیقت میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔" واثق دھیرے دھیرے دوبارہ کہنے لگے۔ "آمنہ! پتہ ہے اس کوٹھی میں آ کر تم میرے ہوتے ہوئے بھی رنجیدہ سی ہو جاتی ہو ناں ..... تو مجھے جانے کیوں پھر رقابت سی محسوس ہونے لگتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کیا میرا پیار اتنا بے اثر اور بے قیمت ہے کہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔ میری رقابت میں کسی قسم کا عناد نہیں ہے..... یہ



بھی ایک محبت کا بے غرض اور جنونی پہلو ہے۔" اتنا کہہ کر وہ مجھے ایک وسیع سوچوں کے گرداب میں غلطاں چھوڑ کر چپ ہو گئے..... اور ان کی حلاوت بھری اس ذومعنی اور محبت کے ان گنت خفتہ پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتی گفتگو نے مجھے نہال اور مسرور سا کر دیا..... مجھے فخر سا ہونے لگا..... میں کسی ماہر نفسیات کی طرح ان کی بات کا مطلب سمجھ رہی تھی..... یعنی وہ مجھ سے ایسی محبت کرنا چاہتے تھے جس میں گم ہو کر میں ہر طرح کے غم اور دکھ سے یکسر مبرا ہو جاؤں اور خود مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی یہی کچھ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے ہر لمحے اتنی زیادہ چاہت دینے کی جستجو میں مگن رہتے تھے کہ میرا دھیان کسی دکھ اور اداس کر دینے والی سوچ یا یاد کی طرح نہ بھٹکنے پائے ..... حتیٰ کہ مجھے اپنے پپا کو یاد کر کے اداس سا ہو جانے پر بھی محتاط رہنا پڑتا تھا..... غرض واثق کی محبت کے اس معصوم سے نفسیاتی جنون میں مجھے ایک بالکل انوکھی اور منفرد چاہت کا پہلو نظر آیا لیکن میں انہیں کس طرح سمجھاتی کہ خونی رشتوں کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہو سکتی..... ہاں! بے رحم وقت کی گرد اس پر جم تو جاتی ہے لیکن اس یاد کو مٹا نہیں سکتی..... لہٰذا "سعید مینشن" کو فروخت کرنے کی واثق کی تجویز نے جہاں مجھے ایک ذہنی جھٹکا پہنچایا تھا تو وہاں ان کی محبت آمیز انوکھی رقابت کا عقدہ بھی کھلا کہ وہ مجھے کتنا زیادہ چاہتے تھے یعنی میرے چہرے پر انہیں ذرہ برابر بھی دکھ کی پرچھائیں دیکھنا گوارا نہ تھا۔ تاہم جب اس سلسلے میں انہوں نے مجھے خاموش پا کر میری مرضی پوچھی تو میں لحہ بھر توقف کے بعد بولی۔

"واثق! بے شک تمہاری محبت اور قربت میں مجھے آج تک کسی غم اور دکھ کا احساس نہیں ہوا..... میرا اب جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کی اگر یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ مجھے بھی یہ گوارا نہیں کہ میرے چہرے پر غم کی کوئی پرچھائیں آپ کے لئے کسی ذہنی کوفت کا باعث بنے۔"

میں نے دیکھا میری بات پر ان کے چہرے پر بالکل بچوں جیسی خوشی سی پھوٹ گئی۔ مجھے اندر سے دکھ تو ہوا..... اور میرے ضمیر نے مجھے ایسا کرنے پر سرزنش بھی کی، لیکن مجھے اس وقت واثق علی کے سوائے اور کسی کی پرواہ نہ تھی۔

بالآخر کوٹھی کا سودا..... ڈیڑھ کروڑ میں طے ہو گیا اور وہ فروخت بھی ہو گئی۔ میں

نے ان سے رقم کا نہیں پوچھا مگر انہوں نے فوراً ڈیڑھ کروڑ کی رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادی۔ اس پر میں نے انہیں کہا کہ بے شک اگر وہ چاہیں تو اس رقم کو وہ اپنے کاروبار کی ترقی یا بڑھوتری میں استعمال کر سکتے ہیں..... مگر انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں آمنہ! ان پیسوں پر تمہارا حق ہے۔ میں اپنی بے لوث چاہت کے بیچ روپے پیسے نہیں لانا چاہتا۔''

''مگر واثق ہم کوئی غیر تو نہیں ایک دوسرے کے لئے..... اگر میرا روپیہ آپ کے کسی کام آسکتا ہے تو۔''

انہوں نے فوراً میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور مسکرا کر بولے۔ ''جب کام آئے گا تب دیکھی جائے گی۔ ابھی تو اپنی رقم سنبھالو۔'' اور میں خاموش ہو گئی۔

دراصل پپا کے انتقال کے بعد سب کچھ میرے نام ہو چکا تھا..... حتیٰ کہ وہ تمام کاروبار بھی میرے نام ہو چکا تھا۔ میں سیٹھ عثمان یعنی میرے سسر صاحب کی بھی شراکت دار تھی..... لیکن میرے حصے کا سب کاروبار واثق علی سنبھالتے تھے، پھر دھیرے دھیرے واثق نے چند کاروباری ''مجبوریوں'' کے باعث میرے حصے کا کاروبار پاور آف اٹارنی کی صورت میں اپنے نام منتقل کروالیا یہی نہیں بلکہ ''کمبائن اسٹارز ٹریڈرز'' کا نام بھی تبدیل کر کے ''عثمان ٹریڈرز'' رکھ لیا۔

''ارے بھئی..... اس طرح لاکھوں کا انکم ٹیکس بچتا ہے۔'' میرے ایک دن یونہی فرم کا نام تبدیل کرنے کے بارے میں پوچھنے پر انہوں نے بتایا..... بہر طور قصہ کوتاہ، دھیرے دھیرے اور مختلف حیلے بہانوں سے بالآخر انہوں نے سارا کچھ میرا اپنے نام منتقل کروالیا اور میں بھی شوہر نامدار کے ایک اشارۂ ابرو پر اپنا سارا کچھ ان کے نام کرتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ میرے پاس ذاتی اکاؤنٹ میں صرف ڈیڑھ کروڑ باقی بچے تھے۔ ایک دن انہوں نے وہ بھی مجھ سے مانگتے ہوئے کہا۔ ''آمنہ! یہ پیسے محض لیزنگ اتھارٹی والوں کی اس شرط کے مطابق اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرانا چاہتا ہوں تاکہ وہ مجھے پچاس فیصد لون دے سکے..... کیونکہ میں جو پروجیکٹ شروع کرنے والا ہوں اس سلسلے میں مجھے فوری طور پر دس کروڑ کی ضرورت ہے..... لیکن اس کے لئے مجھے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ روپے ظاہر کرنے ہیں..... لہٰذا باقی رقم کا انتظام تو ہو گیا ہے



لیکن اب محض ڈیڑھ کروڑ کی ''شورٹیج'' کی وجہ سے میں مار کھا رہا ہوں۔

ان کی بات میری سمجھ میں آ چکی تھی میں جانتی تھی کہ واثق یہ رقم محض اپنے بینک بیلنس کو ''شو'' کرنے کی غرض سے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروانا چاہ رہے ہیں تاکہ انہیں اپنے ''پروجیکٹ'' کے لیے لون مل سکے۔ جہاں میرا اتنا کچھ ان کے نام ہو چکا تھا بھلا اب ان ڈیڑھ کروڑ کی کیا وقعت رہ گئی تھی۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر تھا ''عثمان ٹریڈرز'' یعنی اب دونوں باپ بیٹا ایک طرح سے بلاشرکت غیرے کاروبار کے مالک تھے۔ بہر حال میں نے فوراً ڈیڑھ کروڑ کی رقم بھی واثق کے اکاؤنٹ میں بہ طور لون سیکورٹی جمع کروادی..... میں اپنے تئیں خود کو شوہر کی مثالی بیوی ہونے کا کردار نبھا رہی تھی..... مگر میں نادان نہیں جانتی تھی کہ میرے اس ''مثالی کردار'' کے بدلے میں واثق کون سا بھیانک روپ ظاہر ہونے والا تھا..... اور بالآخر ایک دن ان کا یہ گھناؤنا روپ حرا خانم کی صورت میں مجھ پر ظاہر ہوا..... لیکن اس وقت تک تو میں بالکل تہی دست ہو چکی تھی، اور بے خانماں بھی..... تب مجھ پر ایک دم پپا کی واثق کو ناپسند کرنے کی وجہ کا عقدہ کھلا..... لیکن افسوس چڑیاں اس وقت تک کھیت چگ چکی تھیں۔

میرے خوابوں کی خوش فہم تعبیروں اور احساس تفاخر کو سنگھاسن چکنا چور ہو چکا تھا۔ میں آمنہ واثق..... جو اپنے شوہر کی انوکھی محبت کے زعم میں اتراتی پھرتی تھی آج وہ تفاخر آمیز زعم ہمیشہ کے لئے زخم بن گیا تھا۔ غم واندوہ سے آج تک نامانوس رہنے والی میری آنکھیں اب اشک جگر سوز سے تربہ تر اک غم مسلسل کی تصویر حیرت کا نظارہ پیش کرنے لگی تھیں۔ یکایک مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں کسی جھوٹے تاج محل کی گرتی ہوئی عمارت کے ملبے تلے زندہ درگور ہونے والی ہوں..... لیکن تب جیسے پپا کی ان باتوں کے سہارے نے میرے شکستہ وجود کو سنبھال لیا۔ میں متحیر سی ہو گئی تھی کہ اتنی بڑی مجھ پر قیامت ٹوٹ گئی اور میں زندہ کیسے رہ گئی۔ بلاشبہ پپا نے ایسی ہی کسی قیامت خیز گھڑی کے لئے پہلے سے مجھے ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے کہا تھا..... ''بیٹی! اچھا ہے کہ انسان سکھی رہتے ہوئے دکھ کے کٹھور پن کو بھی یاد رکھے۔ پھر اسے کوئی جان لیوا ''شاک'' نہیں پہنچتا۔'' اور واقعی شاید میرے لاشعور سے کہیں فوری ابھرنے والی پپا کی اس نصیحت نے مجھے کسی مہلک ''شاک'' سے بچا لیا تھا۔ لیکن مجھے اب اپنی روتی بلکتی

زندگی میں بھی کوئی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

حرا خانم وہ ناگن تھی جو میرے حق پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے میرے واثق کے دل پر کنڈلی مار کر بیٹھ چکی تھی...... مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ اس نے کب میری محبت پر شب خون مارا اور اپنا میٹھا زہر واثق کی رگوں میں اتار دیا۔ یا شاید میں خود ہی اتنی بے خبر رہی تھی لیکن قصور تو اس میں سارا واثق کا ہی تھا۔ ان کے جھوٹے پیار کی قلعی اتر چکی تھی۔

"واثق...... اس چڑیل سے شادی کرنے سے پہلے تمہیں مجھے طلاق دینی ہو گی۔" بالآخر میں نے دوٹوک لہجے میں واثق سے کہا۔

وہ بولے۔ "آمنہ! حرا سے شادی کرنا میری ایک مجبوری ہے...... یقین کرو محبت تو اصل میں صرف تم سے ہی کرتا ہوں۔"

"بھلا تمہیں ایسی کون سی مجبوری نے آن لیا جو تم اس سے شادی پر مجبور ہو کر گئے۔" میرے ٹوٹے ہوئے لہجے میں طنز کا عنصر غالب تھا۔ میری بات سن کر وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولے۔ "حرا میرے کاروبار میں مزید ترقی کا باعث بن سکتی ہے اب دیکھو ناں...... تم ایک مکمل ہاؤس ہولڈ وائف ہو جبکہ مجھے ایک ایسی بیوی کی ضرورت ہے جس کے اندر بزنس گڈز ہوں، جو میرے ساتھ شریک کاروبار بن کر رہے اور بزنس و دیگر اہم میٹنگوں میں بھی میرے ساتھ شانہ بہ شانہ چل سکے۔ میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری اہمیت ذرہ برابر بھی کم نہیں ہو گی۔"

"ختم کرو یہ ڈھکوسلے بازی......" غم آمیز جھنجھلاہٹ تلے میں چیخی۔ اس معاملے میں ان کا کسی بھی "عذر" کو درخور اعتنا نہیں جاننا چاہتی تھی۔ لہٰذا سپاٹ لہجے میں مزید بولی۔ "واثق!...... آخر ہمیں کس بات اور کس شے کی کمی ہے۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس سب ہی کچھ تو ہے۔ یہ کہو کہ مجھ سے اب تمہارا دل بھر گیا ہے۔"

میرے چپ ہوتے ہی بالآخر انہوں نے بھی سرد مہری کے ساتھ کہا۔ "تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

ان کے لہجے کے سناٹے نے ایک لمحے کو مجھے اندر سے کپکپا دیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اندر سے خود کو مضبوط کر لیا اور اسی لہجے میں جواباً بولی...... "میں عضوِ معطل بن کر نہیں رہنا چاہتی۔"



"تو ٹھیک ہے پھر آمنہ بیگم! میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں......"

یہ بھی میرے لئے حیرت کی بات تھی کہ میرے اندر ان سفاک جملوں نے ذرا بھی دراڑ نہ ڈالی اور نہ ہی میرے وجود کو کمزور پڑنے دیا۔ شاید اس لئے کہ میں نے اب خود کو ذہنی طور پر ہر طرح کے حالات کے لئے تیار کر لیا تھا۔ لیکن بہر نوع میں تھی تو ایک عورت ہی۔ میں اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے بولی۔ "آپ میرا حساب کر دیں میں اب یہاں ایک پل بھی رہنا نہیں چاہتی......"

"کون سا حساب؟" واثق یک دم انجان بن گئے اور میں ہکا بکا سی رہ گئی۔ "میرا روپیہ میری وہ دولت جو تم نے اپنے کاروبار میں لگائی۔ آخر میرا بھی تو کاروبار میں برابر کا حصہ تھا......" میرے لہجے میں دکھ آمیز حیرت اٹھ آئی۔

وہ سنگدلانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کون سا روپیہ آمنہ بیگم! اور کاروبار کا تو اب صرف میں مالک ہوں بلا شرکت غیرے۔" وہ آخری الفاظ پر زور دے کر بولے...... اور میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔

"کک...... کیا مطلب......" میرے کپکپاتے لبوں سے صرف اتنا ہی نکل سکا تھا اور اگلے ہی لمحے میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھاتا چلا گیا...... میں غش کھا کر گر پڑی۔

❁❁❁

باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا...... آمنہ بیگم ڈائری پڑھتے پڑھتے یک دم چونک سی گئیں۔ فیروزی رنگ کی ڈائری میں اپنی زندگی کے حالات کا سلسلہ درمیان ہی میں موقوف کر کے انہوں نے جلدی سے ڈائری کو بند کر کے محفوظ جگہ پر رکھا...... انہیں خدشہ تھا کہ کہیں آج پھر ان کی بیٹی سعدیہ وہ ڈائری پڑھتا نہ دیکھ لے جسے پڑھنے کی اس نے سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ بہر طور...... آمنہ بیگم نے اپنی عینک درست کی...... کمرے سے نکل کر برآمدے اور پھر صحن میں آ گئی...... پھر انہوں نے بغیر دوسری جانب سے استفسار کئے دروازہ کھول دیا کیونکہ وہ سعدیہ کی دستک دینے کے مخصوص انداز سے واقف تھیں...... سامنے حسب توقع سعدیہ ہی کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔ وکیل سعدیہ اپنی ماں کا چہرہ بغور دیکھتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی۔" آمنہ بیگم نے ملائمت بھرے لہجے میں کہا۔

سعدیہ اپنے کمرے میں آ گئی...... تھکی تھکی سی کاغذوں کا پلندہ اپنی چارپائی کے قریب دھری رائٹنگ ٹیبل پر پھینکا...... پھر ذرا دیر بعد جب وہ لباس بدل کر لوٹی تو اس کی ماں چائے بنا کر لے آئی۔

"امی! آج ماسی رحیماں نظر نہیں آ رہی۔" سعدیہ ماں کے ہاتھوں سے چائے لیتے ہوئے بولی۔ "اس کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی۔ آئی تو تھی پر میں نے اسے جلدی چھٹی دے دی......" آمنہ بیگم نے جواب دیا اور سامنے کی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"اچھا کیا...... بے چاری بہت غریب ہے...... میں تو یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں اس مہنگائی کے دور میں ان غریبوں کا کس طرح گزر بسر ہوتا ہو گا۔ جبکہ پیچھے چھوٹے بچوں کی فوج بھی ہو۔" سعدیہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں ماں سے مخاطب ہوئی تو آمنہ بیگم مسکراتی نظروں سے سعدیہ کی جانب دیکھ کر مدبرانہ لہجے میں بولی۔ "بیٹی! غریبوں کی زندگی اپنی جگہ، لیکن اس دور میں ہم جیسے درمیانہ لوگوں کا زیادہ برا حال ہے...... جنہیں اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"

"ارے واہ امی! آپ تو ٹھیک ٹھاک وکیلانہ طرز کا مباحثہ کر لیتی ہیں......" سعدیہ بولی اور اس کی ماں مسکرا دی پھر بولی۔ "آخر کو ایک وکیل کی جو ماں ٹھہری۔"

اس بات پر دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے پر بیک وقت مسکراہٹ دوڑ گئی...... پھر اچانک جیسے کوئی بات ذہن میں آتے ہی سعدیہ سنجیدہ سی نظر آنے لگی اور قدرے عجلت میں اس نے چائے کے آخری گھونٹ بھرے۔

"خیر تو ہے...... کیا یاد آ گیا......؟" آمنہ بیگم اس کی عجلت کو بھانپتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا شائلہ کے ہاں سے ہو آؤں...... ابھی آ جاتی ہوں......" سعدیہ نے کہا۔

"بیٹی آ جانا ذرا جلدی...... رات ہونے کو ہے......"

"بس ابھی آئی امی! ویسے باورچی خانے کا کوئی کام......؟"

"ارے نہیں بیٹی! بس چاول چڑھا دیئے ہیں۔ سالن تیار ہے...... باقی چھوٹا موٹا تو کام میں بھی وقت گزاری کی خاطر کر ہی لیتی ہوں۔"



آمنہ بیگم نے کہا اور پھر سعدیہ اپنی چادر سنبھالے باہر نکل گئی۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں مقتول خورشید احمد کا گھر تھا...... سعدیہ نے دانستہ دوسری طرف کا راستہ اپنایا تھا کیونکہ پہلے وہ گلی کے جس سرے سے شائلہ کے گھر کی طرف جاتی تھی اس سرے پر عمر دین کی پان کی دکان تھی...... جب سے اس کی جھوٹے گواہ کے طور پر کورٹ میں سعدیہ نے درگت بنائی تھی تب سے وہ سعدیہ سے چڑچڑا رہتا تھا اور جب کبھی سعدیہ وہاں سے گزرتی تو وہ اس پر جملہ کسنے کی اوچھی حرکت کرتا سعدیہ نے فی الحال اسے دانستہ ڈھیل دے رکھی تھی ورنہ وہ اسے اس کی دکان سمیت محلے سے چھٹی کرا سکتی تھی...... بہرطور وہ جلدی جلدی چلتی ہوئی شائلہ کے گھر پہنچی۔ شائلہ اپنے کمرے میں بیٹھی سلائی کڑھائی میں مصروف تھی۔ جبکہ دروازہ خالہ نعمت نے کھولا تھا۔ سعدیہ کو دیکھ کر شائلہ یک دم کھل سی اٹھی۔ "آئیں باجی! لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں شائلہ کچھ ایسی ہی بات ہے۔" سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مصروف ہو۔"

"نہیں باجی! بس یونہی وقت گزار رہی تھی۔ کوئی بات پوچھنی ہے؟" شائلہ نے پوچھا۔

اس دوران اس نے سعدیہ کے لئے چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے کے لئے خالہ نعمت سے کہا مگر سعدیہ نے سنجیدگی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "شائلہ! دراصل میں تمہیں رنجیدہ کرنے نہیں آئی...... جب تک تمہارے ابو کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا، ایسے مواقع آتے رہیں گے جس سے شاید تمہیں کچھ تلخ لمحوں کے کڑوے گھونٹ بھرنے پڑیں۔"

سعدیہ کی بات کا مطلب شائلہ سمجھ گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کے گلابی چہرے پر دکھ کی لکیر سی نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ بولی "باجی! میں جانتی ہوں۔ اور باوجود اس کے آپ سے ہر طرح کے تعاون کے لئے خود کو مضبوط بھی رکھنے کی کوشش کروں گی۔"

"شاباش! یہ ہوئی نا بات......" سعدیہ تہنیتی لہجے میں بولی اور اضافہ کیا۔ "شائلہ اس طرح تمہیں آئندہ بھی جرأت اور حوصلے سے کام لینا ہو گا اور تم خود کو بالکل اکیلا مت سمجھنا۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ ذرا اچھی طرح یاد کرتے ہوئے کہ انکل خورشید نے کبھی

تمہیں اپنی ملازمت کے سلسلے میں کچھ بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کیسی ملازمت کرتے تھے...... کبھی انہوں نے تم سے اپنے مالک وغیرہ کے بارے میں بتایا۔ ان کا نام وغیرہ۔" شمائلہ کی پیشانی پر کچھ سلوٹیں ابھریں جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی سعی کر رہی ہو...... پھر بولی۔ "ابو نے اپنی ملازمت یا اپنے مالک کے بارے میں تو شاید کبھی کچھ بتایا نہیں یا پھر ذکر کیا بھی ہو تو میں نے دھیان نہیں دیا لیکن ان کی اکثر ڈیوٹی رات میں شروع ہوتی تھی جو دن بارہ بجے تک رہتی تھی اور جب میں ان کی اس شبینہ ڈیوٹی کے بارے میں کبھی پوچھ لیتی تھی تو وہ اکثر مجھے یہی بتاتے تھے کہ ان کا کام بہت ذمہ داری والا ہے اور اتنا ہی حساس بھی......" شمائلہ نے اپنی بات پوری کی۔ سعدیہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی ذرا دیر بعد وہ پھر شمائلہ سے مستفسر ہوئی۔ "تمہارے ابو اپنی اس ملازمت سے خوش تھے...... میرا مطلب ہے کبھی انہوں نے اس ملازمت سے بیزاری تو ظاہر نہیں کی تھی۔"

"نہیں باجی، ایسی بات تو کبھی میں نے محسوس نہیں کی کہ وہ بیزار ہوں۔ لیکن آخری دنوں میں وہ کچھ متفکر سے نظر آتے تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے...... معاف کرنا...... قتل سے کچھ روز پہلے......" سعدیہ نے کسی خیال کے تحت ایک دم پوچھا تو شمائلہ نے تائیدی انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں باجی...... اس روز...... تو وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے تھے اور صبح سے کام پر نہیں گئے تھے۔"

"شمائلہ! مجھے ذرا اپنے ابو کے کمرے میں لے چلو۔"

"ہاں باجی۔ آئیں۔" شمائلہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر وہ دونوں دوسرے کمرے میں آ گئیں یہاں ایک چارپائی پر کڑھائی کی ہوئی چادر بچھی ہوئی تھی۔ دیوار پر مقتول خورشید احمد کی تصویر بھی آویزاں تھی۔ قریب ہی کپڑوں کی دیوار گیر چھوٹی سی الماری تھی جو بند تھی۔ ایک میز بھی تھی۔ شمائلہ کو وہاں کھڑا ہونا دو بھر ہو رہا تھا۔ سعدیہ، شمائلہ کی اس غمناک مجبوری کو محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔ "شمائلہ! تم بے شک ذرا اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں یہاں کچھ دیر رکنا چاہتی ہوں۔" اور شمائلہ "اچھا باجی" کہتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ سعدیہ اب گہری نگاہوں سے پورے



کمرے اور وہاں موجود اشیاء کا جائزہ لینے میں مگن تھی...... وہاں ہر چیز اپنی جگہ پر طریقے سے رکھی تھی۔ سعدیہ نے وہیں کھڑے کھڑے اس بھیانک واردات کا خیالی نقشہ ذہن میں مرتب کیا جس روز شمائلہ کا باپ قتل ہوا تھا...... اس نے سوچا کہ قاتل نے اپنے گھناؤنے فعل کا ارتکاب سب سے پہلے اسی کمرے سے کیا ہو گا۔ سعدیہ نے کپڑوں کی دیوار گیر الماری کا رخ کیا، جس پر صرف کنڈی چڑھی ہوئی تھی...... اس نے الماری کے دونوں پٹ وا کر دیئے۔ سامنے ایک اسٹیل کی راڈ پر ہینگر جھول رہے تھے، جن پر مردانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے جو یقیناً مقتول خورشید احمد کے ہی تھے...... ان میں زیادہ تر پتلونیں تھیں پرانے فیشن کی...... سعدیہ یونہی کسی خیال کے تحت ان کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ محض چند غیر اہم کاغذوں کے پرزوں کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا...... پھر الماری بند کر کے سعدیہ نے میز کی طرف رخ کیا...... جس میں صرف ایک ہی دائیں جانب دراز بنی ہوئی تھی۔ وہ بھی مقفل نہ تھی۔ سعدیہ نے دراز کھولی اس کے اندر ریزگاری، چھوٹی کنگھی اور جیبی کیلنڈر بکھرے ہوئے تھے۔ معاً سعدیہ کو دراز کے آخری سرے پر ایک کوٹیڈ کارڈ پڑا ملا جس پر مقتول خورشید احمد کی تصویر چسپاں تھی اور اس کا نام مع ولدیت لکھا تھا اور پتہ درج تھا۔ کارڈ کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح اس کا جائزہ لینے پر سعدیہ کی مقتول خورشید احمد کے عہدے پر بھی نظر پڑی۔ جہاں گوڈاؤن کیپر درج تھا۔ کارڈ کی عین پیشانی پر جلی حروف میں "عثمان ٹریڈرز" پڑھ کر سعدیہ بری طرح چونکی اور پھر دھیرے دھیرے اپنا سر اثباتی انداز میں ہلانے لگی۔ جیسے اس کے کسی اندرونی قیاس یا خیال کی تصدیق ہو چکی ہو۔ کارڈ پر درج تمام عبارت انگریزی میں ٹائپ تھی۔

سعدیہ کی نگاہیں کارڈ پر درج "عثمان ٹریڈرز" پر جم سی گئی تھیں۔ یہ مقتول کا بلاشبہ سروس کارڈ تھا۔ سعدیہ نے وہ کارڈ اپنے پاس رکھ لیا۔ اس نے ایک بار پھر دراز کی تلاشی لی اور تب اسے ایک دانت کا خول بھی پڑا ملا۔ سعدیہ نے بے اختیار اسے اٹھا کر دیکھا وہ واقعی مصنوعی دانت تھا۔ سعدیہ نے اسے اپنی مٹھی میں دبوچ لیا اور کمرے سے نکل کر شمائلہ کے پاس آ گئی۔ سعدیہ نے مٹھی شمائلہ کے سامنے کھولی اور اس کی ہتھیلی پر مصنوعی دانت پڑا تھا۔ جسے دیکھ کر شمائلہ نے سعدیہ کی جانب عجیب مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔ "شمائلہ! یہ دانت کیا تمہارے ابو استعمال کرتے تھے۔" سعدیہ نے سنجیدہ

لہجے میں شائلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا...... تو وہ نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں باجی! ابو کوئی ایسا دانت استعمال نہیں کرتے تھے یہ...... یہ تو مجھے باہر صحن میں پڑا ملا تھا۔ جھاڑو دینے کے دوران پتہ نہیں میرے سر میں کیا سمائی کہ اسے اندر ابو کے کمرے میں ان کی میز کی دراز میں رکھ دیا۔''

شائلہ کی بات پر سعدیہ کے چہرے پر یک دم جوش کی تمتماہٹ عود کر آئی اور وہ پر سوچ لہجے میں شائلہ سے بولی۔ ''شائلہ! تم نے یہ بہت اہم کام کیا ہے کہ اسے سنبھال لیا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ کہ یہ دانت تمہیں کس روز ملا تھا۔ میرا مطلب ہے انکل کے قتل والے روز یا بعد میں۔''

شائلہ، سعدیہ کی بات سن کر چند ثانیے کچھ سوچتی رہی پھر جیسے اسے یاد آ گیا اور بولی۔ ''ہاں باجی! ابو کی وفات کے شاید تیسرے چوتھے روز مجھے یہ صحن کے ایک کونے میں پڑا ملا تھا اس روز ہی میں نے صفائی کی تھی صحن کی۔''

شائلہ کی بات سننے کے بعد سعدیہ نے قریب متحیر سی کھڑی خالہ نعمت سے بھی تصدیق کی...... لیکن اس نے بھی صاف انکار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مصنوعی دانت اس کا نہیں ہے۔ تب سعدیہ دوبارہ شائلہ سے مخاطب ہو کر مستفسر ہوئی۔ ''شائلہ! اب مجھے یہ بتاؤ کہ جس روز تمہیں یہ دانت ملا تھا صحن میں اس سے تین روز پہلے تک یعنی انکل کے قتل والے روز تک کیا کسی نے صحن کی صفائی نہیں کی تھی؟''

''نہیں باجی...... بھلا اس وقت اپنی ہمیں ہوش نہ تھی۔ صفائی کیا کرتے۔'' شائلہ قدرے رنجیدگی سے بولی۔ لیکن پھر قدرے الجھے ہوئے لہجے میں سعدیہ سے پوچھا۔ ''باجی! آخر اس دانت میں ایسی کون سی بات ہے...... جو آپ اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔'' شائلہ کے معصومانہ تبصرے پر سعدیہ کی کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی آنکھوں میں ایکا ایکی جوش کی چمک لہرائی اور وہ سنسنی خیز لہجے میں شائلہ سے بولی۔ ''شائلہ! یہ دانت تمہارے ابو کے قاتل کا ہے۔''

سعدیہ کی بات سن کر شائلہ دھک سے رہ گئی اس کے خوبصورت چہرے پر یکلخت سراسیمگی سی چھا گئی...... اور وہ یک ٹک وکیل سعدیہ کا چہرہ تکنے لگی۔ پھر کپکپاتے لہجے میں بولی۔ ''بب...... باجی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''



''ہاں، شائلہ میں صحیح کہہ رہی ہوں...... مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ دانت اسی قاتل کا ہے۔ ابھی تم کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔'' یہ کہہ کر سعدیہ، شائلہ کو متحیر سا چھوڑ کر واپس چلی آئی۔

❁❁❁

''سعدیہ بیٹی! اس میں کوئی شک نہیں کہ تم انتہائی جانفشانی اور دیانتداری سے ایسا کام سرانجام دے رہی ہو، جس میں بلاشبہ خدا بھی تمہاری مدد کر رہا ہے۔'' ایڈووکیٹ رانا الطاف توصیفی لہجے میں اپنے سامنے کرسی پر براجمان سعدیہ سعید کی طرف دیکھ کر بولے۔ سعدیہ کے ساتھ والی کرسی پر ان کا بیٹا کمال بھی بیٹھا تھا۔ ایڈووکیٹ رانا الطاف کے لہجے میں بردبارانہ شفقت کو محسوس کرتے ہوئے سعدیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔ رانا الطاف ایک سینئر وکیل تھے اور کسی کی شخصیت کے سلسلے میں تبصرہ کرنے میں بھی بڑے محتاط رہتے تھے۔ چاہے وہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی عمر پچپن سال سے اوپر ہی تھی۔ سر اور مونچھوں کے بال نیلاہٹ مائل سفید تھے جو ان کی شخصیت میں رعب پیدا کر رہے تھے۔ انہوں نے سعدیہ کے سلسلے میں یہ حوصلہ افزا بات اپنے سامنے میز پر رکھے دانت کو دیکھ کر کہی تھی۔ انہیں بھی خاص حد تک سعدیہ کی اس بات سے متفق ہونا پڑا تھا کہ یہ دانت بلاشبہ اسی قاتل کا تھا جس نے خورشید احمد کا قتل کیا تھا۔ اس اثناء میں کمال نے بھی سعدیہ کی تعریف میں کچھ کہنا ضروری سمجھا اور وہ اپنے ابو سے بولا۔ ''ڈیڈی! ویسے یہ کام پولیس کے تفتیشی افسر صاحب کے کرنے کا تھا جو سعدیہ نے کر دکھایا۔''

''پولیس بھی یہ کام کر سکتی تھی...... ناممکن کام یہ ان کے لئے بھی نہیں تھا بیٹا...... لیکن مسئلہ صرف احساس ادائیگی فرض اور دیانت کا ہے بہر حال تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔ لیکن ایک بات کا خیال رہے۔'' رانا الطاف لمحہ بھر توقف کے بعد بولے۔ ''کہ اس بات کی ہوا پولیس کو نہ لگے کہ تم لوگوں نے اصل قاتل کے خلاف پیش رفت شروع کر رکھی ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ دادا محمد عرف دادو کو دانستہ سازش کے تحت پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لہٰذا مے بی پاسیبل کہ پولیس بھی اس سازش میں شریک ہو۔'' آخری بات انہوں نے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔ سعدیہ ان کی جانب

دیکھتے ہوئے بہ غور ان کی بات سن رہی تھی۔ پھر ان کے خاموش ہوتے ہی تائیدی لہجے میں بولی۔ ”جی ہاں انکل! میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ پولیس کو ابھی فی الحال دور ہی رکھا جائے۔“ اس کی بات کے اختتام پر کمال بولا۔ ”لیکن ڈیڈی! آخر کبھی نہ کبھی تو ہمیں پولیس کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“ رانا الطاف نے بہ غور اپنے بیٹے کمال کی بات سنی اور اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگے۔ وہ کمال کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے...... بولے۔ ”بیٹا! تم نے درست کہا لیکن اس سلسلے میں تم بے فکر رہو اور تندہی کے ساتھ اصل قاتل کی کھوج جاری رکھو۔ پولیس میں ابھی دیانتدار اور فرض شناس افسر موجود ہیں۔ فی الحال تو تمہیں یہ پتہ لگانا ہے کہ یہ مصنوعی دانت ہے کس کا...... لیکن مجھے یقین ہے کہ تم لوگ اس سلسلے میں جلد کامیابی حاصل کر لو گے۔“ ابھی انہوں نے اتنا کہا تھا کہ ان کی سیکرٹری نے آ کر اس وزیٹر کی اطلاع دی کمال نے جلدی سے اٹھ کر سامنے میز پر دھرا مصنوعی دانت اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا پھر کوئی نصف گھنٹے بعد سعدیہ اور کمال آفس سے باہر آ گئے۔

باہر دھوپ خاصی تیز اور چبھتی ہوئی تھی۔ وہ چلتے ہوئے سروس روڈ پر کھڑی اپنی آلٹو کار کے قریب آ گئے۔ سامنے سڑک پر ٹریفک شور مچاتا رواں تھا۔

”اب کہاں کے ارادے ہیں بھئی......؟“ کمال اپنی کار کی چھت سے کہنی ٹکا کر سعدیہ کی جانب دیکھ کر بولا۔ سعدیہ کا ذہن کسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ تاہم اس نے کمال کی بات سن لی تھی قدرے چونک کر بولی۔ ”کمال! اب اس دانت کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے...... سمجھ نہیں آ رہا...... آخر کس طرح پتہ چلایا جائے کہ یہ کس کا دانت ہے۔“

”ارے محترمہ! دانت کی فکر چھوڑو، آنت کی فکر کرو۔ بہت بھوک لگی ہے بھئی۔ ڈیڈی نے بھی بس چائے پر ٹرخا دیا۔“ کمال قدرے چڑ کر بولا تو سعدیہ کو ہنسی آ گئی۔

”بے فکر رہو مجھے اندازہ تھا تمہاری بے وقت بھوک کا۔“ یہ کہتے ہوئے سعدیہ نے اپنے پرس نما شولڈر بیگ سے ٹشو پیپر میں لپٹا ہوا سینڈوچ نکال کر کمال کی جانب بڑھا دیا اور اس کی آنکھیں سینڈوچ کو دیکھ کر بچوں کی طرح چمک اٹھیں۔ ”واہ بھئی یہ ہوئی نا سگھڑ ڈلیش...... ڈلیش...... والی بات۔“ کمال سعدیہ کے ہاتھ سے سینڈوچ لے کر



قدرے معنی خیز لہجے میں بولا اور سعدیہ اس کی ”ڈلیش......ڈلیش......“ والی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے مگر تجاہل عارفانہ سے کام لے کر کمال کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”ذرا اس سگھڑ...... ڈلیش...... ڈلیش والی بات کا مطلب تو بتانا۔“

”نن...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ویسے اس معنی خیز قسم کی ”ڈلیش...... ڈلیش“ میں ”محبوبہ“ یا ”بیوی“ کا لفظ بھی آ سکتا ہے...... ویسے تمہارا کیا خیال ہے کون سا لفظ مناسب رہے گا۔“ کمال سینڈوچ چباتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

”میں نے تمہیں سینڈوچ اس لئے نہیں دیا ہے کہ تم فضول باتیں چھیڑو۔ کچھ کام کی باتوں کی طرف بھی دھیان دو ذرا......“ سعدیہ نے مصنوعی غصہ دکھایا...... ساتھ میں آنکھیں بھی...... اور کمال انہی آنکھوں میں جیسے ڈوبتے ہوئے بولا۔

”غصے میں تم بہت حسین لگتی ہو۔ ویسے تم کسی ہاتھی دانت کی بات کر رہی تھیں کہ اس دانت کا ہاتھی کیسے تلاش کیا جائے۔ میرا خیال ہے چڑیا گھر زیادہ بہتر رہے گا۔“ وہ اپنی خوئے ظرافت سے کہاں بعض آنے والا تھا......

”پتہ نہیں تمہارے جیسا غیر سنجیدہ شخص وکالت جیسے سوبر شعبے میں کس طرح گھس آیا۔“ سعدیہ جز بز ہو کر بولی۔

ادھر کمال نے بھی بھانپ لیا کہ پارہ مزید نہ چڑھ جائے لہٰذا فوراً پٹڑی پر آ گیا اور یکدم سنجیدگی سے بولا۔ ”میرا خیال ہے اس دانت کے سلسلے میں کسی ڈینٹل سرجن سے ہی کچھ پوچھنا پڑے گا۔“

”بات پھر بھی واضح نہیں ہو رہی ناں آخر اس اتنے بڑے شہر میں......“ سعدیہ یہ کہتے کہتے رک گئی پھر جیسے کوئی معقول جواز ذہن میں آتے ہی اپنی ہی بات کاٹتے ہوئے کمال کی تائید میں دوبارہ بولی...... ”تم درست کہہ رہے ہو کمال...... اس شہر میں ڈینٹل سرجن بھلا ہوں گے بھی کتنے......“

”اور مزید یہ کہ یہ دانت جس پر ہمیں شک ہے کہ وہ خورشید احمد کے قاتل کے منہ سے پکے ہوئے پھل کی طرح ٹپک پڑا تھا، اس کی اعلیٰ ساخت اور ”میٹل“ کو دیکھ کر بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی کوالیفائڈ دندان ساز نے ہی بنایا ہو گا اور نہ صرف یہ بلکہ اس دندان ساز کے پاس اپنے مریضوں کا پورا ریکارڈ بھی محفوظ ہوتا ہو گا، جو بآسانی

ہمیں یہ دانت دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ کس کا دانت ہے لیکن اس کے لئے ذرا بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی......" کمال نے سعدیہ کی بات کاٹتے ہوئے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ مگر یہ تقریر سعدیہ کو اس قدر سودمند محسوس ہوئی کہ وہ حیرت و خوشی سے کمال کا چہرہ تکتی رہ گئی...... بے اختیار اس کے چہرے پر توصیفی جذبات نمودار ہوتے چلے گئے۔

"ارے واہ...... بھئی کمال تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔" وہ خوشی سے بولی۔

"جی محترمہ! باکمال لوگ لاجواب سروس...... اب چلئے بہت سے ڈینٹل سرجنز کو کھنگالنا ہے۔" کمال نے کہا تو سعدیہ پرسوچ لہجے میں بولی۔ "کمال! ہمیں سب سے پہلے "عثمان ٹریڈرز" چلنا ہوگا۔"

"عثمان ٹریڈرز! مگر کیوں؟" کمال ہولے سے بڑبڑا کر مستفسر ہوا...... کیونکہ سعدیہ نے فی الحال اس بات کو اپنے تک ہی محدود کر رکھا تھا کہ مقتول خورشید احمد عثمان ٹریڈرز فرم کا گوڈاؤن کیپر تھا اور مزید یہ کہ سعدیہ کی "عثمان ٹریڈرز" سے بہت تلخ اور کٹھور یادیں وابستہ تھیں۔ یہ لوگ اس کی ماں آمنہ بیگم کے بھی مقروض تھے۔ کمال نے محسوس کیا کہ سعدیہ کی بظاہر کھوئی ہوئی آنکھوں میں بلا کی تپش عود کر آئی تھی۔

داد محمد عرف دادو حیدر آباد سے ایک بھری پُری مسافر لاری کے ذریعے جامشورو اور پھر وہاں سے کوئی دس پندرہ کلومیٹر فاصلے پر اندر کچے کی جانب جانے والے راستے پر اتر گیا۔ لاری اسے اتار کر شور مچاتی آگے روانہ ہوگئی۔ دادو چھوٹی سی بُغچی تھامے تنہا کھڑا رہ گیا۔ بائیں جانب چھدری چھدری خودرو جھاڑیوں سے ذرا پرے شاہراہ عام پر لگژری کوچوں اور بھاری بھرکم ہیوی ٹریلر ٹرکوں کے پریشر ہارن گونج رہے تھے۔ شام پر تولے کھڑی تھی۔ دور مغرب میں سورج نارنجی ٹکیاں بنا نہنگ اور آسریں کے پیڑوں میں جھک رہا تھا۔ وہ پورے چار ماہ بعد اپنے گوٹھ آیا تھا...... لیکن تہی دست و داماں وہ سوچنے لگا اس کے بوڑھے ماں باپ اس کی راہ تک رہے ہوں گے کہ کب ہمارا جوان بیٹا شہر سے بہت سارا روپیہ کما کر واپس آ کر زمیندار اختیار علی کا قرض لوٹا کر انہیں اس کی بیگار سے نجات دلائے گا۔ یہ سوچتے ہی اس کا فراغ سینہ دکھ کے بوجھل احساس سے بھاری ہونے لگا۔ تصور میں کسی کا شگفتہ چہرہ بھی اداسی کا باعث بن رہا تھا۔ شائلہ کی غمناک اور منتظر نگاہیں اسے اپنا تعاقب کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے دونوں جانب ہی دہری ذمہ داریوں نے گھیر رکھا تھا۔ بہر طور اس نے اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے گوٹھ کی طرف جاتے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستے پر اتر گیا۔ اس کے دائیں بائیں خودرو جھاڑیوں والا میدان تھا۔ چند فرلانگ چلتے رہنے کے بعد سامنے کچے اور دھواں اڑاتے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں نمودار ہونا شروع ہونے لگیں...... یہ بہ مشکل چند سو نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جس کے اطراف میں بھی دور تک پھیلے ہوئے چاولوں اور گندم وغیرہ کے کھیتوں کے پار چھوٹے چھوٹے سرکنڈوں اور گاچنی مٹی والے جھونپڑی نما گھر بھی بنے ہوئے تھے۔ دادو جس وقت اپنے گوٹھ کے ایک جھونپڑی نما گھر کے سامنے پہنچ کر رکا تو تاریک رات اپنا پردۂ ظلمت

پھیلا چکی تھی۔ ویسے بھی اس نوع کا دور افتادہ گوٹھوں میں سرشام ہی رات اتر آتی تھی اور سناٹا پھیلنا شروع ہو جاتا تھا۔ اس جھونپڑی گھر کی سرکنڈوں والی ڈھلوان چھت کے چند روزنوں سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی اور ساتھ ہی اندر سے کسی کے کھانسنے کی متواتر آوازیں بھی آنے لگیں۔ دروازے پر باہر کی طرف ٹاٹ جھول رہا تھا اور حسب توقع جب دادو نے ٹاٹ ہٹا کر جھونپڑی نما مکان کا سالخوردہ دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر لالٹین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی...... سامنے ڈیوڑھی ویران تھی...... اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے گھاس پھونس کے تنکے سرسراتی ہوا میں کیڑوں کی طرح رینگتے محسوس ہو رہے تھے۔ سامنے پھونس کا برآمدہ تھا...... جس کے چھپر سائبان تلے لالٹین جھول رہی تھی...... اندر کمرے میں بھی روشنی پڑ رہی تھی...... ایک جھلنگا سی چارپائی پر بوڑھا مدقوق سا شخص حقہ لئے بیٹھا تھا۔ وہ حقہ کم پی رہا تھا، کھانس زیادہ رہا تھا۔ یہ اس کا ماما اللہ وسایا تھا۔

''ماماسائیں...... بسم اللہ...... دادو......'' اندر کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

سامنے جھلنگا چارپائی پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے ماما اللہ وسائے نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر جیسے وہ دادو کو پہچان گیا...... وہ چارپائی کی پٹی پر ٹانگیں لٹکائے ہوئے تھا۔ بوسیدہ صدری اور لاک باندھے ''ارے...... آ...... میڈا پٹ! دادو...... آ بابا...... آ کھڑا کیوں ہو گیا تو......'' یہ کہتے ہوئے ماما اللہ وسایا چارپائی سے بہ مشکل کپکپاتا ہوا اٹھا دادو فوراً آگے بڑھا اور اپنی جانب آتے ہوئے ماما سے لپٹ گیا۔

''اڑے...... کہاں رہ گیا تھا تو چھوکرا پلٹ کر کھیر کھبر ہی نہیں لی ہماری...... چاک تو ہے ناں تو ویسے......'' ماما نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''ہاؤ ماما سائیں! میں ٹھیک ہوں تو آپڑیں سنا...... تو کیسا ہے...... ماں پیو کیسے ہیں......'' دادو نے جواباً کہا۔ جانے کیوں اسے بھی اپنی آواز میں لرزش سی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں اب چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں لحہ بھر کو بوجھل سا گمبھیر سناٹا چھا گیا...... مدھم پیلی روشنی میں بوسیدہ کچی دیوار پر دونوں کے سائے مجرموں کی طرح لرزاں تھے...... ماما اللہ وسایا نے بہ غور دادو کی طرف دیکھا پھر ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے بولا۔



''ہا پٹ! میں تو چنگا ہوں...... پر حضور بخش اور ادی گنجل بے چارے بھوتار سائیں کے کھیتوں میں بڑا دکھ بھوگ رہے ہیں...... تیرا بڑا انتظار کرتے ہیں دونوں۔ چنگا ہوا تو آ گیا ضرور شہر سے تو چار پیسے کما کر ہی لوٹا ہو گا ناں...... صبح تڑکے ہی میڈے نال چلنا...... زمیندار اختیارے کے پاس...... اس کے منہ پر قرضہ مار کر بھا حضور اور ادی گنجل کو چھڑا لائیں گے۔'' ماما، اپنی دھن میں کہتا چلا گیا اور ساتھ ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

بے چارہ دادو دکھ بھرے دل سے سوچنے لگا۔ بھلا وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ خود شہر جا کر بے گناہ پھنس گیا تھا اور بجائے کمانے کے جیل میں سڑتا رہا تھا...... غنیمت تھا کہ ضمانت پر اسے رہائی نصیب ہو گئی تھی...... بہرطور وہ چپ رہا...... ماما کی کھانسی ذرا رکی تو وہ قدرے چونک کر اسے مخاطب کر کے بولا۔ ''پٹ! خیر تو ہے تُو چپ کیوں ہے؟''

اس کی بات سن کر دادو بڑبڑانے والی آواز میں گویا اسے تشفی دیتے ہوئے بولا۔ ''ہا ماما سائیں کل ضرور چلیں گے بھوتار سائیں کے پاس اور ماں پیو کو بھی لے آئیں گے آپڑیں نال۔''

باہر صحن میں ہوائیں تضحیک آمیز انداز میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

۞۞۞

صبح تڑکے ماما وسایا تو نہ جاگ سکا البتہ دادو اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر زمیندار اختیار علی کی اوطاق کی طرف نکل گیا۔ راستے میں اس نے گوٹھ کے اکلوتے چھپر ہوٹل میں چائے اور کیک پیس کا ناشتہ زہر مار کیا۔ چند لوگوں کے ذہنی کوفت پہنچانے والے استفہامیہ جملوں کا بیزار کن جواب دیا اور اٹھ گیا...... پختہ اینٹوں سے بنی قدرے کشادہ احاطے والی ایک پرانے طرز کی اوطاق میں جب دادو پہنچا تو خوش قسمتی سے زمیندار اختیار علی وہاں موجود تھا۔ کمدار مولا بخش بھی اس کے ہمراہ تھا۔ باقی مفلوک الحال ہاری ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے فرش پر۔ دادو کی نظریں ہاریوں کے درمیان اپنے ماں باپ کو تلاش کر رہی تھیں مگر اسے مایوسی ہوئی۔

''سلام سائیں بھوتارا!'' اس نے قدرے مودبانہ انداز میں سامنے سرکنڈوں کے بنے موڑھے پر بیٹھے زمیندار اختیار علی کو سلام کیا۔ زمیندار نے خشمگیں نگاہوں سے اس

کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف اور بیزار کن جنبش کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیا۔

"ہا...... بابا...... دادو...... کدھر ہے تُو...... تیرے ماں پیو تو ناکارہ ہو گئے ہیں۔ کام کے نہیں رہے اب اچھا ہوا تُو آ گیا لینے۔"

دادو سر جھکائے خاموشی سے زمیندار کی گفتگو سن رہا تھا۔ زمیندار اسے خاموش پا کر اس بار کو نجیلی اور تیز آواز میں دوبارہ بولا۔ "اڑے بابا! بولتا کیوں نہیں تو شہر گیا تھا روکڑا (پیسہ) کمانے...... میرا قرض لوٹا دے اب تکڑا......"

"سس...... سائیں وڈا...... شہر تو میں کمانے ہی گیا تھا...... پر......" وہ چپ ہو رہا...... اس کی آواز بھرا گئی...... زمیندار کے دائیں بائیں کھڑے اس کے چمچے "کھی...... کھی" کرنے لگے۔ زمیندار کے بھی گھنی مونچھوں تلے خاکستری ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کچھ اس طور جیسے وہ دادو کی ہیت کذائی سے پہلے ہی واقف ہو۔

"ہا، بابا بول...... چپ کیوں ہو گیا؟"

دادو نے زمیندار کی آواز پر چونک کر اپنا سر اٹھایا اور بہ مشکل بولا۔ "سس...... سائیں بھوتار...... مم...... میں...... مم...... مجھے غلامی میں لے لو...... میکوں اپڑاں رہاک (مزدور) بنا لو...... مم...... میڈے ماں پیو کو...... چھوڑ دو سائیں...... تیری ہم گریب پر وڈی مہربانی ہو گی سائیں بھوتار...... تیری وڈی مہربانی ہو گی سائیں وڈا......" یہ کہتے ہی دادو رو پڑا...... اس کی آہ و زاری پر جیسے بے حس اور سنگی اوطاق کی دیواریں تک ہنس پڑیں...... وہاں موجود ہر وہ شخص جس کا شمار زمیندار کے تلوے چاٹنے والوں میں ہوتا تھا، دادو کی بے بسی پر اس کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ چند ایک ہاری زمین پر سر جھکائے مغموم بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دادو کے لئے ترحم تھا مگر وہ شاید زمیندار سے اپنی یہ کیفیت مصلحتاً مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ دادو بے چارہ اب چپ ہو گیا تھا لمحہ بھر بعد زمیندار نے باآواز بلند اپنے کسی کمدار کو پکار کر کہا۔ "اڑے بچل......!"

"حاضر سائیں۔"

"بابا...... جا دوڑ کر فارم پر...... وہاں حضورے اور گنجل مائی کو لے آ...... کہنا، ان کا پٹ آیا ہے شہر سے روکڑا کما کر۔"



"نہ سائیں ایسا مت آکھنا (کہنا) میڈے ماں پیو کو مجھے دیکھ کر ان کا دل کھراب ہو جائے گا۔" دادو نے دردناک لہجے میں زمیندار سے التجا کی۔ مگر اس کی داد فریاد کو کسی نے درخور اعتنا نہ جانا اور بچل تمسخرانہ ہنسی ہنستا ہوا اوطاق سے نکل گیا۔

ذرا دیر بعد بچل حضورے اور مائی گنجل کو لے آیا اپنے ساتھ اوطاق میں...... انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے ان سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا رہا ہو۔ پھٹے پرانے پیوند زدہ کپڑوں میں ملبوس وہ بے چارگی اور بے مائیگی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ دونوں کی عمریں پچاس پچپن کے پیٹے میں تھیں لیکن ان کی کمر خمیدہ جسامت سے ظاہر ہوتا تھا جیسے ان پر وقت سے پہلے ہی بڑھاپا وارد ہو گیا ہے۔

دادو غمناک نظروں سے اپنے سامنے کھڑے ماں باپ کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا اور اس میں فرطِ غم کے احساس تلے ان کی جانب بڑھنے حتیٰ کہ پکارنے تک کی ہمت نہیں تھی۔ ادھر اس کے دونوں بوڑھے ماں باپ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بے چارے اپنی میچی ہوئی آنکھوں پر اپنے ہاتھوں کا چھجہ بنائے سامنے کھڑے اپنے بیٹے دادو کو جیسے پہچاننے کی سعی کر رہے تھے۔

"اڑے بابا دیکھتے کیا ہو تم دونوں بڈھے...... پہچانو اسے...... تمہارا پٹ ہے دادو! شہر سے آیا ہے روکڑا کما کر۔" زمیندار دونوں بوڑھوں کی حالت زار دیکھ کر تمسخر اڑانے والے انداز میں بولا۔

اس کی بات پر دونوں دادو کو پہچانتے ہوئے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ بڑھے۔ اتنے میں دادو بھی دیوانہ وار آگے بڑھا، اپنے دونوں بوڑھے ماں باپ کو اپنی چوڑی چھاتی سے لگا لیا اور سسک پڑا۔ اس کے دونوں بوڑھے ماں باپ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے دادو کا چہرہ چھوتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولے۔ "اڑے دادو! کیسا ہے تُو...... کب آیا؟" یہ اس کا باپ حضور بخش تھا۔

"میڈا لعل! تُو آ گیا...... مجھ بوڑھی سے اب کوئی کام نہیں ہوتا...... اب ہمیں گھر لے چل۔ تُو سائیں وڈے کے روپے دے دے گا نا...... لوٹا دے گا نا اب اس کا کرجا؟" یہ اس کی ماں مائی گنجل تھی۔

اپنے کمزور اور نحیف ماں باپ کی باتوں سے دادو بے چارے کا جگر چھلنی ہوا جا رہا

تھا۔ وہ اپنے ہونٹ بھینچے آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو روکے چند ثانیے خاموش کھڑا رہا تھا جب بولا تو اس کی آواز گلوگیر تھی۔

"ہاں میں آ گیا ہوں...... اڑے تمہارا دادو...... بیو! تو گڑتی (فکر) نہ کر...... دھڑیں سائیں چنگا کرے گا۔" اسے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی وہ جانتا تھا کہ اپنے ماں باپ کو وہ طفل تسلی دے رہا ہے۔

"پھر...... پھر ہمیں یہاں سے لے چل پٹ...... لے چل ٹکڑا......" اس کا باپ حضور فوراً بولا۔ اس کے لہجے میں ایک التجا...... ایک گریہ تھا...... جیسے وہ یہاں سے جلدی نکل جانا چاہتا ہو...... باپ کی بات پر دادو نے اسے تھپک کر تسلی دی پھر انہیں چھوڑ کر زمیندار اختیار علی کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑ کر دھیمے لہجے میں بولا۔ "سائیں بھوتار! اس وقت میرے ماں بیو کو میرے ساتھ جانے دو...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کل سے اڑیں ماں بیو کے بدلے تیری بیگار کاٹنے آ جاؤں گا...... سائیں۔" دادو کی التجا بھری گفتگو میں درد ہی درد تھا۔ وہ ترچھی نظروں سے اپنے پیچھے ذرا فاصلے پر کھڑے اپنے ماں باپ کو بھی دیکھ رہا تھا کہ کہیں ان کے کانوں تک اس کی بات نہ پہنچ گئی ہو...... ان بے چاروں کی سماعت ہی کمزور تھی وہ بھلا کیا سنتے...... انہیں نظر بھی کم ہی آتا تھا...... تاہم ادھر زمیندار دادو کا سرگوشی میں بات کرنے کا مقصد سمجھتے ہوئے خود بھی ذرا نیچی آواز میں بولا۔ لیکن اس بار اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"دیکھ بابا دادو! بات صاف ہے میرے پاس اب کام کرنے والوں کی کمی نہیں رہی بلکہ کئی مزدور اضافی میرے پاس ہیں اس لئے اب تُو سیدھے سیدھے میرے روپے واپس کرنے کی بات کر۔ مجھے تیری بیگار کی ضرورت نہیں۔" زمیندار کا لہجہ آخر میں سرد ہو گیا تھا۔ دادو اس کی بات پر اندر سے بری طرح دہل گیا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ زمیندار کا قرض یکمشت لوٹانا اس کے بس کی بات نہیں...... لگ بھگ تین سال قبل اس کے باپ حضور بخش نے 10 ہزار روپے زمیندار اختیار علی سے بہ طور قرض سود پر لئے تھے۔ درحقیقت حضور بخش کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا...... جو اس کی بہن حیا تاں کے سنگ کے سلسلے میں بہ طور عوض اس کے شوہر نے اس کے باپ یعنی دادو کے دادا کو دیا تھا۔ اب حضور بخش اس پر چھوٹا سا ہوٹل بنانا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے زمیندار



اختیار علی سے پورے دس ہزار قرضہ لیا...... ہوٹل تو بن گیا مگر چل نہ سکا۔ چلتا بھی کس طرح خود حضور بخش یار باش انسان تھا چرس کا نشہ کرتا تھا اور آئے دن اس طرح کے لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا جس سے ہوٹل کی آمدنی متاثر ہونے لگی۔ بیٹا دادو...... اشاروں کنایوں میں باپ کو ایسے کاموں سے روکنے کی بھی کوششیں کرتا تھا مگر اس کا باپ نہ مانا نتیجتاً ہوٹل نقصان میں جانے لگا۔ کیونکہ ہوٹل میں گاہکوں سے زیادہ اس کے باپ کے یار دوست زیادہ چائے وغیرہ اڑاتے اور پیسے بھی نہیں دیتے اور نا ہی حضور بخش ان سے مانگتا تھا۔ بہر طور ہوٹل بند کرنا پڑا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی گارے مٹی سے بنی ہوئی دیواریں بھی وقت کے ساتھ ساتھ اور نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے ڈھتی چلی گئیں۔ اور اب وہ محض سپاٹ زمین کی صورت اختیار کر گیا۔

ادھر زمیندار سے لیا ہوا قرض دس ہزار سے تین گنا بڑھ گیا۔ تب پھر زمیندار نے دادو کو پہلے بیگار پر اپنے ہاں گویا "قیدی" بنا کر رکھ لیا پھر اس کے بعد حضور بخش نے زمیندار اختیار علی کی منت سماجت کر کے "بیگار" کے لئے خود اور اپنی بیوی کو پیش کر دیا اور اپنے جوان بیٹے دادو کو اس کی نجی قید سے چھڑا لیا۔ پھر اس کے بعد دادو روپیہ کمانے شہر آ گیا تا کہ زمیندار کا قرض لوٹا کر جو اصل رقم سے تین گنا زیادہ ہو چکا تھا اپنے بوڑھے ماں باپ کو اس کی بیگار قید سے چھڑا سکے۔ لیکن یہی نہیں زمیندار اختیار علی نے ہوٹل والی زمین پر بھی غاصبانہ کر لیا تھا۔ باوجود اس کے وہ کہتا تھا کہ یہ زمین کا ٹکڑا محض اس کے سود کا آدھا بھی نہیں۔ لیکن اب جبکہ زمیندار اختیار علی کا یہ کہنا تھا کہ اب اسے ان کی بیگار کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے اور وہ یعنی دادو سیدھے سیدھے اسے اس کا قرض مع سود لوٹا دے تو دادو بے چارہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک بات سمائی اور وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے لجاجت سے بولا۔

"بھوتار سائیں! ہمارے ہاں تو اب اتنی رقم نہیں رہی اور نہ ہی میں شہر سے کچھ کما کر لوٹا ہوں آ...... آپ...... ایسا کرو سائیں کہ وہ...... وہ ہماری زمین قرض کے بدلے بے شک آپ رکھ لو۔"

"ہاں...... واہ ڑے چھورے...... یہ بھی خوب کہی...... تُو نے ہیں۔" زمیندار اس کی بات کا تمسخر اڑاتے ہوئے بولا۔ "اڑے چھورا تو کس زمین کی بات کر رہا ہے۔ وہ تھی

ہی کتنی۔ بدلے میں تو اس کے ابھی آدھا سود ہی پورا ہوا ہے اور تُو کہتا ہے کہ اس زمیں کے بدلے میں پورا قرضہ معاف کر دوں۔ ابھی تُو شہر سے آیا ہے اپڑیں ماں پیو کر گھر لے جا۔ جا ان سے میٹھی میٹھی باتیں کر...... جا، مگر کل ضرور یہاں حاضری بھرنا آ کر...... جا......" زمیندار کا تضحیک آمیز خشمگیں لہجہ اچانک ہی نرم پڑ گیا۔ اس پر بے چارے داد کو بھی حیرت ہوئی وہ خوش ہو کر بولا۔

"سائیں بھوتار! وڈی مہربانی تیری میں کل حاضری دوں گا۔ یہاں آوں گا میں۔"

"ہالا...... ہالا...... جا اب......" زمیندار نے ہاتھ کے اشارے سے گویا جان چھڑاتے ہوئے کہا اور معصوم سادہ لوح داوو...... اپنے بوڑھے ماں باپ کو وہاں سے لے آیا۔ دل ہی دل میں وہ زمیندار کی اس اچانک رحمدلی پر اسے دعائیں بھی دے رہا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اگلے دن ضرور زمیندار کی اوطاق پر جائے گا۔ کیا پتہ وہ کسی کام پر ہی اسے اپنے پاس رکھ لے۔ وہ ناوان اس بھیانک حقیقت سے بے خبر تھا کہ آگے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

❁❁❁

دن کے دو بجے کا وقت تھا چمکیلی دھوپ پوری طرح صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ آمنہ بیگم باورچی خانے سے نکلی اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے دو بجے تک اپنی بیٹی سعدیہ کا انتظار کیا تھا لیکن چونکہ سعدیہ کی انہیں تاکید تھی کہ وہ آج کل خورشید قتل کیس کے سلسلے میں معروف ہے۔ اس لئے اس کا کھانے پر ایک مقررہ وقت سے زیادہ انتظار نہ کیا جائے اس لئے آمنہ بیگم صرف اپنا کھانا لے کر کمرے میں آ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ذرا قیلولہ کیا۔ لیکن نیند نہ آئی۔ وہ اٹھی پھر تھوڑی دیر بعد وہ فیروزی رنگ کی ڈائری پڑھنے میں محو ہو گئی۔

"واثق! میرے شوہر! جن پر مجھے ناز تھا، ایک اعتماد تھا ان پر، جب انہوں نے مجھے اس کمینی عورت حرا خانم کی خاطر طلاق دے ڈالی اور نہ صرف یہ بلکہ میری ساری دولت پر بھی ہاتھ صاف کر کے مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا تو ایک لمحے کو تو میں ساکت ہو کر رہ گئی۔ مجھے اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ ایک تلخ اور بھیانک عفریت کی صورت میں دانت نکوسے میرے سامنے تھا۔ بھلا میں کیسے یہ



جھٹلا سکتی تھی۔ نتیجتاً میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور شریر بے جان سا ہونا شروع ہو گیا اور پھر اگلے ہی لمحے میں غالباً غش کھا کر گر پڑی تھی۔ لیکن جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں سرتاپا لرز کر رہ گئی۔

میں نے خود کو ایک بوسیدہ سے کمرے کی کھاٹ پر پڑے پایا اور میری حیرت آمیز، پریشان کن نگاہیں اوپر شکستہ کڑیوں والی چھت پر جیسے ٹک کر رہ گئی تھیں۔ کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں بھرا ہوا تھا۔ جس کے باعث چھت کی رنگت بھی سیاہ پڑ چکی تھی۔ مجھے ذرا گھٹن کا سا احساس ہونے لگا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ سُن رہا۔ لیکن پھر اگلے ہی لمحے میں نے اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی سعی کی تو اچانک مجھے کھانسی نے آلیا۔ تب میرے کھانسنے پر ایک جوان دبلی پتلی اور قدرے سانولی لڑکی اندر آئی...... اس کی عمر بمشکل بیں، پچیس سال تھی۔ میں بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھکی، ایک اجنبی جگہ اجنبی ماحول میں اچانک خود کو محسوس کر کے مجھے جانے کیوں ہول آنے لگا۔ یہ غنیمت ہی تھی کہ ایک عورت ذات تو وہاں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی تسلی ہوئی۔

"بب...... بی بی...... جی...... آپ لیٹی رہو آرام سے......" وہ لڑکی میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

میں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور بولی۔ "تت...... تم کون ہو؟...... میں کہاں ہوں، یہ کون سی جگہ ہے......؟"

میری گھبرائی ہوئی ہراساں نظریں اس پر جم سی گئی تھیں۔ وہ جواباً اپنے گہرے سانولے چہرے پر ملائمت طاری کرتے ہوئے میری پائنتی کے نزدیک آ کر ٹک گئی۔ اس کی آنکھیں خاصی کشادہ تھیں۔ جن میں اس وقت مجھے مرعوبیت سی نظر آ رہی تھی۔ ظاہر ہے یہ میری وجہ سے ہی رہی ہو گی۔ بہرطور...... وہ تشفی آمیز لہجے میں بولی۔ "بی بی جی! میں نے کہا ناں آپ گھبرائیں نہیں۔ آ...... آپ...... کو کچھ نہیں ہو گا یہاں کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔"

مجھے پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ میرا پورا ذہن جھنجھنایا ہوا تھا۔ مجھے کچھ یاد بھی نہیں آ رہا تھا۔ پھر میرے خوابیدہ ذہن نے یکلخت ایک شعوری کروٹ بدلی اور پھر مجھے اپنے اوپر بیتا ہوا وہ کٹھور لمحہ یاد آتا چلا گیا کہ واثق علی کے سنگدلانہ رویے سے دل شکستہ ہو کر میں

بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ واثق علی میرا شوہر جس نے میرا سب کچھ چھین کر اور مجھے تہی دست کر کے چھوڑ دیا تھا۔

خود پر بیتی ہوئی عبرتناک کتھا کا ادراک ہوتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جی بھر آیا...... پھر اگلے ہی لمحے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ہائے ڑی گھوڑا...... اماں تو کیوں روتی پڑی ہے۔" مجھے روتا دیکھ کر وہ بیچاری ایک دم پریشان سی ہو گئی اور اچانک اپنے مخصوص لہجے میں بولتی ہوئی میرے قریب گئی۔ وہ شاید میری وضع قطع سے اتنی مرعوب تھی کہ مجھے چھونے سے بھی جھجک رہی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ میں ایک ایسی برباد شدہ عورت تھی۔ جس کے پاس کچھ بھی نہ باقی نہ رہا تھا جبکہ یہ سوچنے میں بھی باک نہ رہا تھا کہ وہ پھر بھی مجھ سے کہیں بہتر تھی۔ اسے یہ چھت تو میسر تھی، کم از کم میرے پاس تو اب وہ بھی نہ رہی تھی۔ ضرور اس کے بچے بھی ہوں گے اور شوہر بھی ہو گا لیکن مجھے پھر بھی ہنوز چبھن ہو رہی تھی کہ میں یہاں آئی کس طرح......؟ بہر طور وہ تھوڑی دیر تک مجھے دلاسا دیتی رہی۔ پھر اتنے میں تین چھوٹے چھوٹے ننگ دھڑنگ میلے کچیلے بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے اور اپنا کھیل بھول کر مجھے گھورنے لگے...... ان کی ننھی منی پھٹی پھٹی آنکھوں میں معصومانہ استعجاب تھا۔

"اے...... رمو...... دلو...... چلو بھاگو یہاں سے......" اس عورت نے انہیں اپنی مخصوص زبان میں ڈپٹ کر یہاں سے بھگایا وہ تینوں غالباً اسی ہمدرد عورت کے بچے دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ ان میں اپنی ماں کی مشابہت موجود تھی۔ تینوں کی عمریں بالترتیب چھ، سات اور آٹھ سال کی تھیں ان میں دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی جو سب سے بڑی تھی۔ وہ اپنی ماں کی ڈانٹ سن کر دوبارہ شور مچاتے ہوئے باہر بھاگ گئے۔ وہ مسکین سی عورت میری جانب متوجہ ہوئی۔ "یہ بچے میرے تھے پر تو گڑتی (فکر) نہ کر یہ تیرے کو پریشان نہیں کریں گے میرا بڑا رعب ہے ان پر......" وہ بھولپن سے بولی۔ اس کی عمر دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔ وہ دوبارہ رسان سے بولی۔ "امڑ جیجی! حوصلہ کر۔ میڈا پیو ہن آن والا ہے۔ تو اسے اپڑیں گھر کا پتہ دے وہ تجھے دوبارہ تیرے بنگلے چھوڑ آئے گا۔" وہ اپنے تئیں اور کسی قدر میری امیرانہ وضع



قطع کا اندازہ کرتے ہوئے بالکل درست سمجھی تھی کہ میرے جیسی عورت کا تعلق کسی اونچے اور بڑے گھر سے ہی ہو سکتا ہے۔ مگر شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ میں بالکل ہی بے اماں ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے رندھے ہوئے لہجے پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تت...... تمہارا نام کیا ہے؟"

"سدھوری ہے جی میرا ناں......" اس نے بتایا۔ "مم...... مجھے یہاں تمہارا شوہر لایا تھا۔"

"نہیں جی...... میرا پیو لایا تھا...... ہماری زبان میں باپ کو پیو کہتے ہیں۔" اس نے مزید بتایا۔ "آمڑ جی جی...... میڈے پیو کو آپ ادھر بنگلوں کے پچھواڑے باغیچے میں پڑی ملی تھیں۔ میڈا پیو پانی کا ٹرک چلاتا ہے جی۔ ادھر کے سارے بنگلوں کو وہ ہی پانی پہنچاتا ہے......" اس نے اپنی بات ختم کی اور میرا سینہ یہ سوچ کر دکھ سے بھر گیا کہ واثق علی نے مجھے کیا اس قدر عضو معطل جان لیا تھا کہ مجھے ایک فالتو شے کی طرح باہر پھینک دیا تھا...... ایک شوہر تو کیا ایک انسان ہونے کے ناتے انہیں کیا یہ زیب دیتا تھا کہ وہ میرے ساتھ اس قدر بیگانوں اور ظالموں والا سلوک کریں گے۔" غرض جتنا واثق علی کے اس سنگدلانہ فعل کے بارے میں سوچتی اتنا ہی میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا...... اب یہ بے چاری غریب سی لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اس کا باپ مجھے واپس میرے بنگلے میں چھوڑ آئے گا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ میری کٹھور تقدیر نے مجھے کیسے پل صراط پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک بار پھر میں اپنے اوپر بیتی ہوئی قیامت کا تصور کر کے رونے ہی والی تھی کہ اچانک باہر سے کسی کے کھانسنے کی آواز ابھری اور سدھوری جلدی سے دروازے کی طرف دیکھ کر بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔ "لو جی میڈا پیو آ گیا۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کمرے کی چوکھٹ پر بوسیدہ سے جھولتے ہوئے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر ایک ساٹھ، پینسٹھ سالہ بوڑھا شخص اندر داخل ہوا اس نے سالخوردہ سی پھٹی ہوئی صدری پہن رکھی تھی اور شلوار کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی رنگت انتہائی کالی تھی۔ وہ خاصی کمزور سی جسامت کا سیدھا سادہ شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مصائب زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے چند ثانیے عجیب سی الجھن آمیز نظروں سے تکتا رہا پھر جب

بولا گرمجوشی کے کپکپاتے لہجے میں حیرت انگیز طور پر لجاجت اور خوف سا عود کر آیا۔

"بی بی جی! ہم لوگ گریب اور کمزور لوگ ہیں آ...... آپ مجھ کو ایک بنگلے کے با روڈ پر بے ہوش پڑی ملی تھی۔ میں اس بنگلے کا ٹینک بھر رہا تھا۔ آپ کو ایسی حالت م دیکھ کر میں گریب گھبرا گیا اور بغیر سوچے سمجھے آپ کو اس بستی میں لے آیا...... مجھے ماپ کر دینا...... میں آپ کو ابھی چھوڑ آتا ہوں آپ کے بنگلے۔"

وہ بے چارہ ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ مجھے یہاں اپنی کٹیا میں لا کر پچھتا رہا ہو۔ لیکن شاید اس نے پھر میرے ستے ہوئے چہرے غمناک کتھا کی تحریر بھی پڑھ لی تھی۔ مگر کچھ بولا نہیں، کہتے کہتے رک گیا تھا۔ تاہم جو میں نے اپنے کپکپاتے لب وا کئے اور بولی۔

"بابا جی! آپ کی بڑی مہربانی...... آپ نے مجھے یہاں لا کر کوئی غلطی نہیں کی بلکہ مجھ دکھیاری پر بہت بڑا احسان کیا...... رہی میرے بنگلے کی بات تو...... بابا جی...... میر سب کچھ چھن چکا ہے۔" یہ بتاتے ہی میرا دل بھر آیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مجھے دوبارہ روتا دیکھ کر سدھوری پھر مجھے دلاسا دینے کی غرض سے میرے قریب آئی۔"نا ادی...... مت رو...... حوصلہ کر...... ہم تیرے جیسے بڑے لوگ تو نہیں پر دل ہمارا وڈا ہے چپ ہو جا۔"

"اسے رونے دے دھیئے! میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا اس چھوکری کے ساتھ کوئی بڑا ظلم ہوا ہے۔" معاً سدھوری کے باپ کے الفاظ میری سسکتی ہوئی سماعتوں میں گونجے۔ میں نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو وہاں مجھے اس بار اپنے لئے ترحم آمیز آثار دکھائی دیئے۔ مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر وہ ذرا چند قدم آگے بڑھا اور پھر میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔"میڈی دھی! تو میری بیٹی جیسی ہے...... شاید تمہارے بنگلے کے ملازم بھی ہم سے بہتر حالت میں رہتے ہوں گے۔ کوشش تو ہماری یہی ہو گی کہ تجھے یہاں کوئی تکلیف نہ ہو...... پر......"

وہ دانستہ چپ ہو رہا۔

میں نے کہا۔"بابا جی! آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے تو تمہارا سایہ بھی میرے لئے بہت ہے۔ میں جانتی ہوں تم لوگ میرا بوجھ نہیں سہ سکتے۔"



"اڑے ناں...... بابا...... دھیئے! ایسا مت آکھ (بول)......" وہ اچانک اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولا۔"تو بھلا ہم پر کیوں بار ہو گی...... ہماری بھلا کیا جرأت کہ ہم کسی کو رزق کھلا سکیں یہ تو صرف اور صرف رب سائیں کی طاقت ہے کہ وہ اپڑیں بندوں کو کسی وسیلے رزق دے اور کیا پتہ...... تیرے وسیلے رب سائی ہمیں بھی تھوڑا رزق نصیب کر دے۔ تو ادھر رہ...... دھڑیں سائیں آگے چنگا کرے گا۔" سدھوری کا باپ اپنے روایتی انداز میں بولا۔ پھر اپنی بیٹی سدھوری کو مخاطب کر کے بولا۔"اڑی...... چل خوش ہو جا تو بھی۔ تیرے کو بہن مل گئی۔ مانی بھی کھلائی ہے اپڑیں ادھی کو...... یا یونہی رلائے جا رہی ہے۔" ایکا ایکی اس کا لہجہ اپنا اپنا سا ہو گیا تھا...... بلکہ اس پورے ماحول میں ایک عجیب قسم کی اجنبیت موقوف ہوتی چلی گئی تھی۔ کسی غریب انسان کی غریب جھونپڑی میں اور مشکل گھڑی کے سمے خلوص کے دو بول بلاشبہ مجھ الم نصیب کے لئے باعث طمانیت ہی تھے۔ ایسا سچا خلوص اور بے لوث انس شاید ہمارے اونچے محلات میں عنقا ہی تھا۔

❁❁❁

معاً عصر کی اذان پر آمنہ بیگم ڈائری پڑھتے پڑھتے چونکی پھر انہوں نے ایک گہری سانس لے کر ڈائری بند کی۔ ماضی کے کھنڈرات میں اپنے الجھے ہوئے دل و دماغ پر قابو پایا۔ اس کے بعد نماز پڑھنے کے لئے وضو کرنے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سعدیہ بھی ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ وہ اس کے لئے ذرا متفکر سی نظر آنے لگیں۔ مگر پھر جیسے ہی وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو سعدیہ بھی آ گئی۔ وہ خاصی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی کے درمیان رسمی سی گفتگو ہوئی۔ پھر سعدیہ منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ جب وہ فریش ہو کر کمرے میں پہنچی تو اس کی ماں کھانا لگا چکی تھی۔

کھانے کے بعد سعدیہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ آج سارا دن کی دوڑ دھوپ کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو اگرچہ نتیجہ خیز نہیں تو کچھ ایسی مایوس کن بھی نہیں رہی تھی۔ مقتول خورشید احمد کے گھر سے برآمد ہونے والے مصنوعی دانت کے سلسلے میں اس نے کمال احمد کے ساتھ شہر کے تقریباً درجن بھر ڈینٹل کلینک کھنگال ڈالے تھے۔ اسی مصنوعی دانت کے بارے میں سعدیہ کو پورا یقین تھا کہ

یہ دانت خورشید احمل کو قتل کرنے والے قاتل کا ہی ہے۔ ڈینٹل سرجنز نے اس مصنو
دانت کے مریض کو کھوجنے کے سلسلے میں پورا پورا تعاون کرتے ہوئے اپنے پاس رکھے
ریکارڈ وغیرہ کھنگال ڈالے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بتایا تھا کہ اس مصنوعی دانت
سے تعلق رکھنے والے کسی سپیشلسٹ نے یہ یہاں اپنی انٹری کروائی اور نہ ہی یہ دانت
ان کی "ڈینٹل لیب" کا تیار کردہ ہے۔ بہر طور سعدیہ پھر بھی مایوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ
ایک ڈاکٹر (ڈینٹل سرجن) نے مصنوعی دانت کا بہ غور معائنہ کرتے ہوئے یہ حوصلہ افزا
بات کہی تھی کہ یہ دانت اتنا زیادہ پرانا بھی نہیں کہ اس کا ریکارڈ تلف کر دیا گیا ہو۔ علاوہ
ازیں اس دانت کے معائنے کے دوران اس بھلے مانس ڈاکٹر نے یہ تک بھی بتا ڈالا تھا
کہ یہ دانت عشرت ڈینٹل کلینک کا بنا ہوا ہے۔ جس کا نام پتہ وغیرہ سعدیہ فوراً ہی لکھ کر
وہاں سے نکلی۔ مگر افسوس کہ وقت اب ان کے پاس نہ رہا تھا لہٰذا کمال نے ہانپتے
ہوئے ہاتھ جوڑ کر سعدیہ سے کہا تھا کہ محترمہ! اب تو کام کافی حد تک سہل ہو چکا ہے
لہٰذا کل پر رہنے دیا جائے۔"

چار و ناچار سعدیہ پھر اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔ وہ مصنوعی دانت ہنوز اس کے پرس
میں محفوظ تھا۔ اسے اب پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس دانت کے ذریعے اصل قاتل
تک جا پہنچے گی اور نہ صرف یہ بلکہ اسے کٹہرے میں بھی گھسیٹنے میں دیر نہیں کرے گی اور
پھانسی کا پھندا اس سفاک قاتل کا مقدر بنے گا۔ لہٰذا سعدیہ اب جلد از جلد اصل قاتل
تک پہنچنا چاہتی تھی کیونکہ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں اس عرصے میں پولیس داد محمد
عرف دادو کی طرح کسی اور بے گناہ کو مرغا بنا کر عدالت میں چالان نہ پیش کر دے۔

اگلے دن سعدیہ اور کمال احمد اپنی کار میں سوار ہو کر عشرت ڈینٹل کلینک پہنچے۔
اتفاق سے مریضوں کا رش کم تھا...... لہٰذا کلینک اٹینڈنٹ نے انہیں ذرا دیر شیشوں کی
دیواروں والی انتظار گاہ میں بٹھانے کے بعد ڈاکٹر کے چیمبر میں جانے کی اجازت دی۔
اندر ایک بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر ڈاکٹر عشرت براجمان تھے۔ جن کی آنکھوں میں
سیاہ فریم والا چشمہ چڑھا ہوا تھا ان کی عمر چالیس سے کسی طور متجاوز ہی رہی تھی...... ان
کی بائیں جانب ایک بڑا سا کمپیوٹرائزڈ ڈینٹل یونٹ نصب تھا جو درحقیقت ڈینٹل چیئر
ہی کہلاتی تھی۔ رسمی تعارف و گفتگو کے بعد ڈاکٹر عشرت نے ان سے پورا تعاون کیا اور



سعدیہ سے مصنوعی دانت لے کر بہ غور دیکھنے لگے۔ پھر ذرا دیر بعد ہی ان کے بردبار
چہرے نے تفہیمی جنبش لی۔ گویا انہیں یہ تسلیم تھا کہ مذکورہ دانت انہی کی دست مشاقی کا
نتیجہ تھا۔ تاہم وہ سر دست یہ بتانے سے قاصر تھے کہ یہ دانت ان کے کون سے مریض
کا تھا۔" لیکن اس پر بھی انہوں نے مکمل آمادۂ تعاون ہوتے ہوئے یہ پیش رفت کی کہ
وہاں موجود ایک میل ڈینٹل ٹیکنیشن سے کچھ پرانے مریضوں کا ریکارڈ نکالنے کو کہا۔
بالآخر ذرا دیر کی عرق ریزی کے بعد انہوں نے ایک مصنوعی بتیسی کا نمونہ سعدیہ اور کمال
کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ یہ غالباً پلاسٹر آف پیرس سے بنا پورے اندرونی جبڑے کا
نمونہ تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عشرت نے سعدیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"محترمہ وکیل صاحبہ! یہ دانت میرے ہی کلینک کا تیار کردہ ہے اور پرویز نامی یہ شخص
آج سے لگ بھگ چار ماہ قبل میرے پاس آیا تھا۔ یہ نیا دانت جو آپ نے برآمد کیا
ہے بلاشبہ اسی شخص کا ہے۔" انہوں نے جیسے انکشاف کیا۔ سعدیہ کا چہرہ، ڈاکٹر عشرت
کی بات پر جوش کامیابی سے تمتمانے لگا۔ وہ تصور ہی تصور میں پرویز نامی متوقع قاتل
کے گلے میں پھانسی کا پھندا دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر عشرت نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر پرویز نامی مریض کا مکمل نام و پتہ اپنے
ریکارڈ سے اتار کر سعدیہ کی جانب بڑھا دیا۔ سعدیہ فوراً وہ کاغذ لے کر اس پر تحریر کردہ
پتے کو چند ثانیے ذہن نشین کرتی رہی، پھر ممنون نظروں سے ڈاکٹر عشرت کی جانب
دیکھتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کی بہت مہربانی کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت
سے تھوڑا وقت ہمیں دیا۔ یوں سمجھئے آپ نے ایک بے گناہ کو نہ صرف پھانسی کے
پھندے سے بچا لیا بلکہ معاشرے کو ایک جلاد صفت شخص سے بھی پاک کرنے کی خاطر
قانون کا پورا پورا ساتھ دیا لیکن ڈاکٹر صاحب ایک زحمت انتہائی معذرت کے ساتھ اور
آپ کو دوں گی...... وہ یہ کہ آپ اپنے جن پیشنٹس (مریضوں) کے جبڑوں کا نمونہ آئی
مین...... اسپیسی مین لیتے ہیں...... کیا محض اس نمونے سے ہم ایک مجرم کی شناخت کر
سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو کس طرح؟"

سعدیہ کی بات سن کر ڈاکٹر عشرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی رقصاں ہو گئی۔ غالباً
وہ بھی ذرا ایڈونچر واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے گویا مزے لیتے ہوئے

کہنا شروع کیا۔

''محترمہ وکیل صاحبہ! سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس میں آپ کو معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ مزید یہ کہ میں جانتا ہوں آپ کو یہ بات جرح کے دوران کورٹ میں ثابت کرنا پڑے گی کہ آپ نے محض مجرم کے مصنوعی دانت کے ذریعے کس طرح اس کی شناخت کی...... لہٰذا محترمہ...... اس ضمن میں آپ کو سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ جس طرح ہر انسان کے فنگر پرنٹس ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے، بالکل اسی طرح دانتوں کی تراش خراش اور بناوٹ بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی مصنوعی بتیسی اٹھا کر سعدیہ اور کمال کی پر اشتیاق نظروں کے سامنے کرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''یہ مصنوعی بتیسی جو آپ دیکھ رہے ہیں...... یوں سمجھیں یہ آپ کے مطلوبہ مجرم پرویز کا پورا دہانہ (منہ) ہے۔ اس نکتے کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لئے میرا خیال ہے کہ اس کے پورے ڈایا گرام کی ضرورت محسوس ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر عشرت نے بتیسی میز پر دوبارہ رکھی۔ پھر وہ ایک بڑے سے بغیر لائنوں والے سادہ کاغذ پر مصنوعی بتیسی کا ڈایا گرام بنانے لگے۔ سعدیہ متاثر کن اور پر شوق نگاہوں سے ڈاکٹر عشرت کو کاغذ پر لکیریں کھینچتے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہی تھی، کمال کا بھی یہی حال تھا۔ ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر عشرت نے مصنوعی بتیسی والا ڈایا گرام ان کے قریب سرکا دیا۔

ڈاکٹر عشرت نے سمجھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ سعدیہ انہماک سے سننے لگی۔ ''یہ آپ کے مطلوبہ مجرم پرویز کے پورے بتیس دانتوں کا خاکہ ہے۔ اس میں نمبر "3" پر جولیبسلنگ میں نے کی ہے...... یہ وہ دانت کا حصہ ہے، جس پر میں نے مصنوعی دانت کا خول چڑھایا ہے، یہ ایک مخصوص میٹریل پورسلین سے تیار ہوتا ہے اور جائے وقوعہ پر آپ نے مصنوعی دانت برآمد کیا ہے وہ اسی جگہ سے نکلا ہے۔'' ڈاکٹر عشرت نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولے۔ ''اب رہی بات یہ کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ دانت پرویز نامی مجرم کا ہی ہے جس نے بقول آپ کے خورشید احمد کا قتل کیا......'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر عشرت نے سامنے رکھی بتیسی کا اسپیسی مین (نمونہ) اٹھایا اور بولے۔ ''جیسا کہ میں



نے پہلے بتایا کہ یہ بتیسی پرویز کے پورے اندرونی دہانے کا نمونہ لے کر بنائی گئی ہے۔ جس کا میرے پاس تحریری ریکارڈ موجود ہے۔ پرویز نامی اس شخص نے نمبر "8" یعنی عقل داڑھ میں کسی دوسرے ڈینٹل سرجن سے چاندی کی بھرائی کروائی ہوئی ہے۔ جبکہ "5" نمبر کا دانت غائب ہے لہٰذا ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر پرویز نامی شخص کے پورے دانتوں کا معائنہ کریں گی تو اس میں یہ سب نشانیاں موجود ہوں گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ نمونہ مذکورہ شخص کے اندرونی جبڑے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے۔'' بالآخر ڈاکٹر عشرت نے اپنی صراحت بھری اور کارآمد گفتگو کو اختتام تک پہنچایا۔ سعدیہ لمحہ بھر پر سوچ انداز میں خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! ونس اگین تھینکس...... کیا یہ ڈایا گرام اور بتیسی کا نمونہ میں رکھ سکتی ہوں۔''

''آف کورس......'' ڈاکٹر عشرت جلدی سے بولے۔ ''یہ تو میں نے آپ ہی کی سہولت کے لئے ہی ترتیب دیا ہے۔ اسے آپ بے شک لے جا سکتی ہیں بلکہ اگر کورٹ میں میری ضرورت پڑی تو بلاتاخیر حاضر ہونے کے لئے تیار رہوں گا۔''

''لاٹ آف تھینکس ڈاکٹر صاحب! بلکہ بنڈل آف تھینکس۔'' کمال نے اپنے مخصوص لہجے میں خوشدلی سے کہا اور پھر سعدیہ نے بھی ممنون بھری نگاہوں سے ڈاکٹر عشرت کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہماری مشکل آسان کر دی۔''

''اٹس اوکے اینڈ یور آلسو ویلکم اینی ٹائم۔'' جواباً ڈاکٹر عشرت نے گرم جوشی سے انہیں رخصت کیا۔

پھر کمال اور سعدیہ کلینک سے باہر آگئے اور قریب کھڑی اپنی کار میں آبیٹھے۔

''بھئی واہ...... اپنے یہ ڈاکٹر صاحب تو بڑے بن مانس...... آئی مین...... بھلے مانس آدمی نکلے۔ ہی از ویری کوآپریٹو......'' کمال ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے اور اگنیشن سوئچ آن کرتے ہوئے بولا۔

''یقیناً...... ہماری توقعات سے بھی بڑھ کر۔ ورنہ لوگ کہاں ان جھمیلوں میں پڑتے ہیں وہ بھی ڈاکٹر حضرات۔'' جواباً سعدیہ نے کہا۔ ''ویسے خیر یہ بات بھی نہیں...... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔''

پہلی مرتبہ تمہارے منہ سے معقولیت کے پھول جھڑے ہیں۔" سعدیہ بھی آج خوشگوار موڈ میں تھی۔ کیونکہ آج کی حوصلہ افزاء پیش رفت نے اس کے تھکے ہوئے ذہن اور اعصاب پر اچھا اثر ڈالا تھا۔

"محترمہ! اب ذرا تصحیح فرمادیں کہ یہ معقولیت کے پھول کیا ہوتے ہیں تاکہ میں گاڑی سروس روڈ سے باہر نکال سکوں۔" کمال نے فوراً اپنی پٹڑی بدلتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتی تھی ایسا کرنے سے ایک لمبی چوڑی اور بے فائدہ بحث شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا سعدیہ کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار آتے ہی کمال نے بھی خاموشی سے کار آگے بڑھا دی۔

"اب کہاں جانا ہے؟ کدھر گاڑی موڑوں۔" بالآخر کمال نے پوچھا۔ "کورنگی کراسنگ...... بھٹائی کالونی...... سیکٹر نمبر......" سعدیہ نے جواباً پرویز نامی شخص کا پورا پتہ زیر لب دہرا دیا۔ جو ڈاکٹر عشرت کے توسط سے حاصل ہوا تھا اور کمال نے اثبات میں اپنا سر ہلا کر کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔

❁❁❁

سرکنڈوں اور گارے مٹی سے بنے اس جھونپڑ نما گھر میں جیسے آج معصوم سی رونقیں اتر آئی تھیں...... جبکہ پہلے یہاں کھنڈروں کی ویران سرسراہٹیں کوڑیالے ناگ کی طرح رینگتی رہتی تھیں۔ مگر آج یہی در و دیوار باہم خوش کن سرگوشیوں میں مگن تھے۔ آج کافی عرصے بعد زمیندار اختیار علی کی نجی قید سے آزاد ہونے کے بعد دونوں بوڑھے میاں بیوی حضور بخش اور مخمل کو اپنے گھر کی آزاد فضا نصیب ہوئی تھی۔ وہ بیچارے کافی عرصے بعد اپنے گھر آئے تھے اور ایک ایک چپے سے جیسے حظ اٹھا رہے تھے۔ اپنے جھریوں بھرے نحیف کپکپاتے ہاتھ پھیر پھیر کر خوش ہو رہے تھے۔ انہیں اب دکھائی بھی کم دینے لگا تھا...... لیکن اپنے گھر کی مانوس فضا کو اپنی مرتعش سانسوں کی ڈور سے نتھی ضرور کر رہے تھے۔ ماما وسایا بھی بہن، بہنوئی کے آنے سے خوش ہو گیا تھا۔ گویا اسے اب گڑگڑی جمانے اور کچہری سجانے کے لئے ایک ساتھی مل گیا تھا جبکہ دادو کو یوں لگتا تھا جیسے اس کے گھر کی قبر جیسی ویرانی اب رخصت ہو چلی ہو وہ بھی بہت خوش اور اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا...... لیکن جانے کیا بات تھی اس کے چہرے سے پھوٹنی



پڑنے والی مسرتوں کی لکیروں کے بیچ کہیں کہیں ایک لخت سا الجھاؤ بھی نظر آنے لگتا تھا۔ جو اس کے اندر کہیں دور پلنے والی ایک بے نام سی کسک اور اندیشوں کی غمازی کر رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت دروں...... ماما وسایا کی بھی تھی اور شاید اس لئے کہ وہ ان ہنسی خوشی کے جلوؤں میں بے نام سے تاثرات لئے خوش باش نظر آنے والے اپنے معصوم بھانجے دادو کے خوش فہم بشرے سے ان بھیانک اندیشوں کا بجھا بجھا پن محسوس کر چکا تھا۔

"ڑے...... دادو...... کیا تجھے زمیندار سائیں نے بلایا ہے اپنی اوطاق میں......؟"

دادو نے چونک کر ماما وسایا کی طرف دیکھا۔ وہ شاید ماما وسایا کی گرگ باراں دیدگی پر دنگ رہ گیا تھا اور اب وہ یوں حیرت سے ماما کا منہ تکنے لگا جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ ماما سائیں! تجھے کیسے پتہ چلا کہ زمیندار اختیار علی نے مجھے بلایا ہے۔"

ماما وسایا نے بھانجے کی لوح دروں پر لکھی اس مستفسرانہ تحریر کو پڑھ لیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جواب سنے بغیر چپ ہو رہا تھا...... مگر اتنا ضرور ہوا جب اگلے دن دادو ماما وسایا سے نظریں چراتا ہوا باہر جانے لگا تو اسے اپنی کھٹکتی سماعتوں میں ماما وسایا کی سرگوشی نما نصیحت آمیز آواز سنائی دی۔ "پٹ! زمیندار اختیارے کی بات پر ذرا سوچ سمجھ کر عمل کرنا، ہن جا تو۔"

دادو کے اندر جیسے سرسراہٹ سی ہوئی۔ جانے کیوں اسے آج اپنا ماما ایک ایسا صوفی قلندر لگا جو چہروں کے مدوجزر سے انسان کی آئندہ کی کارگزاری بھانپ لیتا ہو۔ دادو سے پھر ایک لحہ بھی وہاں کھڑا ہوا نہ جا سکا اور وہ یک دم گھر سے نکل آیا۔

فضا میں چہار سو نرم نرم سی ہوا سرسرا رہی تھی۔ موسم خوشگوار بالکل صاف تھا...... اوپر نیلگوں آسمان پر کہیں کہیں پرندوں کی جاں مست ڈاریں تلاش آب و دانہ کے لئے محو پرواز، بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ دادو کچے اور نیم پختہ مکانوں کی بے ترتیب قطاروں کے درمیان بنے ٹیڑھے میڑھے گرد آلود راستوں پر چلتا ہوا، زمیندار اختیار علی کی اوطاق پہنچا...... لیکن وہاں پہنچتے ہی وہ حیران رہ گیا کہ زمیندار سائیں اور اس کا کمدار مولا بخش بڑی بے چینی سے اسی کے منتظر تھے دوسری بڑی حیرت اسے اس وقت ہوئی جب زمیندار اختیار علی نے خود اپنی آرام کرسی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھ کر

بڑے پرتپاک انداز میں استقبال کیا۔ "اڑے بابا چھورا! مجھے امید تھی تو ضرور آوے گا۔ آ بیٹھ ہتھے۔" زمیندار نے داوو کی طرف چمکتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی کھرکھراتی آواز میں اسے قریب پڑی منقش پایوں والی رلی بچھی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اوطاق میں آج داوو کو غیر معمولی سناٹا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ معاً پھر اسے اپنی سماعت سے زمیندار اختیار علی کی آواز ٹکرائی۔ "اڑے بابا داوو! مجھے اپڑیں رہاکوں (مزارعوں) کا بڑا خیال رہتا ہے اور مجھ سے جتنا ہو سکتا ہے میں مقدور بھر ان کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں۔ پھر کیا ہے کہ ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یوں سمجھو ایک ہاتھی کو روزانہ جس طرح ایک من گنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر وہ نہ ملے تو وہ پاگل ہونے لگتا ہے۔ بالکل یہی بات ہم پر بھی صادق آتی ہے۔ بابا! مانا تمہارے پیو حضور بخش نے مجھ سے کچھ روپیہ قرض لیا۔ مگر وہ لوٹا نہ سکا اور میں نے ان سے بیگار لی ......دیکھو میں کوئی اتنا بڑا وڈیرا بھی نہیں ہوں کہ......"

"سائیں بھوتار معاف کرنا ہم کمی لوگ ہیں......آپ یہ باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو...... جو کہنا ہے سیدھے سیدھے کہہ دو۔ میں حاضر ہوں۔" معاً داوو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے زمیندار سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور زمیندار اختیار علی ایک طویل ہنکاری بھرتے ہوئے داوو کے چہرے کو گھورنے لگا۔ جیسے اس کے اندر سے کچھ اخذ کرنا چاہ رہا ہو۔ ادھر داوو بھی اس کے انداز تخاطب پر معصومانہ حیرت میں مبتلا تھا کہ آخر اس کا وڈا سائیں کیسی باتیں کر رہا ہے۔

کمدار مولا بخش جو کافی دیر سے چپ بیٹھا تھا۔ فوراً زمیندار سے بولا۔ "سائیں وڈا! داوو صحیح بولتا ہے۔ اسے آپ سیدھے سیدھے بتا دو کہ اس نے آپ کا کون سا کام کرنا ہے۔ یہ انکار نہیں کرے گا۔" چالاک اور موقع شناس کمدار نے اپنے سائیں وڈے کی خوشامد اور داوو کو اس کا کوئی اہم خفیہ کام سرانجام دینے کے سلسلے میں ترغیب دی۔

"ہاؤ سائیں! میں حاضر ہوں۔ آپ کا تو مجھ پر یہی احسان کیا کم ہے کہ آپ نے میرے ماں پیو کو چھوڑ دیا۔" داوو ترغیب پاتے ہی چالاک مولا بخش کی بات کی تائید میں بولا تو زمیندار اختیار علی کی باریک مونچھوں تلے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سی پھیل گئی۔



اس نے ایک لمحے کو قریب کھڑے اپنے چمچے مولا بخش کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اس کی توصیف کر رہا ہو۔ جواباً کمدار مولا بخش نے بھی اپنے سر کو مسکراتے ہوئے ہلکی سی جنبش دی۔ پھر زمیندار اختیار علی کہیں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور داوو کو مخاطب کر کے بولا۔ "آؤ چھورا میرے ساتھ...... کمدار! تو بھی......" پھر وہ باہر نکل گیا۔

داوو اور مولا بخش اس کے عقب میں ہو لیے۔ باہر پرانے ماڈل کی بغیر ہڈ کی جیپ کھڑی تھی وہاں دو اور رائفل بردار افراد جیپ کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کی بل دار مونچھوں اور سرخ آنکھوں والے بشرے پر شکرے ایسی چمک اور وحشت سی کھنڈی ہوئی تھی۔ انہوں نے لمبی قمیضوں اور کھلے پائنچوں والی شلواریں زیب تن کر رکھی تھیں جبکہ سرخ اجرکوں کو پگڑ بنا کر سر پر باندھ رکھا تھا۔ داوو کے چہرے سے عجیب کیفیات مترشح ہونے لگی تھیں تاہم وہ چپ ہو رہا...... پھر وہ سب لوگ جیپ میں سوار ہو گئے۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی وہ اب درمیانی رفتار سے ناہموار اور کچے راستوں پر دھیمے دھیمے ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ میں سوار سب افراد کے بشروں پر سپاٹ خاموشی تھی۔

جیپ کا رخ گوٹھ کی جنوبی طرف تھا۔ پھر جب خودرو جھاڑیوں والا میدان شروع ہوا تو جیپ نے دائیں جانب موڑ کاٹا۔ یہاں اونچے نیچے جبل بھٹ سے بنے ہوئے تھے۔ سامنے دور تک کیکر اور سرکنڈوں کا مختصر سا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ معاً جیپ ایک شکستہ سی عمارت کے قریب آ کر جھٹکے سے رک گئی۔ عمارت کے گرد خاردار تار کی کوئی پانچ پانچ فٹ باڑھ لگائی گئی تھی۔ بادی النظر میں یہ عمارت گھوڑوں کے اصطبل کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کیونکہ سامنے کئی اصیل گھوڑے بندھے ہوئے تھے...... جن کے منہ پر توبڑے بھی نظر آ رہے تھے۔ چند ایک دبلے پتلے سائیں گھوڑوں پر کھریرے رگڑ رہے تھے۔ شکستہ عمارت میں سامنے کے رخ پر ایک بڑا سا چوبی دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری جانب گارے مٹی سے بنی ڈھلواں اور چھپر سائبانوں والی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ گویا یہ جگہ بیک وقت اصطبل اور فارم کی غمازی کر رہی تھی۔ یہ سب لوگ جیپ سے اتر آئے۔ فارم پر موجود اپنے اپنے کاموں میں مشغول چند افراد ان کی جانب متوجہ ہوئے اور پھر زمیندار اختیار علی پر نظر پڑتے ہی وہ سب مشینی انداز میں اپنے کام

چھوڑ چھاڑ کر جیپ کی طرف بڑھے۔ "بسم اللہ سائیں وڈا! بسم اللہ....." انہوں نے جیپ کے پاس پہنچتے ہی مؤدبانہ انداز میں اپنے ہاتھ جوڑ کر مخصوص لہجے میں زمیندار اختیار علی کو سلام کیا۔ زمیندار نے محض سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

پھر سب جیپ سے اتر آئے۔ رائفل بردار جیپ کے پاس ہی موجود رہے جبکہ اختیار علی اور کمدار مولا بخش اور دادو کو لئے عمارت کے دروازے سے اندر آئے۔ اب وہ ایک کیبن نما چھوٹے سے کمرے میں کھڑے تھے..... سامنے ایک نسبتاً بڑا اور وسطی دروازہ تھا۔ یہاں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر دبلا سا شخص اپنی پتلی پتلی ٹانگیں سکیڑے موالیوں کے سے انداز میں بیڑی پی رہا تھا۔ زمیندار پر نظر پڑتے ہی اسے جیسے کرنٹ لگ گیا اور وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "س س..... سائیں وڈا..... سلام ہووے....."

"اڑے پھتو..... درکھول....." اختیار علی نے نخوت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ پھتو نامی اس شخص نے فوراً اپنی بوسیدہ سی کرسی کی کسی اندرونی جیب سے چابیوں کا ایک بے ہنگم سا گچھا نکالا اور پھر آگے بڑھ کر وسطی دروازے پر لگے ہوئے بڑے سے تالے میں ایک چابی ٹٹول کر نکالتے ہوئے گھمانے لگا۔ اگلے ہی لمحے تالا کھل گیا..... پھتو تالا کھول کر جب کنڈا کھولنے لگا تو زمیندار اختیار علی اسے روکتے ہوئے خشونت سے بولا۔ "اڑے موالی! چابی مجھے دے اور سیدھا اوطارے میں پہنچ..... تیرا اب کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

زمیندار کی بات پر پھتو کے چہرے پر کئی خدشات بھرے رنگ آ کر گزر گئے اور وہ ہونقوں کی طرح ان تینوں کا منہ تکنے لگا۔ اس اثناء میں کمدار نے اپنے نمبر بڑھانا ضروری سمجھا۔ وہ ذرا ڈپٹ کر پھتو سے بولا۔ "اڑے..... اب جا یہاں کھڑا چریوں کی طرح منہ کیا تکے جا رہا ہے۔ ٹل ونج..... ونج....."

پھتو بے چارہ کمدار مولا بخش کی گھڑکی سن کر ایک لمحہ بھی وہاں نہ ٹھہرا اور بیسیوں سلام کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

دادو یہ سب حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا اور چپ تھا۔ اثنائے راہ کمدار مولا بخش نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں سے یہ سب لوگ اندر آ گئے۔ یہاں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا..... فقط ایک ذرا بلندی پر بنے چھوٹے سے سلاخ دار روزن سے ناکافی



روشنی اندر آ رہی تھی۔ پھر شاید کمدار نے کوئی سوئچ ٹٹول کر بلب جلا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ مگر یہ کمرہ کب تھا۔ یہ تو پورا بڑا ہال تھا..... لیکن روشنی ہوتے ہی دادو بری طرح ٹھٹکا تھا۔ اکھڑے ہوئے پلستر والی دیواروں پر نصب آہنی زنجیروں سے لگ بھگ کوئی بیس پچیس افراد قیدیوں کی صورت جکڑے ہوئے تھے۔ ان کمزور انسانوں کو دیکھ کر دادو کو ایک زوردار ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں ان کی ہیئت کذائی کا اندازہ کر کے پہچان چکا تھا کہ یہ بے چارے غریب اور معصوم لوگ کون تھے اور یہاں کیوں مقید تھے۔ مگر اسے حیرت آمیز پریشانی اس امر پہ ہو رہی تھی..... آخر اسے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ کیا زمیندار اور کمدار مولا بخش اسے بھی یہاں قید کرنا چاہتے تھے؟ اس نے جب زمیندار اختیار علی اور کمدار مولا بخش کی سمت دیکھا تو اسے اپنے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ زمیندار اور کمدار کے مکروہ چہروں پر بلا کی سنسنی خیز مسکراہٹ طاری تھی اور وہ دونوں خوفزدہ اور پریشان کھڑے دادو کی طرف چمکتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

❁❁❁

خورشید احمد کے قتل کیس کا تفتیشی افسر انسپکٹر فیاض اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ اس کے پرسوچ بشرے سے گہری پریشانی سی مترشح تھی۔ خورشید قتل کیس کے سلسلے میں اسے دانتوں پسینہ آ چکا تھا۔ کیونکہ ابھی تک وہ عدالت میں نیا چالان پیش نہیں کر سکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں وکیل سعدیہ کو بھی کوسے جا رہا تھا۔ جس نے اس کا اچھا بھلا "کام" بگاڑ دیا تھا۔ ورنہ تو وہ دادو کو پوری طرح پھانس چکا تھا اور اس کیس سے اس کی جان بھی چھوٹنے والی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس کی سہل پسندی کی وجہ سے ایک غریب معصوم اور بے گناہ شخص بھلے پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔ اسے اس کی مطلق پرواہ نہ تھی۔

وکیل صفائی سعدیہ سعید کی بروقت مداخلت نے کیس کا رخ ہی موڑ دیا تھا اور دادو کی نہ صرف ضمانت ہو چکی تھی بلکہ جج نے بھی سختی سے انسپکٹر فیاض کو جلد عدالت میں نیا چالان پیش کرنے کی ہدایت کی تھی۔ لیکن اصل پریشانی اسے کسی اور ہی بات کی تھی۔ پھر اچانک میز پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انسپکٹر فیاض یکدم جیسے اپنے پریشان کن

خیالات سے چونکا اور یوں ریسیور جھپٹ کر اٹھایا جیسے عین وقت پر اس کے نجات دہندہ کا فون آ گیا ہو......اور ہوا بھی یہی کیونکہ ریسیور کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہنے کے ساتھ ہی دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز سنتے ہی وہ تن کر بیٹھ گیا۔

''انسپکٹر فیاض! آخر کیس کو اتنا طول کیوں دے رکھا ہے۔ تمہاری تفتیش کو کیا بریک لگ گئے ہیں۔'' دوسری طرف سے بارعب اور خاصی حد تک برہم آواز ابھری۔

انسپکٹر فیاض کا لہجہ فوراً مؤدبانہ سا ہو گیا وہ جواباً بولا۔ ''جناب میں تفتیش میں مصروف ہوں، جلدی ہی......''

''یہ بہلاوے اب بہت ہو گئے انسپکٹر......!'' دوسری جانب سے وہی بھاری آواز ابھری۔ لہجہ خاصی حد تک تحکمانہ تھا۔ ''تفتیش تم نے کیا کرنی ہے بس جلد از جلد کسی اور کو مرغا بنا کر عدالت میں نیا چالان پیش کر دیا پھر یہ خورشید احمد قتل کیس کو ہی داخل دفتر کر دو۔''

''جناب یہی تو میں آپ کو بتانے والا ہوں کہ خورشید احمد قتل کیس کے سلسلے میں مجھے نہ صرف ہٹا دیا گیا ہے بلکہ میرا ڈسٹرکٹ آؤٹ تبادلہ بھی ہو چکا ہے اور جسے نیا تفتیشی افسر مقرر کیا گیا ہے وہ کوئی دم کو یہاں پہنچنے والا ہے۔ پھر میں اسے چارج ہینڈ اوور......''

''شٹ اپ......! میں نے تمہاری یہ فضول تقریر سننے کے لئے تمہیں فون نہیں کیا ہے۔'' دوسری جانب سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کسی نے ڈانٹ لگائی۔ ''ہم نے تمہیں اسی لئے ہڈیاں دے کر پالا تھا کہ تم حرام خوری کرو۔ تم سے اب تک اتنا ہی نہیں ہو سکا کہ دادو کو پھانسی پر چڑھا دیتے۔ تم سے تو اچھی وہ کل کی چھوکری وکیل سعدیہ رہی جس نے کتنی صفائی سے اسے بچا لیا اور تم......'' دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔ بولنے والے نے غالباً اپنی آواز یا گفتگو میں برہمی کا تاثر دینے کے لئے جملہ دانستہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا......لیکن اس بار انسپکٹر فیاض کو اس کے لہجے نے تاؤ سا دلا دیا۔ مگر پھر بھی وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے جب بولا تو اپنے لہجے کی کاٹ کو نہ چھپا سکا تھا۔ وہ مخاطب کا پورا نام لیتے ہوئے بولا۔ ''دیکھئے جناب واثق علی صاحب! مجھ سے جو ہو سکا اب تک وہ میں نے کر دکھایا......اپنے طور پر میں نے دادو کے خلاف قتل عمد کا مضبوط



کیس بنایا تھا اور الزام بھی ثابت ہونے والا تھا۔ اس سے آگے آپ کے وکیل استغاثہ کا کام تھا کہ وہ عدالت میں اپنی دلیلوں سے دادو پر قتل عمد ثابت کر کے دکھاتا۔ میرا کام یہاں تک ختم ہو چکا تھا۔'' انسپکٹر فیاض نے اپنی بات ختم کی۔ اس کی سانس کافی پھول گئی تھی۔ لہجے کی تلخی اب اس کے چہرے سے ہویدا ہو رہی تھی۔ چند ثانیے دوسری طرف سے خاموشی طاری رہی۔ پھر شاید کسی نے جھنجھلا کر غصے سے بڑبڑاتے ہوئے فون کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے لائن منقطع ہو گئی تھی۔ انسپکٹر فیاض نے بھی منہ بسورتے ہوئے ریسیور واپس رکھ دیا۔ تاہم اسے اس بات کا قلق ضرور تھا کہ دادو کو خورشید احمد قتل کیس کے سلسلے میں پھنسوانے کے لئے واثق علی نے ایک بڑی رقم بہ طور رشوت دینے کا وعدہ کیا تھا وہ اب پورا ہونا ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔

❁❁❁

گرمیوں کی تمتمیں طلوع ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ آمنہ بیگم آج دوپہر سے پہلے گھر کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر نہا دھو کر اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھ چکی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں فیروزی رنگ کی ڈائری نظر آ رہی تھی۔ یہ ان کا وہ اعتراف نامہ تھا جس کا وہ تقریباً روز ہی مطالعہ کرتی تھی۔ اگرچہ ایسا کرنے سے اسے اپنے سینے کے کھنڈر میں زخمی یادوں کی چوٹ سی گونجتی تھی۔ لیکن انہیں یہ بھی تسلیم تھا کہ وہ یہ سب پڑھنے پر مجبور ہیں۔ بہر طور چند ثانیے کے بعد وہ ڈائری کے صفحات الٹنے لگیں۔

''زندگی اپنی تلخ حقیقتوں اور کربنا کیوں کے ساتھ مجھ پر رفتہ رفتہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ پھونس اور سرکنڈوں سے بنے اس بوسیدے سے تنگ جھونپڑی نما گھر میں چاروں پہر ہی وحشت انگیز تاریکی سی چھائی رہتی تھی۔ اگر مجھے اس جگہ سدھوری جیسی معصوم اور ہمدرد اور مونس لڑکی کا خلوص اور اس کے بوڑھے باپ موگو کی شفقت نہ ملتی تو کب کی میں یہاں دم توڑ چکی ہوتی۔ مجھے پتہ چلا کہ خلوص کی چاشنی کس قدر آب حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ بہر طور زندگی چاہے جیسی بھی ہو اس کی صلیب اب اپنے کاندھوں پر اٹھائے میں نے گزارنی تو تھی ہی۔ باوجود ان سب باتوں کہ میرے اندر اپنے سابق شوہر واثق علی کے خلاف کبھی کبھی اس قدر شدت کے ساتھ نفرت کا لاوا بہنے لگتا تھا کہ میرا پورا وجود آتش فشاں بن جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس وقت واثق علی کے روبرو جا کر اس کا منہ نوچ ڈالوں اور اس کا گلا دبوچ لوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ واثق میرے ساتھ اس طرح بھی کر سکتا ہے۔ مجھے یوں بے اماں کر کے لاوارثوں کی طرح سڑک پر پھنکوا سکتا ہے۔ لیکن پھر میں یہ سوچ کر اپنے کڑھتے ہوئے دل کو تسلی دینے کی سعی کرتے ہوئے سوچتی کہ اس میں سارا قصور تو میرا ہی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ...... یعنی واثق سے شادی کرنے کے فیصلے پر اتنی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا



چاہئے تھا اور نہ صرف یہ بلکہ ڈیڈی کی اس بات پر اچھی طرح چاہت کی عینک اتار کر غور کرنا چاہئے تھا کہ آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ ڈیڈی کو واثق علی بالکل پسند نہیں تھا حالانکہ واثق کے پاپا سیٹھ عثمان ان کے بزنس پارٹنر تھے۔ لیکن میں ہی کج فہم تھی جو واثق کی جھوٹی اور خود غرض محبت میں اس قدر اندھی ہو چکی تھی کہ ڈیڈی کی مرضی کے خلاف واثق علی سے شادی کر بیٹھی اور آج یہ ڈیڈی کی نافرمانی اور حکم عدولی کی سزا ہی تو تھی جو آج تقدیر نے مجھے عرش سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا تھا۔ ''اچھا ہوا۔'' میں کڑھ کر سوچتی۔ ''میں ایسی ہی سزا کی مستحق ہوں مجھ جیسی نافرمان اولاد کے ساتھ یہی ہونا چاہئے۔ جب اس طرح کی مثبت سوچ آتی تھی تو مجھے ایک عجیب سے تقویت ملتی تھی۔ تقدیر سے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنے اندر کے مایوس کن اندھیاروں میں حوصلے اور ہمت کی ایک نئی کرن سی پھوٹتی محسوس ہونے لگتی اور دل میں یہ عزم راسخ ہونے لگتا تھا کہ آخر ایک نہ ایک دن واثق علی جیسے سنگدل انسان سے اپنا حق لے کر ہی رہوں گی۔ مگر پھر جب اپنی موجودہ ہیئت کذائی پر نظر ڈالتی تو میرا عزم بکھرنے سا لگتا۔ بس پھر یہی وہ سے ہوتا جب میری آنکھوں میں بے بسی کے آنسو اُمڈ آتے مگر آفرین ہے کہ ایسے میں بیچاری غریب سدھوری مجھے سہارنے لگتی اور میری دلجوئی کرتے ہوئے کہتی۔ ''نہ ساہڑی (سہیلی)! روتی کیوں ہے تو۔ اللہ سائیں تیرا اچھا کرے گا۔ حوصلہ رکھ۔ پتہ ہے ادی اللہ سائیں اپنے اچھے بندوں کو ہی آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ تو گھبرا نہ۔''

وہ بیچاری مجھے اپنے گلے لگا لیتی۔ مگر پھر اچانک اپنے دل میں یہ سوچ کر ہم دونوں کے درمیان جو طبقاتی تفاوت تھا اس کے تحت کہیں مجھے اس کے گلے لگنا برا یا ناگوار نہ لگے۔ وہ مجھے فوراً خود سے الگ کر کے یوں کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگتی کہ کہیں مجھے اس کا گلے لگانا برا تو نہیں لگا۔ مجھے فوراً اس کی اس معصومانہ جھجک کا ادراک ہو جاتا اور پھر میں خود اسے کھینچ کر اپنے سے لگا لیتی اور بے اختیار میرا لہجہ گلوگیر سا ہو جاتا۔ ''سدھوری بہن! مجھ سے دور کیوں ہوتی ہے تو، تجھے اپنے گلے سے لگا کر تو مجھے سکھ ملتا ہے۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اپنی بہن کے گلے لگ کر اپنا غم آنسوؤں کے ذریعے ہلکا کر رہی ہوں۔'' میری بات سن کر اس کے معصوم چہرے پے یکدم خوشی سی پھیل جاتی اور وہ فوراً دوبارہ گلے سے لگا لیتی اور یہ واقعی امر تھا کہ سدھوری مجھے اپنی

اپنی سی لگتی تھی اس کے سلوک اور رکھ رکھاؤ میں میرے لئے بڑا انہاک ہوتا تھا غرض وہ
چھوٹی بہن ہی کی طرح میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتی تھی اور اس کا
باپ موگو بھی مجھے اپنی بیٹیوں ہی کی طرح سمجھتا اور ایک مشفق باپ ہی کا سا رویہ
میرے ساتھ روا رکھتا تھا۔ مجھے گو یہاں رہتے ہوئے جب کچھ عرصہ گزرا تو دل ذرا
اُکتانے لگا۔ خود کو میں ایک بوجھ سا تصور کرنے لگی تھی حالانکہ ان دونوں باپ بیٹی کی
پیشانی پر کبھی ایک شکن بھی نہ ابھری تھی۔ سدھوری کے اپنے بھی چھوٹے چھوٹے بچے
تھے۔ اگرچہ گھر کے گنے چنے کاموں میں ہاتھ میں بھی بٹالیتی تھی مگر پھر بھی میں چاہتی
تھی کہ ذریعہ آمدنی کا بھی کچھ وسیلہ بنایا جائے۔ میں دیکھتی تھی کہ سدھوری گلے وغیرہ پر
برتھ کا کام کیا کرتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ خوبصورت ڈیزائن دار رلیاں بھی بناتی تھی۔
میں نے ایک دن کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔ ''سدھوری! کیا تم مجھے یہ کام سکھا
سکتی ہو؟''

میری بات پر وہ پہلے حیرت سے مجھے تکنے لگی۔ اس کے بعد معصوم سی مسکراہٹ سے
بولی۔ ''ہا...... ادی کیوں نہیں...... پر پتہ نہیں تجھے یہ کام اچھا لگے کہ نہیں۔''
جواباً میں قدرے رسان سے بولی۔ ''نہیں سدھوری! یہ کام تو مجھے بہت اچھا لگتا
ہے بلکہ بہت زیادہ اچھا لگتا ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے لحہ بھر توقف کیا پھر متانت
سے بولی۔ ''سدھوری بہن! درحقیقت میں خود کو مصروف رکھنا چاہتی ہوں اور...... اور
تمہارا ہاتھ بھی بٹانا چاہتی ہوں۔'' میں نے دانستہ ذومعنی لہجہ اختیار کیا تھا تاکہ سدھوری
کی خودداری اور وضعداری کو ٹھیس نہ لگے لیکن وہ کم از کم اس معاملے میں ذہین تھی۔ وہ
میری بات کا مطلب سمجھ کر بھی چپ رہی۔ غالباً وہ میرا اصل مرام جان گئی تھی۔ اس
لئے اس نے فوراً مجھے بھی کام سکھانے کی ہامی بھرلی۔ میں دیکھا کرتی تھی کہ سدھوری
کے ہاں اکثر پڑوس سے ایک ادھیڑ عمر عورت وزیرن آتی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا سا
ٹوکرا ہوتا جس میں کپڑوں کی کترنیں اور مختلف کپڑوں کا الا بلا سامان ہوتا اور جسے وہ
سدھوری کے سامنے ہی نیم پختہ سے بوسیدہ فرش پر انڈیل دیتی، جس میں سے آدھا
سامان چن کر سدھوری رکھ لیتی اور باقی آدھا سامان وزیرن دوبارہ ٹوکرے میں ڈال کر
اینڈوا سر پر رکھے ٹوکرا اٹھائے چلی جاتی۔ سدھوری ان چیزوں سے ہی منقش رلیاں،



قمیض اور چادریں وغیرہ بناتی تھی اور پھر ٹھیک تین چار دن بعد وزیرن دوبارہ آتی۔
ادھر سدھوری بڑی محنت اور جانفشانی سے ان کپڑوں کی کترنوں کو خوبصورت کٹ پیس
میں ڈھال چکی ہوتی تھی۔ جن میں قمیضوں کے گلے بھی ہوتے تھے۔ وہ یہ سب چیزیں
وزیرن کے حوالے کر دیتی۔ پھر وزیرن سدھوری کو کرارے چند نوٹ تھماتی، ساتھ ہی
دوبارہ کترنوں اور کپڑوں کا نصف ٹوکرا ان کے آگے ڈھیر کر کے چلی جاتی۔ میں نے
دل میں سوچا تھا کہ اگر میں یہ کام سیکھ لوں تو یقیناً میں اور سدھوری وزیرن کا پورا ٹوکرا
ہی کپڑوں کا تیار کر کے دے سکتے تھے اور اس طرح آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو
جاتا۔ یوں میں بھی اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہو سکتی تھی۔ بس پھر کیا تھا میں تن من
دھن کے ساتھ سدھوری سے کام سیکھنے لگی۔ پھر کچھ میری دلچسپی اور شوق اس پر مستزاد خود
سدھوری کا مجھے سکھانے میں انہاک لہٰذا میں جلدی ہی کام سیکھ گئی۔ اس دن تو میری
خوشی دیدنی تھی جب وزیرن کو ہم نے پورے ٹوکرے جتنا کام مکمل کر کے دیا اور نہ
صرف یہ بلکہ اس نے میرے کام کی تعریف کرتے ہوئے سدھوری سے کہا۔ ''ڑی
سدھوری! تیری اس بہن کے ہاتھوں میں تو بڑی جلدی صفائی اتر آئی ہے۔ پتہ ہے
تجھے ادھر اونچے وڈے بنگلوں میں رہنے والی بیگموں نے سب سے زیادہ کام تیری اسی
بہن آمنہ کا ہی پسند کیا ہے۔'' آخری جملہ اس نے میری جانب توصیفی نظروں سے
دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ سدھوری میری تعریف پر خوش ہو گئی لیکن جانے کیوں میرے
دل میں ایک گھونسا لگا تھا اگرچہ مجھے خوشی بھی تھی کہ میں اب بیچاری سدھوری کا ہاتھ
بٹانے لگی تھی لیکن اس منہ پھٹ عورت وزیرن کی ''اونچے اور وڈے بنگلوں کی بیگموں
والی'' بات نے مجھے یکدم اداس سا کر دیا تھا اور میں دل مسوس کر سوچنے لگی کہ ایک میرا
بھی وقت تھا جب میں بھی اونچے اور وڈے بنگلوں والی بیگم تھی اور وزیرن ہی کی طرح
کی ایک دیہاتن عورت میرے ہاں بھی آتی تھی اور میں بڑے شوق سے اس سے رلیاں
اور دیگر چیزیں خریدا کرتی تھی۔ وائے نصیب! کیا معلوم تھا کہ آج تقدیر مجھے ایسے
دوراہے پر بھی لا سکتی تھی جہاں میں ''خریدنے والی'' سے ''بنانے والی'' بن گئی تھی۔
میری آنکھوں میں یہ سب کچھ سوچتے ہوئے آنسو امڈ آئے تھے۔
وزیرن تو حیران پریشان مجھے تکتی ہوئی چلی گئی جبکہ سدھوری نے بے اختیار مجھے

اپنے گلے سے لگالیا وہ بھی سسک پڑی تھی۔ غم کے آنسوؤں کی اثر پذیری اس کے معصوم روتے ہوئے چہرے پر ثبت تھی۔ وہ میرے اچانک غمزدہ ہونے کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ مگر نوک زباں سے اس کا اظہار کرنے کی بجائے آنسوؤں کے خاروخس کے ذریعے اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ وہ میری آنکھوں سے اکا دکا اڈنے والے اشک ناگہاں کا درد جان گئی تھی۔

بہر طور میری لشتم پشتم چلتی زندگی کی گاڑی کو ایک دھکا لگ چکا تھا اور کم از کم میں اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو چکی...... تھی ایک دن اچانک میری طبیعت بگڑ گئی۔ اس وقت سہ پہر تھی میں سدھوری کے ساتھ نیم پختہ صحن میں ایک کھری چارپائی پر بیٹھی کپڑوں کی دھجیوں سے رلی بنانے میں مصروف تھی۔ جب میں پانی پینے کے لئے چارپائی سے اٹھی تو اچانک میرا سر چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھاتا چلا گیا۔ یہ تو شکر تھا کہ میں فرش بوس ہونے کی بجائے چارپائی پر ہی دھم سے گر گئی۔ بیچاری سدھوری مجھے پکارتی ہوئی لپکی۔ پھر اس نے پانی کے چھینٹے میرے چہرے پر ڈالے اور پانی پلایا۔ میں بالکل بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ذرا ہوش آیا تو کچھ حالت سنبھلی۔ سدھوری بیچاری ذرا فکر مند ہو گئی تھی میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''ادی ابھی طبیعت کیسی ہے تیری، چاک تو ہے نا تو۔''

''ہاں اب کچھ ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا مگر ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک مجھے ابکائیاں سی آنے لگیں اور میں کونے میں لگی میونسپلٹی کے نلکے کی طرف دوڑی۔ مگر پانی اس میں عنقا تھا۔ مجھے ہلکی سی تے ہوگئی۔ سدھوری نے جلدی سے مجھے جست کے ٹیڑھے میڑھے گلاس میں پانی دیا۔ پھر وہ مجھے سہارا دے کر چارپائی تک لائی۔ میں نے دیکھا اب اس کا چہرہ بجائے پریشان ہونے کے اور ہی تاثر دینے لگا تھا۔ جس میں ہلکی سی آسودہ مسکراہٹ تھی۔ وہ مجھے چارپائی پر آرام سے بٹھانے کے بعد اجرک اوڑھتے ہوئے بولی۔ ''ادی! تو آرام سے یہاں بیٹھ، میں ابھی آتی ہوں۔ گھبرانا نہیں تجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آناً فاناً گھر سے نکل گئی۔

میں حیران پریشان جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی اور سوچنے لگی کہ یہ سدھوری اچانک کہاں کو چل دی۔ میں کافی دیر تک گم صم اور گھبرائے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھی اپنی



اچانک بگڑی ہوئی طبیعت کے بارے میں سوچتی رہی۔ نہ جانے یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا؟ اس سے پہلے تو آج تک مجھے ایسا نہیں ہوا تھا ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ سدھوری گھر میں داخل ہوئی۔ لیکن اس کے ہمراہ ایک بوڑھی سی عورت تھی۔ جس نے ٹوپی والا چنٹ دار برقعہ پہن رکھا تھا۔ اندر آتے ہی وہ اس نے اتار دیا تھا۔ سدھوری کے معصوم چہرے پر عجیب ہی بہار تھی۔ میں حیرانگی سے منہ کھولے انہیں تکے جا رہی تھی۔ اثنائے راہ سدھوری نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''ادی! یہ ہماری دائی اماں ہیں بلکہ پورے محلے کی اماں ہیں۔ یہ تمہارا ذرا معائنہ کریں گی۔ ان کے ساتھ اندر کمرے میں چلی جاؤ۔'' میں نے یہ سنا تو ہکا بکا سی رہ گئی۔ ''دائی اماں'' کا لفظ اور کمرے میں جا کر ''معائنہ'' کرنے والی بات نے مجھے جانے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا اور میرے ستم رسیدہ وجود کے اندر جیسے کوئی تلخ حقیقت انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی۔ ایک خدشہ جس سے میں اب تک دانستہ چشم پوشی کرتی آئی تھی۔ وہ بڑی کٹھنائی کے ساتھ میرے تصور میں اجاگر ہونے لگا تھا۔ میں سدھوری کی ''بات'' کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ میں نے ایک نظر دائی اماں کی جانب دیکھا اور تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سدھوری سے کہا۔ ''کک..... کیا مطلب؟ سدھوری بہن! کیسا معائنہ؟''

''ادی تم چلو تو سہی ذرا اندر مجھے لگتا ہے آج دائی اماں خوشخبری سنانے والی ہے کوئی۔'' سدھوری بڑے رسان کے ساتھ مجھے کمرے میں چھلکتی ہوئی معصومانہ خوشی سے بولی اور میں چار و ناچار اندر چلی گئی۔ میرے عقب میں دائی اماں بھی چلی آئی۔ وہ کوئی ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھی ایک قدرے صحت مند عورت تھی۔ جب وہ میرا معائنہ اور کچھ ضروری باتیں وغیرہ پوچھ کر فارغ ہوئی تو قدرے خوشی کے آثار اپنے جھریوں بھرے چہرے پر طاری کرتے ہوئے بولی۔ ''اڑی چھوکری مبارک ہو، تو ماں بننے والی ہے۔''

کوئی اور لمحہ ہوتا تو میں اس خبر پر نہال ہو جاتی۔ ''ماں'' بننے والی آفاقی خوشخبری اگر مجھے واثق علی کے گھر یا کسی مہنگے اور جدید سہولیات سے آراستہ ہاسپٹل کی مشہور معروف لیڈی ڈاکٹر سناتی تو یقیناً میرا روم روم خوشی سے جھوم اٹھتا۔ میں اپنی ممتا کی تکمیل پانے

کی خوشی میں جانے کس کس طرح خوشیاں مناتی۔ لیکن وائے نصیب اور ہائے قسمت کہ مجھے ماں بننے کی خوشخبری ملی بھی تو کہاں اس تنگ و تاریک اور عسرت زدہ ماحول میں۔ کیا میری کوکھ میں پلنے والے بچے کا نصیب یہی تھا کہ وہ کسی اونچے گھر اور عالی شان مکان کی بجائے اس تیرہ و تار کوٹھڑی میں آنکھ کھولے......؟ یہ سب کچھ سوچ کر میں ایک گہری اور ٹیس زدہ سی سانس کھینچ کر رہ گئی۔ جہاندیدہ دائی اماں نے غالباً میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور کبیدگی بھانپتے ہوئے لیکن اپنی سطحی ذہنیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھ سے بولی۔ اری چھوری تیرا مرد ہے نا...... کدھر ہے وہ۔" اس کے لہجے میں شک کی پرچھائیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مجھے اس کا یہ پوچھنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ اس کا لہجہ حد درجہ جہالت کی عکاسی لئے ہوئے تھا۔ تاہم میں کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواباً بولی۔

"اماں! تیری بڑی مہربانی۔ پر مجھ سے یہ نہ پوچھ۔"

میری بات سن کر اچانک اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے شاید میرے چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیاں بھانپ لی تھیں لہٰذا اس مرتبہ جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں گہرا تاسف پایا جاتا تھا۔

"کوئی بات نہیں دھیئے! میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتی تھی شاید تجھے ماں بننے کی خوشی نہیں ہوئی۔" پھر ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔

❁❁❁

بھٹائی کالونی کی طرف جانے کے لئے کمال نے ڈیفنس ویو کا راستہ اپنایا تھا۔ ایڈووکیٹ سعدیہ سعید اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ قیوم آباد کا چوک کراس کرنے سے پہلے یہاں ایک فلنگ اسٹیشن سے کار میں پیٹرول ڈلوایا اور پھر چوک کراس کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ یہاں سے لگ بھگ پانچ دس منٹ بعد ہی وہ کورنگی کریک پہنچ گئے۔ اب ان کی داہنی طرف بھٹائی کالونی کی آبادی تھی، جو خاصی نشیب میں تھی۔ یہاں سے کار ایک ذیلی سڑک پر اتر گئی جو خاصی ناہموار اور کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ پھر کار نے ایک میدان کے کنارے کنارے بائیں جانب ٹرن لیا۔ یہ سڑک سیدھی مطلوبہ سیکٹر کی طرف جاتی تھی۔ ذرا آگے جا کر سڑک کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تھی۔ آس پاس



خاصا بڑا میدانی علاقہ تھا جہاں بچے فٹ بال اور کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کہیں کہیں مکانات بھی زیر تعمیر تھے۔ اس کالونی کا بازار دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جن میں پٹھانوں کے ہوٹل اور دکانیں وغیرہ تھیں۔ کچھ فروٹ کی ریڑھیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد کمال نے جیسے ہی اپنی کار ایک گلی کے سرے میں سائیڈ کر کے روکی تو سعدیہ سے مخاطب ہوا۔ "غالباً یہی ہمارے مطلوبہ مکان کی گلی ہے۔ کیا خیال ہے پھر ڈرامے کو کٹ کیا جائے؟"

سعدیہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ کسی قریبی مسجد سے عصر کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک آلود ہوا چل رہی تھی۔ سعدیہ کے کار سے اترتے ہی کمال نے بھی اپنی سیٹ چھوڑنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ باہر آ کر کمال نے کار کی مختصر سی ڈکی کو کھولا اور اندر سے ایک ویڈیو کیمرہ اٹھایا اور ساتھ ہی ایک درمیانی سائز کا سوٹ کیس بھی باہر کھینچ لیا۔ وہ سوٹ کیس اس نے سعدیہ کو تھما دیا اور پھر گاڑی لاک کرنے کے بعد دونوں گلی کے اندر داخل ہو گئے۔ انہیں اپنا مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ کمال نے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر معنی خیز نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ سعدیہ نے دھیرے سے جواباً اپنے سر کو اثبات میں ہلایا پھر کمال نے ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ سعدیہ کے دل میں عجیب سی دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔

خورشید احمد کے قاتل پرویز کے گھر تک رسائی اس قدر جلد ممکن ہو جائے گی۔ اس کی اسے غالب توقع نہ تھی۔ اب وہ منتظر تھی کہ کوئی دم کو خورشید احمد کا قاتل اس کی نظروں کے سامنے ہو گا۔ اگرچہ انہوں نے اس سے سامنا کرنے کا پورا پورا "بندوبست" کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک دھڑکا سا تھا کہ کہیں پرویز نامی قاتل محتاط نہ ہو جائے۔ بالآخر دوسری بار دستک دینے پر ایک چھوٹی بچی نے دروازہ کھولا۔ یہی کوئی سات سال کی ہو گی۔ اس بیچاری نے ایک چھوٹا سا انگوٹھا چوستا ننگ دھڑنگ بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا۔

"بیٹی! گھر میں آپ کے امی ابو موجود ہیں؟" سعدیہ نے پیار سے بچی کو مخاطب کر کے کہا۔ اس بچی نے بہ مشکل اپنی گود سے نیچے سرکتے ہوئے بچے کو اوپر کیا اور بولی۔

"جی امی تو گھر پر موجود ہیں پر بابا باہر کہیں گئے ہوئے ہیں۔"
"بیٹی! آپ کے ابو کا نام پرویز ہی ہے ناں۔" کمال نے کسی خیال کے تحت
پوچھا۔
بچی نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور معصومانہ نظروں سے دونوں کی جانب تکنے لگی
اس نے ایک بار پھر ہلکا سا "ٹھکا" لگا کر نیچے سرکتے ہوئے بچے کو اوپر کیا۔ وہ بچہ غالباً
اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اندر سے ایک عورت کی چلاتی ہوئی
آواز ابھری۔ "اری ناس پیٹی! دروازے پر ہی جا مری ہے بتاتی کیوں نہیں کون ہے
باہر۔" وہ غالباً اس بچی کی ماں تھی۔ جواباً اس بچی نے ایک ہاتھ اپنی بہتی ہوئی ناک پر
پھیرا، پھر بولی۔ "امی! باہر کوئی آنٹی اور انکل ہیں ابا کا پوچھ رہے ہیں۔" ابھی اس نے
اتنا ہی بتایا تھا کہ ایک عورت بچی کے عقب میں نمودار ہوئی پھر سعدیہ کے ساتھ ایک
مرد کو دیکھ کر فوراً دروازے کا ایک پٹ آگے کر کے آڑ میں ہو گئی اور دوبارہ اس بچہ
بدست معصوم بچی کو غصیلے لہجے میں جھڑکتے ہوئے ایک ہاتھ سے اسے پیچھے کھینچ کر
بولی۔ "پیچھے کو مر، ادھر مجھے بات کرنے دے۔" پھر وہ سعدیہ کو دروازے کے عقب
سے مخاطب کر کے بولی۔ "جی...... آپ کو کس سے ملنا ہے؟"
"باجی اسلام علیکم!" سعدیہ نے فوراً جواباً پہلے منصوبے کے مطابق سلام کیا پھر
بولی۔ "باجی! وہ ہم ایک کمپنی کی طرف سے گھر گھر جا کر اپنا ایک کپڑے دھونے والا
واشنگ پاؤڈر متعارف کروا رہے ہیں اور کچھ تحفے بھی دے رہے ہیں۔"
"اچھا جی! لیکن وہ...... میرے میاں تو موجود نہیں ہیں؟" دوسری طرف سے اس
عورت کا چڑچڑا پن اچانک ہی مفقود ہو چکا تھا۔
"کوئی بات نہیں محترمہ! آپ تو موجود ہیں ناں ہم بس ہلکا پھلکا آپ سے انٹرویو
لیں گے۔ اپنے پاؤڈر کے بارے میں تھوڑی سی آپ سے فلم بھروائیں گے اور ذرا آپ
کو زحمت دیتے ہوئے نمونے کے طور پر کوئی کپڑا بھی دھلوائیں گے اگر آپ اجازت
دیں تو۔" اس بار کمال نے اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کیا تھا جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔
اس عورت نے فوراً نہ صرف دروازہ چوپٹ کھول دیا بلکہ اندر جھولتے ہوئے پردے
کو بھی پرے کر کے یوں دھڑلے سے ان کے سامنے آ گئی جیسے واقعی وہ اس وقت فلم



کی شوٹنگ میں باقاعدہ حصہ لینے والی ہو۔ سعدیہ نے بہ غور اس عورت کا جائزہ لیا۔
رنگت اس کی قدرے کھلتی ہوئی تھی اور چہرے کے نقوش اگرچہ اس کے چڑچڑے پن
کی وجہ سے مسخ ہو رہے تھے۔ تاہم محسوس ہوتا تھا کہ وہ جاذب نظر رہی تھی۔
"اچھا جی...... میں سمجھ گئی آ...... آپ ٹی وی میں میرا فوٹو دیں گے نا جی۔" وہ
اچانک خوشدلی سے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے ان دونوں کی جانب دیکھ کر بولی۔
"کمال کا حربہ کامیاب گیا تھا۔ ورنہ سعدیہ کو تو ایسی چڑچڑی عورت سے ذرا بھی
تعاون کی امید نہیں تھی۔ ادھر کمال نے پھر اپنی چرب زبانی کا جوہر دکھایا اور عورت سے
مخاطب ہوا۔ جو بلاشبہ پرویز کی بیوی ہی تھی۔
"جی محترمہ! آپ نے درست اندازہ لگایا۔ ہم نہ صرف آپ کی کپڑے دھونے والی
فلم ٹی وی پر دکھائیں گے بلکہ اپنے واشنگ پاؤڈر سے متعلق آپ سے مختصر سا انٹرویو بھی
دکھائیں گے اور آپ کو معاوضہ بھی دیا جائے گا۔" اتنا کہہ کر کمال ذرا رکا پھر یونہی
پوچھا۔ "آپ ویسے پرویز صاحب ہی کی بیگم ہیں۔"
"جی ہاں...... پرویز میرے خاوند کا نام ہے۔ آپ...... آپ اندر آ جایئے نا۔"
پرویز کی بیوی نے فوراً انہیں آنے کا راستہ دیا۔
اندر سے مکان ایسا ہی تھا جیسا کہ اس کالونی میں ہونا چاہئے تھا۔ اندر ایک کونے
میں گیلے فرش پر دو اور چھوٹے چھوٹے بچے پانی کی بالٹی کے قریب ہی دھینگا مشتی میں
مشغول تھے۔ صحن ذرا کشادہ تھا مگر خاصا ابتر نظر آ رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی جھلنگا سی چارپائیاں
بے ترتیبی سے بچھی ہوئی تھیں کچھ کھانے کے برتن بھی ادھر ادھر اوندھے نظر آ رہے
تھے۔ یہ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پرویز کی بیوی انہیں لئے ایک کمرے میں آ گئی۔
وہ بار بار کمال کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ویڈیو کیمرے کی طرف اشتیاق سے دیکھ رہی
تھی۔ یوں تو گھر میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی لیکن بے ترتیبی اور بکھراؤ زیادہ نظر آ
رہا تھا۔ سعدیہ کو اس گھر میں دو ہی کمرے نظر آئے تھے۔ تیسرا غالباً اسٹور نما سا کمرہ
تھا۔ ایک دوسرے کمرے سے سعدیہ کی محتاط سماعتوں نے کسی بوڑھی عورت کے کھانسنے
کی بھی آواز سنی تھی۔ سعدیہ بڑی گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔
"جی آپ کے لئے کچھ چائے وغیرہ بناؤں۔" اس نے سعدیہ کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا تھا۔

''نہیں بہن! ہمیں ذرا جلدی ہے دوسرے گھروں میں بھی جانا ہے۔ بس ذرا تم تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں سمجھا دیتی ہوں کہ تم نے کیمرے کے سامنے کیا کیا بولنا ہے۔'' سعدیہ نے جیسے اسے فوراً کمرے سے نکالنا چاہا۔ کیونکہ وہ اس کمرے کی تلاشی لینا چاہتی تھی۔ درحقیقت اس کی تجسس نگاہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کمرہ انہیں دونوں میاں بیوی کے استعمال میں تھا۔ کیونکہ سعدیہ کی ایک جگہ پر پرویز اور اس کی بیوی کی فریم والی تصویر پر نظر پڑی تھی۔ جس میں وہ دونوں دولہا اور دلہن کے روپ میں اکٹھے بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ بھی پرویز اور اس کی بیوی کی کئی چھوٹی بڑی اور الگ الگ تصویریں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔

''یہ آپ کے میاں پرویز صاحب ہیں۔'' کمال نے اچانک پرویز کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس عورت سے پوچھا۔

''جی ہاں! یہ میرے شوہر ہیں پرویز۔'' اس عورت نے جلدی سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

پرویز کی بیوی کے کمرے سے نکلتے ہی کمال نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر پرویز کی ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر پر ہاتھ صاف کیا۔ پرویز کی تصویر اپنی جیب میں منتقل کرتے ہی وہ سرگوشی میں سعدیہ سے بولا۔ ''سعدیہ! جلدی کرو مجھے تو یہی ان دونوں کا کمرہ لگتا ہے۔ میرا خیال ہے تلاشی شروع کر دو۔ شاید کوئی کارآمد شے ہاتھ لگ ہی جائے۔'' بس پھر کیا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر ادھر اُدھر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ اس دوران اس عورت کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی اندر کمرے میں گھس آئے تھے اور معصومانہ حیرت سے سعدیہ اور کمال کو اپنے ''کام'' میں مصروف تکے جا رہے تھے۔ انہیں شاید حیرانگی ہو رہی تھی کہ ان کے گھر میں یہ کون لوگ آ گئے تھے جو بڑے دھڑلے سے کمرے میں ادھر اُدھر کچھ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ لیکن کمال اور سعدیہ کو ان کی طرف سے بے فکری تھی کہ یہ بچے چھوٹے ہیں۔ اپنے ماں باپ کو کچھ بتانے والے نہیں ہیں۔ لیکن انہیں اصل خدشہ اس بڑی بچی کی طرف سے تھا کہ کہیں وہ نہ اندر آ جائے اور پھر وہی ہوا وہ اندر آ گئی۔ اس بار بھی اس کی گود میں اس کا چھوٹا



بھائی دبکا ہوا تھا۔ کمال اور سعدیہ نے اس بچی کو دیکھتے ہی اپنی کارروائی روک دی تھی اور کمال اس بچی کو اپنی شرٹ کی جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر دینے لگا۔ اس اثناء میں پرویز کی بیوی بھی آ گئی۔ اسے دیکھ کر سعدیہ نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ جبکہ کمال شرارتی نظروں سے سعدیہ کی جانب دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ محترمہ تو ایسے تیار ہو کر آ گئی ہے جیسے واقعی ادھر کوئی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ پرویز کی بیوی نے یوں تو بہت سجنے سنورنے کی کوشش کی تھی مگر باوجود اس کے وہ عجیب مضحکہ خیز بن گئی تھی۔ بہر طور انہوں نے اپنا کام نکالنا تھا۔ اس چالاکی سے کہ پرویز محتاط نہ ہو جائے۔ کمال نے جلدی سے ویڈیو کیمرہ اپنے کاندھے پر رکھا۔ سعدیہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے سوٹ کیس سے کسی مشہور کمپنی کا واشنگ پاؤڈر ڈبہ نکالا اور اسے پرویز کی بیوی جس نے پوچھنے پر اپنا نام فریدہ بتایا تھا کو تھمایا پھر کچھ مکالمے وغیرہ سمجھا کر ہلکا پھلکا انٹرویو لیا۔ مثلاً متعارف کردہ واشنگ پاؤڈر دوسرے عام پاؤڈر کے مقابلے میں کتنا کارآمد ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہر طور یہ ''ڈرامہ'' نمٹانے کے بعد سعدیہ اور کمال نے اپنا ساز و سامان سمیٹا پھر سعدیہ نے اپنے اصل مطلب کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔ ''باجی فریدہ! آپ کا بہت بہت شکریہ اب انشاءاللہ یہ ''ایڈ'' ہم عنقریب ٹی وی پر بھی نشر کریں گے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنا اور اپنے شوہر پرویز صاحب کا شناختی کارڈ یعنی اس کی فوٹو کاپی ہمیں عنایت کر دیں۔'' سعدیہ کے کہنے کی دیر تھی کہ فریدہ تھوڑی دیر بعد ہی لوٹ آئی اور اس نے اپنے شوہر پرویز کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی ان کی جانب بڑھا دی۔ سعدیہ کے لئے سب سے اہم پرویز کے شناختی کارڈ کی کاپی تھی۔ فریدہ کی تو اس نے یونہی فوٹو کاپی منگوائی تھی کہ تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو سکے کہ اصل میں وہ لوگ اس کے شوہر پرویز کے بارے میں جاسوسی کرنے آئے ہیں۔ سعدیہ نے فوراً سب سے پہلے پرویز کے شناختی کارڈ کی کاپی کو بہ غور دیکھا۔ جس میں پرویز کا نام مع ولدیت یونس درج تھا۔ پھر سعدیہ نے بہ ظاہر رواداری دکھاتے ہوئے فریدہ سے پوچھا۔

''فریدہ بہن! ویسے آپ کے شوہر کام کیا کرتے ہیں؟''

''جی ان کے کام کا تو آج تک مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں کرتے ہیں...... لیکن ان

کی ڈیوٹی کا ٹائم بہت خراب ہے۔ رات کو نکلتے ہیں تو کبھی صبح آتے ہیں یا پھر دوپہر بھی ہو جاتی ہے ان کو...... آج ہی دیکھ لو ابھی تک نہیں آئے۔"

"ہوں۔" کمال نے اس کی بات سن کر ایک ہنکارہ بھرا۔ پھر اس نے بھی استفسار کرتے ہوئے فریدہ سے کہا۔ "بہن! کیا آپ بتائیں گی کہ وہ کام کہاں کرتے ہیں۔ کیونکہ تصویر دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کے شوہر کو کہیں دیکھا ہے۔ یا پھر شاید کسی دانتوں کے ماہر ڈاکٹر کے کلینک میں۔ ویسے کیا آپ بتائیں گی کہ انہوں نے کوئی مصنوعی دانت وغیرہ بنایا تھا۔" کمال نے اس طرح گھما پھرا کر ایک غیر ضروری سوال اہم بناتے ہوئے پوچھا تھا کہ وہ فریدہ کے لئے چونکنے کا باعث بھی نہ بنے اور اپنا مطلب بھی نکل آئے۔

کمال کی بات سن کر فریدہ چند ثانیے کچھ سوچنے لگی۔ ادھر سعدیہ بے چینی سے اس کے جواب کی منتظر تھی۔ فریدہ نے بتانا شروع کیا۔ "بھائی صاحب! مجھے ان کے کام کی جگہ کا تو علم نہیں، بس یونہی ایک دن انہی سے سنا تھا کہ وہ کسی بڑی کاروباری کمپنی کے گوداموں کی نگرانی کرتے ہیں۔" اس کی بات سن کر سعدیہ یکدم چونکی۔ کمال نے فوراً دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ "اور...... وہ میرا مطلب ہے کہ کیا انہوں نے کبھی خود کو اپنے دانتوں کی تکلیف کے سلسلے میں کسی ڈاکٹر کو دکھایا تھا یعنی کوئی مصنوعی دانت بنایا ہو۔"

"ہاں جی وہی تو بتانے والی تھی آپ کو۔" فریدہ نے یکدم کہا۔ ٹی وی میں اپنا گھریلو کمرشل آنے کی مسرت میں وہ کمال کے سارے سوالوں کا جواب فرفر دینے پر تل گئی تھی۔ لہٰذا بولی۔ "شاید چار پانچ ماہ پہلے ان کے دانتوں میں تکلیف ہوئی تھی پھر انہوں نے دانتوں کے ڈاکٹر کو بھی دکھایا تھا۔ وہیں سے ہی وہ ایک نقلی دانت بھی اپنے ایک ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ لگوا کر آئے تھے۔"

"کیا وہ ٹوٹا ہوا دانت اوپری جبڑے کے بائیں جانب تھا۔" سعدیہ نے اچانک پوچھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس سوال پر کمال نے سعدیہ کو قدرے گھورا۔ پھر جیسے سعدیہ کو معاً ہی خیال آیا کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر غلطی کی تھی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فریدہ سعدیہ کے اس سوال پر چونک کر اسے دیکھتے ہوئے قدرے حیرانگی سے بولی۔



"ارے بہن آپ کو کس طرح یہ معلوم ہوا کہ میرے شوہر کا بائیاں دانت نقلی اور اوپری جبڑے کا ہے۔" مگر سعدیہ سے پہلے کمال نے بات بناتے ہوئے یکدم کہا۔ "نہیں...... دراصل وہ کیا ہے کہ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا نا کہ جس کلینک میں آپ کے شوہر نقلی دانت لگوا رہے تھے، وہاں میں بھی دانت لگوانے گیا تھا۔ پھر اتفاق سے ہم نے ان سے یونہی پوچھ لیا تھا کہ آپ کا اوپری نقلی دانت کس قدر پائیدار ثابت ہوا ہے۔ خیر چھوڑیئے اس فضول بات کو۔ آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے ہم سے تعاون کیا۔ انشاء اللہ ٹی وی پر آپ کا کمرشل آن ائیر جاتے ہی آپ کو چیک بھیج دیا جائے گا۔" کمال نے جیسے جلدی سے یہ کہہ کر جان چھڑائی اور سعدیہ کو اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر آنے لگا۔

"بھائی صاحب! ذرا سنئے تو...... وہ میرے لئے بھی ڈراموں میں کوئی جگہ نکالئے۔ میں اپنے سکول کے زمانے میں بھی چھوٹے موٹے رول کرتی رہی ہوں۔" فریدہ نے لپک کر کمال کے سامنے آتے ہوئے قدرے منت کے ساتھ کہا۔ غالباً وہ سچ مچ ہی کمال اور سعدیہ کو ٹی وی سے تعلق رکھنے والے لوگ سمجھی تھی۔ جو خود گھر چل کر فریدہ کے پاس آئے تھے اور فریدہ اپنی دانست میں یہ "سنہری" موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ سعدیہ اور کمال درحقیقت کرائم کورٹ کے وکیل تھے اور اس کے شوہر پرویز کو قاتل ثابت کرنے کے درپے تھے۔ بہر حال سعدیہ اور کمال کسی طرح فریدہ سے جان چھڑا کر واپس اپنی کار میں سوار ہو گئے۔

"تم نے آج ساری محنت پر پانی ہی پھیر دیا تھا۔" کمال نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ریورس گیئر لگا کر سعدیہ سے کہا۔ جواباً سعدیہ نے ایک گہرا سانس لے کر اعتراف کیا۔ "ہاں واقعی! میرے نقلی دانت والے سوال نے فریدہ کو چونکا دیا تھا اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اس بات کا ذکر اپنے شوہر پرویز سے بھی کر دے اور پھر وہ......"

"کچھ نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو بھول جاؤ۔" کمال نے جیسے سعدیہ کو ذہنی کوفت سے بچاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ویسے مجھے نہیں لگتا کہ وہ دانت سے متعلق کوئی بات اپنے شوہر سے کرے۔ اسے تو اپنے ٹی وی پر کمرشل کے آنے کا انتظار ہو گا۔"

"اور جس کے انتظار میں بیچاری بوڑھی ہو جائے گی۔" سعدیہ نے خوش دلی سے کہا۔ اب اس کی کدورت دور ہو گئی تھی وہ اب دوبارہ کورنگی روڈ آ گئے تھے۔ چند ثانیے بعد سعدیہ نے توصیفی لہجے میں کہا۔ "کمال! ویسے ہم نے ڈرامہ خوب پلے کیا۔ تمہاری یہ واشنگ پاؤڈر کے کمرشل والی ترکیب خاصی کامیاب گئی۔ ورنہ تو میں یہ سوچ کر ہی پریشان ہو رہی تھی کہ اب پرویز کے گھر تک کس طرح رسائی حاصل کی جائے۔"

"دیکھ لو...... سارے کام خوش اسلوبی سے طے ہوتے چلے گئے ہیں اور اب اس بات کی بھی حتمی طور پر تسلی ہو گئی ہے کہ ہمیں جس پرویز نامی قاتل کی تلاش تھی وہ بلاشبہ اس فریدہ نامی عورت کا ہی شوہر نامدار ہے۔" کمال کے لہجے میں کامیابی کا جوش تھا۔ لیکن سعدیہ کا چہرہ جانے کیوں ذرا بجھ سا گیا تھا۔

وہ ازراہ تاسف بولی۔ "کمال! ویسے مجھے بڑا دکھ ہو رہا ہے کہ جس شخص کو ہم پھانسی کے پھندے تک پہنچانے جا رہے ہیں وہ ایک ہنستے بستے معصوم سے چھوٹے کنبے کا کفیل ہے۔" سعدیہ کے لہجے میں خاصا درد سمٹ آیا تھا کمال بھی ازراہ تاسف اپنا سر دھیرے سے ہلا کر رہ گیا تھا۔

"ویسے کمال! اب کہاں کا ارادہ ہے؟" سعدیہ نے یکدم ماحول کی کدورت دور کرنے کی غرض سے موضوع بدلا۔

"ڈاکٹر عشرت کے کلینک...... تاکہ پرویز کی جو تصویر ہم نے اس کے گھر سے لی ہے وہ اسے دکھا کر آخری تسلی ہو سکے کہ آیا یہی پرویز نامی وہ شخص تھا جس کا انہوں نے نقلی دانت بنایا تھا۔" کمال نے جواب دیا۔

❁❁❁

"سس...... سائیں...... ی...... یہ کیا؟" دادو اپنے سامنے رسن بستہ قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں ساتھ کھڑے زمیندار اختیار علی سے بولا۔

"اڑے بابا...... یہ میرے "رہاک" ہیں۔ قرضائی ہیں میرے...... بیگار لیتا ہوں میں ان سے...... آج سے تو ان کی نگرانی کرے گا۔" جواباً اختیار علی نے دادو کو قدرے گھورتے ہوئے کہا اور بیچارہ دادو زمیندار کی بات پر سناٹے میں آ گیا۔ دادو کو گومگو کی کیفیت میں پا کر اس بار کمدار مولا بخش نے اپنے نمبر بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے



جھلکے دار لہجے میں اس سے کہا۔ "اڑے دادو! پتہ ہے تجھے نگران کون ہوتا ہے۔ مالک ہوتا ہے مالک، اپڑیں سائیں وڈے کا شکریہ ادا کر جو تجھے اس نے اتنی عزت والی نوکری پر رکھ لیا ہے۔ ان سب لوگوں کو صبح ساجر (تڑکے) سائیں بھوتار کی زمینوں پر لے جا کر اور شام کو یہاں لا کر بند کر دیا کر سمجھا۔" اتنا کہہ کر وہ زمیندار اختیار علی سے مؤدبانہ مخاطب ہو کر بولا۔

"سائیں! آؤ...... اب واپس اوطاق چلتے ہیں یہ سنبھال لے گا سب۔" زمیندار نے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور واپس جاتے جاتے دوبارہ دادو سے بھاری لہجے میں بولا۔ "اڑے چھورا! باہر برابر میں لکڑی کا ایک کمرہ ہے۔ وہ تیرا ہے اب تو نے یہیں پر رہنا ہے سمجھا۔ مانی ٹکر تجھے یہاں پہنچ جایا کرے گی۔ گڑتی نہ کر میرا ایک آدمی یہاں آتا رہے گا۔ شاید موالی پھتو کو ہی دوبارہ یہاں بھیجنا پڑے۔" یہ کہتے ہوئے زمیندار اور کمدار دادو کو جہاں کا تہاں چھوڑ کر واپس لوٹ گئے۔ دادو کی زبان سے چاہتے ہوئے بھی ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ پھر معاً اسے اپنی سماعتوں میں ماما وسایا کے الفاظ گونجے۔ "پٹ دادو! زمیندار اختیارے کی بات پر ذرا سوچ سمجھ کر عمل کرنا۔ اس کی باتوں سے ظلم کی بو آتی ہے۔" لیکن دادو بیچارے کو تو سوچنے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا اور ویسے بھی اسے سوچنے کا حق کہاں دیا گیا تھا۔ اسے تو بس حکم بجا لانے کے لئے کہا گیا تھا۔ وہ اپنے ماما وسایا کو کس طرح یہ بات سمجھاتا کہ اگر وہ اس کام سے انکار کر دیتا تو یقیناً ان مسکین اور کمزور قیدیوں میں وہ نادار قیدیوں کا اور اضافہ ہو جاتا۔ جبکہ دادو اب کسی طور اپنے بوڑھے ماں باپ کو زمیندار اختیار علی کا قیدی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ابھی دادو وہاں کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کی سماعت سے زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ ہی ایک کپکپاتی ہوئی مگر جوشیلی آواز ٹکرائی۔ "اڑے چھوکرا...... تو حضورے کا پٹ ہے ناں...... آ...... آ جا...... ہم کو کوڑے مار...... پیٹ ہمارے کو...... ایک تیری کسر باقی رہ گئی تھی۔ باقی تو ہم مجبوروں کو مار کٹ کے تھک کر چلے گئے تو بھی ہمیں مار کر تھک جاوے تو چلے جانا۔"

لفظوں کی اس کاٹ نے دادو کی سماعتوں کو چیر ڈالا۔ ان برماتے ہوئے الفاظ میں ایک ایسا ہٹیلا پن تھا جو اس وقت لہجے میں عود کر آتا ہے، جب ظلم حد سے تجاوز کر جائے

اور مظلوم عادیٔ ستم ہو کر پھر کسی قسم کی تکلیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دادو نے چونک کر سامنے دیکھا وہ ایک پابہ گل شخص تھا۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کی منزل طے کر رہا تھا۔ دادو کو اس شخص میں اپنے باپ کا چہرہ نظر آیا۔ دادو سے اب رہا نہ گیا۔ پلک جھپکنے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ گیا تھا کہ اس شخص نے اسے کیا سمجھ کر یہ الفاظ کہے تھے اور وہ اس مجبور اور بے کس شخص کی ہی نہیں بلکہ وہاں موجود سب لوگوں کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرے گا اور وہ خود بھی انہی کی طرح ایک مجبور انسان ہے۔ تاہم دادو نے فوراً آگے بڑھ کر اس مظلوم اور شکستہ سے انسان کو اپنے گلے لگا لیا اور بولا ''چاچا تم گرتی مت کرو۔ میں تم پر کوئی ظلم نہیں کروں گا۔ میں تو آپ ہی مظلوم ہوں۔ اللہ سائیں جانتا ہے مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ میرے ماں پیو کو رہا کرنے کے بدلے میں زمیندار مجھے تمہاری رکھوالی کے لئے یہاں لایا ہے لیکن یقین کرو میں کبھی تم پر کسی قسم کا ظلم نہیں کروں گا۔'' دادو کی آواز فرطِ رقت سے کپکپا کر رہ گئی۔

وہ نحیف شخص دادو کی بات پر ششدر سا رہ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس کے ستے ہوئے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد دادو نے خوشدلی اور نرم خوئی کے ساتھ باقی دیگر قیدیوں کو بھی تسلی دی کہ اس کی ذات سے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ درحقیقت دادو نے بالآخر یہی سوچ کر یہ کام قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ زمیندار کی یہ بات ماننے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اگر وہ انکار کر بھی دیتا تو زمیندار کے پاس بے رحم آدمیوں کی کمی نہ تھی وہ کوئی دوسرا جلاد صفت شخص ان پر مسلط کر سکتا تھا اور بعد میں زمیندار اختیار علی اس کے لئے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ کیونکہ اب دادو کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ زمیندار اختیار علی فطرتاً ایک جابر شخص ہے۔

وقت گزرتا گیا دادو اب وہیں ''فارم'' نما نجی جیل کا نگراں بن کر رہنے لگا۔ صبح تڑکے وہ تمام قیدیوں کی زنجیریں کھول کر اختیار علی کی زمینوں پر لے جاتا اور شام گئے انہیں لے کر واپس فارم لوٹ آتا۔ اس کے ہمراہ زمیندار کے چند اور بھی آدمی ہوتے تھے۔ دادو جانتا تھا کہ یہ آدمی زمیندار کے زرخرید تھے اور یہاں کی ایک ایک خبر اوطاق



تک پہنچاتے ہوں گے۔ اس لئے اپنی ''کارکردگی'' دکھانے کے لئے وہ جھوٹ موٹ قیدی ہاریوں کو ڈانٹ پھٹکار بھی کر لیتا تھا اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ دادو ایسا شخص دکھاوے کے لئے کر رہا ہے۔ دادو ہفتے دس دن میں گھر بھی آتا تھا اگرچہ اس نے سب کو یہی بتایا تھا کہ وہ وڈیرے کے ایک بڑے اصطبل کی رکھوالی کرتا ہے لیکن ماما وسایا کو بالکل اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ مگر وہ منہ سے کچھ بولا نہ تھا۔ دادو نے بھی اس سے نظریں چرائی ہوئی تھیں۔ وہ رات کو وہیں ایک لکڑی کے کیبن نما چوبی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ موالی پھتو اگرچہ ایک چرسی سا شخص تھا مگر کھانا وہ بہت اچھا بناتا تھا اور اکثر رات کو وہ دادو کو لطیف سائیں اور بچل سائیں کی دائیاں اور کافیاں بڑے پُرسوز آواز میں گا کر سنایا کرتا تھا۔ لیکن دادو اب شہر جانے کے لئے بے چین سا ہونے لگا اس کی بے کلی کی سب سے بڑی وجہ شمائلہ تھی۔ اس کی یاد کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی دادو کو ہمہ وقت ایک حوصلہ عطا کرتی تھی۔ مگر دادو کو اس کے باپ خورشید احمد کے قتل پر دکھ بھی بہت تھا۔ اسے یہ بات بھی فکر مند کرنے لگی تھی کہ وہ ضمانت پر رہا ہو کر آیا تھا لیکن یہاں اس نے سب سے یہ بات چھپا کر رکھی تھی۔ اب اسے یہی فکر ستا رہی تھی کہ اگر کورٹ میں حاضری یا پیشی ہوئی تو وہ کیا کرے گا؟ ایسا نہ ہو کہ پولیس اسے دوبارہ گرفتار کرے اور وکیل سعد یہ سعید کی ساری محنت اکارت چلی جائے۔ وہ لوگ سب یقیناً اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان سب تفکرات نے اچانک ہی دادو کو خاصا پریشان کر دیا تھا۔ بہرحال اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز وہ زمیندار کے پاس اس کی اوطاق جائے گا اور چند روز کی چھٹی لے کر اسی دن شہر نکل جائے گا۔ یہ پروگرام بنا کر اس کے دل کو ذرا سکون ہوا۔ دادو کو یہاں فارم میں اور کوئی تو تکلیف نہیں تھی۔ مگر رات کو سوتے وقت اسے موٹے موٹے مچھر بہت تنگ کرتے تھے مگر یہ مسئلہ بھی پھتو موالی نے حل کر ڈالا تھا۔ اس نے کچھ سوکھے اوپلے جلا کر چوبی کیبن کے باہر رکھ دیئے تھے۔ اس کے دھوئیں سے مچھروں کے حملوں کی شدت میں خاصی کمی آجاتی تھی۔

یہ اس رات کا ذکر تھا جب دادو نے اگلے دن زمیندار سے اجازت لے کر شہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ کیبن کے باہر چارپائی ڈال کر سویا ہوا تھا۔ اس کے قریب پھتو موالی کے خراٹے گونج رہے تھے اس کی چارپائی قریب ہی بچھی ہوئی تھی۔ مئی کا تپتا

ہوا گرم مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ اس لئے فضا میں خاصا حبس سا تھا۔ چہار اطراف تاریکی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ستاروں کی روشنی البتہ تاریکی میں مدہم سا اجالا کئے ہوئے تھی۔ دور کہیں میدانوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

دادو رلی بچھی چارپائی پر اجرک سینے تک پھیلائے لیٹا ہوا تاروں بھرے آسمان کو دیکھے جا رہا تھا۔ شمائلہ کی یادوں نے آج اس کی آنکھوں سے نیند کھینچ لی تھی۔ ابھی وہ سونے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک تیز نسوانی چیخ سن کر بری طرح ٹھٹھک گیا۔

❁❁❁



رات کے گمبھیر سناٹے میں کسی عورت کے چیخنے کی آواز نے چارپائی پر لیٹے دادو کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ چیخ اتنی واضح اور اتنے قریب سے ابھری تھی کہ اس پر کسی طور واہمہ کا گماں نہیں ہو سکتا تھا۔ دادو اگلے ہی لمحے اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر اس نے قریب کی چارپائی پر بھتو کو بے سدھ خراٹے لیتے ہوئے دیکھا، پھر جدھر سے چیخ کی آواز ابھری تھی اس طرف کو چل دیا۔

معاً ایک بار پھر سناٹے میں وہی دردانگیز نسوانی چیخ برچھی کی طرح پیوست ہوتی چلی گئی۔ اس بار دادو کو آواز کی سمت کا درست اندازہ ہوا اور وہ فارم کی شکستہ عمارت کے عقبی حصے سے ہوتا ہوا سامنے کی طرف آ گیا۔ یہاں قد آدم جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پھر معاً دادو کی نظر سامنے خاردار احاطے کے گیٹ پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹھکا۔ وہ سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ تھی، بالکل ویسی ہی جیسی زمیندار اختیار علی کے پاس تھی۔ اس کی بتیاں گل تھیں، دادو اپنی جگہ دبک کر بہ غور نیم تاریکی میں ان چند تنومند ہیولوں کو دیکھنے لگا جنہوں نے ایک نازک اندام لڑکی کو پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے فارم کی عمارت کے احاطے کے اندر بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے جب کہ وہ کمزور لڑکی خود کو چھڑانے کی ناکام جستجو میں بری طرح مچل رہی تھی۔ دادو ان میں سے کسی کو بھی پہچان نہیں پا رہا تھا۔ نہ ہی اس کی یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اتنا تو وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ لڑکی کو کس مقصد کے تحت فارم کی عمارت کی جانب لے جا رہے تھے۔ ان ہیولوں کی تعداد اب واضح ہو چکی تھی، وہ تین افراد تھے۔ دادو انہیں پہچاننے کی غرض سے تھوڑا اور آگے کو سرکا پھر وہ جھکا جھکا چلتا ہوا عمارت کی شکستہ دیوار سے جا لگا۔ اس طرف عمارت کا داخلی دروازہ تھا اور ساتھ ہی ایک خالی کوٹھڑی نما کمرہ بھی بنا ہوا تھا۔ یہ کمرہ چوکیدار وغیرہ کے استعمال میں تھا مگر اس وقت وہ خالی تھا۔ ان تینوں کا رخ اس

سمت تھا۔ وہ اب قریب آ چکے تھے۔ دادو نے دیوار کی آڑ لے کر بہ غور انہیں دیکھا تو ان تینوں افراد میں سے ایک کو پہچان کر چونک پڑا۔ ''اڑے یہ تو کمدار مولا بخش ہے۔'' اس نے دبی دبی آواز میں خود کلامی کی۔ ان تینوں نے اب اس معصوم لڑکی کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھا رکھا تھا اس کا چہرہ خوف کے باعث بالکل سکڑ سا گیا تھا۔ وہ جیسے ہی چیخنے کی سعی کرتی تو کمدار مولا بخش فوراً اس کی گردن دبوچ لیتا...... جس کے باعث اس بے چاری کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ سی برآمد ہو کر رہ جاتی۔ وہ اب اس لڑکی کو چوکیدار والی کوٹھڑی کے اندر لے گئے تھے اب ان کے بدمست قہقہوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تب دادو کے کانوں میں ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ ''بس ڑی...... اب باٹھ کر...... تھوڑی دیر ہمارے ساتھ رہ۔ پھر تیرے ماں پیو کو چھوڑ دیں گے اور قرضہ بھی معاف ہو جائے گا......''

''نہیں...... مجھے چھوڑ دو...... تم کو اللہ سائیں کا واسطہ...... مجھ گریب پر یہ ظلم نہ کرو...... میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔'' اس معصوم لڑکی کی التجا دادو کی سماعت سے ٹکرائی اور دادو کو یوں لگا جیسے اس کے تن بدن میں آگ سلگ اٹھی ہو اور اسی آگ نے اسے ان شیطان صفت افراد کے چنگل سے اس معصوم لڑکی کو آزاد کرانے کے لئے فوری جارحانہ پیش قدمی پر مجبور کر ڈالا اور اگلے ہی لمحے دادو بجلی کی سرعت کے ساتھ آگے بڑھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا اور اندر رقص ابلیس شروع ہونے ہی والا تھا کہ دادو نے ایک زوردار غراہٹ اپنے حلق سے نکالتے ہوئے اپنی ٹانگ کی زوردار ضرب دروازے پر رسید کی دروازہ کیا تھا، محض دروازے کے نام پر ایک معمولی سا سالخوردہ دو پٹ ہی تو تھا...... جو ٹانگ کی ایک بھرپور ضرب سے اکھڑ کر اندر کی طرف جا گرا...... اندر مدہم سی پیلی روشنی میں وہ تینوں بھیڑیئے صفت انسان فوراً پلٹے اور پھر دادو پر نگاہ پڑتے ہی اسے خشمناک نظروں سے گھورنے لگے۔ ایسے میں کمدار مولا بخش نے دادو کو پہچانتے ہوئے کرخت لہجے میں اس سے کہا۔ ''اڑے چھوکرا! یہ کیا حرکت ہے...... تیری جرأت کیسے ہوئی اس طرح دروازہ توڑنے کی، ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی ہی معاندانہ چمک عود کر آئی تھی۔ ان کے قبضے میں پھنسی ہوئی وہ متوحش لڑکی بھی حیرت سے دادو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دادو نے یہ سوچے بغیر کہ وہ زمیندار



کے خاص آدمی مولا بخش کے سامنے کھڑا ہے، اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''کمدار سائیں! میں اپنے سامنے کسی معصوم، غریب چھوکری کے ساتھ ایسا ہوتا دیکھ نہیں سکتا۔ تیری مہربانی ہوگی وڈی...... تُو اسے چھوڑ دے......'' دادو نے اپنی بات ختم کی تو کمدار کے دو ڈشکروں میں سے ایک نے دادو کو غصیلے لہجے میں مخاطب کر کے کہا۔

''اڑے چھوکرا...... تو جانتا ہے ہم کس کے آدمی ہیں...... تیرے لئے چنگا یہی ہے کہ تو واپس چلا جا۔''

''ہرگز نہیں...... اس چھوکری کو تمہیں میرے حوالے کرنا ہوگا۔'' دادو نے یک دم بگڑ کر کہا۔ ادھر وہ لڑکی دادو کو اپنا نجات دہندہ پاتے ہی لجاجت سے رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ادا سائیں! مجھے ان بھیڑیوں سے بچا لو...... میں بہت گریب اور مجبور لڑکی ہوں۔''

''کمدار......!'' اس لڑکی کے گھائل جملوں نے دادو کے آتش جوش کو مزید بھڑکا دیا اور اس نے غضب ناک ہو کر گویا آخری بار کمدار مولا بخش کو للکارا۔

کمدار مولا بخش کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ زمیندار اختیار علی کے مصاحب خاص کمدار مولا بخش کو بھی اس کا ایک معمولی رہاک (مزارع) اس طرح للکار سکتا ہے۔ اس کے دونوں ساتھی اب لڑکی کو چھوڑ کر خونخوار انداز میں دادو کی جانب بڑھے۔

''ٹھہرو۔'' کمدار نے دادو پر اپنی سنساتی ہوئی نظریں گاڑھتے ہوئے اپنے دونوں ڈشکروں کو روکا اور پھر دادو کو سرسراتے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''چھوکرا! اڑیں حیثیت پہچان...... تُو ہمارا معمولی رہاک ہے۔ ان دونوں آدمیوں کو دیکھ غور سے۔'' اس کا اشارہ ان دونوں افراد کی طرف تھا جنہوں نے کچھ دیر پہلے متوحش لڑکی کو دبوچے ہوئے تھا۔ ''یہ دونوں اڑیں سائیں وڈے کے خاص مہمان ہیں...... سوچ لے، یہ ناراض ہو گئے تو سائیں وڈا تجھے چھوڑے گا نہیں۔''

''میں صرف رب (اللہ) سائیں کی ناراضگی سے ڈرتا ہوں اور کسی کی مجھے پروا نئیں۔ میں آخری بار بول رہا ہوں اس چھوکری کو عزت کے ساتھ چھوڑ دو ورنہ اچھا نئیں ہوگا۔'' دادو کے لہجے میں عجیب سی گھن گرج عود کر آئی۔ ایک معصوم اور مجبور لڑکی

جس نے دادو کو ادا سائیں کہہ کر پکارا تھا بس اس ایک لفظ "ادا سائیں" نے دادو کو ہر قسم کے نتائج سے یکسر بے پروا کر دیا تھا اور وہ لڑکی اب اسے ایک بہن کے روپ میں ہی نظر آنے لگی تھی۔

"کمدار لگتا ہے تو اس چھوکرے سے ڈرتا ......" معاً ان دونوں میں سے ایک نے کمدار مولا بخش کو مخاطب کیا۔ "تو اس چھوکری کو سنبھال ہم اس چھوکرے سے نمٹتے ہیں، جس نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈالا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے دادو پر چھلانگ لگا دی۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی بھی جارحانہ عزائم لئے دادو کی طرف بڑھا۔

❁❁❁

ڈینٹل سرجن ڈاکٹر عشرت نے پرویز نامی شخص کی تصویر دیکھ کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہی وہ شخص تھا جس نے کچھ عرصے پہلے اپنے لئے نقلی دانت بنوایا تھا۔

وہ دونوں اس وقت ایڈووکیٹ رانا الطاف کے چیمبر میں موجود چائے پی رہے تھے۔ کمال کے ڈیڈی اس وقت وہاں نہیں تھے اسی لئے کمال اپنے ڈیڈی کی بھاری بھر کم ریوالونگ چیئر سنبھالے جھول رہا تھا تاہم ان کی سیکرٹری نے بتا دیا تھا کہ رانا الطاف کچھ ہی دیر میں آ جائیں گے۔

"چلو بھئی اب اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ہمیں خورشید قتل کیس کے سلسلے میں جس شخص کی تلاش تھی وہ ہمیں مل گیا یعنی اس کا ٹھور ٹھکانہ مل گیا۔" کمال نے اپنی گھومتی ہوئی کرسی کو بریک دے کر سامنے بیٹھی سعدیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر سعدیہ نے قدرے متانت سے کہا۔ "پتہ تو لگ چکا ہے لیکن ابھی اس سے ملاقات باقی ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کی ہمیں چنداں ضرورت نہیں بلکہ ہمیں بذات خود اس سے ملنا بھی نہیں چاہئے۔" کمال کو بالآخر سنجیدگی اختیار کرنی پڑی۔

"کیوں؟" سعدیہ نے چونک کر کہا۔

"اس لئے محترمہ! کہ ہم ابھی خیر سے پورے جاسوس نہیں بنے ہیں، ایسا نہ ہو ہماری ملاقات کرنے سے وہ محتاط ہو جائے۔ پہلے ہی تم نے اس کی "بیگم صاحبہ" کو خاصا چونکا دیا تھا۔" کمال نے کہا۔



سعدیہ مبہم سے لہجے میں بولی۔ "تو پھر کیا کیا جائے؟"

"ڈیڈی کو آنے دو...... فی الحال اتنی کامیابی کو ہضم ہو جانے دو...... جلد بازی سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔" کمال نے جیسے مدبرانہ لہجے میں کہا۔

اثنائے راہ رانا الطاف بھی آ گئے۔ کمال نے پھرتی سے اپنے باپ کی کرسی چھوڑ کر سعدیہ کے قریب والی کرسی سنبھال لی اور رانا الطاف پُر شفقت مسکراہٹ لئے بریف کیس سنبھالے آہنی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ چند لمحوں بعد کمال اپنی ساری کارگزاری کی رپورٹ انہیں سنا چکا تھا۔ رانا الطاف نے بہ غور ساری بات سنی پھر اپنے سفاری سوٹ کی جیب سے پائپ نکال کر اسے میوزیکل لائٹر سے سلگانے لگے...... پھر ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں اُگلا، اس کے بعد سرمئی مرغولوں کی جانب تکتے ہوئے گہری متانت سے بولے۔ "بلاشبہ تم لوگوں کی کارگزاری لائق تحسین ہے۔ اس کیس میں تم دونوں کی ذاتی دلچسپی بے شک قابل ستائش ہے، میرا خیال ہے جو کام ہماری پولیس کو کرنا چاہئے تھا وہ تم نے انجام دے ڈالا...... یہ اچھا ہوا کہ تم نے براہ راست پرویز نامی مجرم سے ملاقات نہیں کی...... اور بالا بالا ہی اس کا کچا چٹھا جان لیا، اب میرا خیال ہے کہ پولیس کو انفارم کرنا چاہئے...... میرا مطلب ہے اس سے مدد لینی چاہئے۔"

انہوں نے اپنی گفتگو ختم کی تو کمال نے کہا۔ "لیکن ڈیڈی ہمیں پولیس پر اعتماد نہیں رہا، وکیل استغاثہ سے لے کر آئی او تک بے چارے معصوم لڑکے دادو کو مرغا بنا کر پھانسی کے پھندے پر چڑھانے کے لئے یکجا ہو چکے تھے...... یہ تو سعدیہ کی محنت اور ذہانت کی وجہ سے دادو بے چارہ ضمانت پر رہا ہو کر اس وقت اپنے گوٹھ کی کھلی فضا میں سانس لے رہا ہو گا۔" کمال نے اپنی بات ختم کی تو رانا الطاف نے الجھ کر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا، آخر ایسا کون سا گروہ ہے جو دادو جیسے معصوم کو بے گناہ تختہ دار پر چڑھانا چاہتا ہے۔" ان کی بات سن کر سعدیہ نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "میرا خیال ہے دادو جیسے سیدھے سادے شخص کو کسی سے دشمنی نہیں ہو سکتی اسے محض سوچی سمجھی سازش کے تحت قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ان کی دشمنی سیدھے خورشید احمد سے تھی اور اسے انہوں نے کسی خاص مقصد کے تحت قتل کروایا۔"

"ویٹس رائٹ......" کمال نے سعدیہ کی صراحت بھری گفتگو سن کر فوراً کہا۔

وکیل سعدیہ سعید کو اگرچہ شبہ تھا کہ مقتول خورشید احمد کے قتل کا منصوبہ کن لوگوں نے بنایا تھا، لیکن وہ سر دست اپنی رائے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ مقتول خورشید احمد کے گھر میں تلاشی کے دوران اسے مقتول کا سروس کارڈ ملا تھا، جس میں "عثمان ٹریڈرز" درج تھا۔ درحقیقت وہ موقع نکال کر تن تنہا اپنے طور پر "عثمان ٹریڈرز" کے دفتر جانے کا ارادہ رکھتی تھی جس کے لئے ایک مضبوط اور مربوط پلاننگ درکار تھی۔ سعدیہ کو "عثمان ٹریڈرز" کے سلسلے میں خود بھی کچھ ذاتی نوعیت کی معلومات درکار تھیں۔ ایڈووکیٹ رانا الطاف نے بہ غور سعدیہ کی بات سنی۔ پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم دونوں پولیس کے سلسلے میں اطمینان رکھو۔" ان کا لہجہ اچانک ہی پر اسرار ہو گیا تھا۔ سعدیہ اور کمال دونوں ان کی بات پر چونک کر ان کی طرف تکنے لگے۔ رانا الطاف نے ایک اور کش لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑی عجیب بات ہے اور شاید تم دونوں کو اس بات پر خوشی بھی ہو کہ انسپکٹر فیاض کا ڈسٹرکٹ آؤٹ تبادلہ ہو چکا ہے۔"

"واٹ....!" دونوں کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے انکل....؟ اسے تو خورشید قتل کیس کے سلسلے میں آئی او مقرر کیا گیا تھا۔" سعدیہ نے بے اختیار کہا تو رانا الطاف پر اسرار سی مسکراہٹ سے سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "کوئی بعید نہیں کہ اس میں بھی انہی لوگوں کا ہاتھ ہو جن سے وہ ہڈیاں لے کر چباتا ہو، اسے ضرور نا اہل قرار دے دیا گیا ہوگا، تمہاری کورٹ فائٹنگ نے اس سے غالباً ناک آؤٹ کر دیا ہوگا۔"

رانا الطاف کے لہجے میں سعدیہ کو مبہم سا شبہ ہونے لگا۔ تاہم وہ چپ رہی۔

"لیکن تم لوگوں کو اب زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ....." معاً رانا الطاف نے کمال اور سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ فیاض کی جگہ جو نیا انسپکٹر آیا ہے وہ میرے دوست کا ایک ہونہار اور ایمان دار بیٹا ہے۔"

"لیکن ڈیڈی! دادو کے کیس کا کیا ہوگا؟ میرا تو خیال ہے کہ اس طرح تو نہ صرف کیس خارج ہو جائے گا بلکہ دادو کی رہائی کے امکانات بھی واضح ہو جائیں گے۔" کمال نے تبصرہ کیا۔



"کریکٹ....." رانا الطاف نے بیٹے کی تائید کی اور کہا۔ "اور کوئی بعید نہیں ایک دو پیشیوں کے بعد جج صاحب اپنے ڈسکریشن پاور استعمال کرتے ہوئے اس کی رہائی کا حکم جاری کر دیں۔ میرا خیال ہے اب سعدیہ بیٹی کو دادو کے حق میں کیس لڑنے کی زیادہ آسانی ہو گی۔" آخری جملہ انہوں نے توصیفی انداز میں سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ "ویسے اگلی پیشی کب ہے، کوئی تاریخ لی ہے.....؟"

"انکل دراصل دادو بے چارہ بہت عرصے بعد اپنے گاؤں گیا ہے، اس کا گاؤں جامشورو کے نواح میں واقع ہے۔" سعدیہ نے بتایا۔ "ہم نے سوچا وہ ایک چکر اپنے گاؤں کا لگا آئے۔ اس لئے ہم نے اس کی بیماری کا جواز دیتے ہوئے ذرا....."

"نہیں، یہ بات اس کے حق میں نہیں جائے گی، تم لوگوں کو فوری طور پر تاریخ لے کر دادو کو حاضر کرنا ہوگا۔ اب کہیں جا کر تو اس کی رہائی کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔ میں بھی درون خانہ اس کوشش میں لگا ہوا ہوں۔"

"مگر ڈیڈی ہمیں تو دادو کے نہ گاؤں کا پتہ ہے نہ گھر کا....." کمال نے کہا اور وہ ہونقوں کی طرح سعدیہ کا چہرہ تکنے لگا۔ سعدیہ کے چہرے پر بھی تفکر چھا گیا تھا۔

"خیر یہ مسئلہ بھی دادو کی غیر موجودگی میں حل ہو جائے گا۔" لمحہ بھر خاموشی کے بعد رانا الطاف نے دونوں کو جیسے تسلی دی اور مزید بولے۔ "اب تم ایسا کرو کہ بے دھڑک نئے آئی او کو اعتماد میں لے کر آئندہ کی پیش رفت شروع کر ڈالو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اصل قاتل کی گردن تک گرفت اب آسان ہوتی جا رہی ہے۔"

❀❀❀

اس اندھیر نگری اور بوسیدہ بستی کی جھونپڑی کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں وہ رات اپنی تمام تر کرب ناکیوں کے ساتھ بھاری سِل کی طرح گزر رہی تھی۔ میں ننگے فرش پر درد کے مارے تڑپ رہی تھی اور کڑھ رہی تھی۔ سنا ہے اس حالت میں اللہ سے دعا مانگو تو وہ ضرور پوری ہو کر رہتی ہے۔ میرے کپکپاتے لبوں نے واثق علی کو بددعا دے ڈالی۔ "اے رب کریم! جس طرح واثق نے مجھے اس حال تک پہنچایا، مجھے بلکہ میری کوکھ سے جنم لینے والی ننھی اور بے قصور جان کو بھی ان کے حق سے محروم رکھا، اے میرے خدا بے شک تو انسانوں کے برے اعمالوں کی سزا دنیا ہی میں دے دیتا ہے....."

اور ایک انسان کو دوسرے انسان کے لئے عزرائیل بنا دیتا ہے...... میری دعا سن لے خدایا، میری کوکھ سے جنم لینے والی اولاد کو عزرائیل بنا دے اس شخص کے لئے...... جس نے ہم دونوں کو برے حالوں تک پہنچایا اور بے اماں کیا۔'' اور ٹھیک اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کو قرار آ گیا ہے پھر میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔

آنکھ کھلنے پر سدھوری کی مسرت انگیز آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میں صحن میں رلی بچھی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی جب کہ سدھوری میرے پائنتی بیٹھی ایک ننھے اور ہمکتے ہوئے وجود کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے چومے جا رہی تھی۔ میری آنکھیں کھلنے پر وہ دھیرے سے مسکراتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور ننھے منے وجود کو میری پیاسی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے بڑے رسان کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''ادی دیکھو تو سہی بالکل تمہاری طرح خوبصورت ہے...... تمہاری بچی۔ میں نے بہ مشکل گردن موڑ کر اپنی لخت جگر کو دیکھا۔ میری بچی واقعی بہت پیاری اور خوبصورت تھی۔ اثنائے راہ سدھوری کا باپ دھڑیں بخش اندر داخل ہوا...... میں نے دیکھا اس نے ایک بڑا سا ٹوکرا سر پر اٹھایا ہوا تھا جو ایک چمکیلے کاغذ سے ڈھکا ہوا تھا، اس کے جھریوں بھرے چہرے سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں جس نے مجھے ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ دھڑیں بخش سے ہم ماں بیٹی کا بھلا کیا تعلق تھا وہ یوں میری بچی کی پیدائش پر خوشیاں منا رہا تھا جیسے واقعی میں اس کی حقیقی بیٹی ہوں۔ اس نے فرش پر ٹوکرا رکھا، میرے قریب آیا اور خوشی کے اظہار میں بولا...... ''دھیئے! مبارکاں ہجن تیکوں...... اللہ سائیں نے تیری ہنج (گود) بھر دی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فوراً اپنی میلی کچیلی صدری کی جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر میری بچی کے سرہانے رکھ دیا۔

''بابا اس کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے کہا۔

''اڑی چپ کر تو، یہ نانو اور نواسی کا معاملہ ہے۔'' اس نے پیار سے مجھے جھڑکا...... جانے بابا کے لہجے میں ایسی کیا اپنائیت محسوس ہوئی کہ مجھے اپنی آنکھوں کے گوشے نمناک ہوتے محسوس ہوئے۔ بلاشبہ بابا کے لہجے میں حقیقی پیار کی جھلک موجود تھی۔ پھر وہ اپنی بیٹی سدھوری سے بولا۔ ''دھیئے! یہ لڈو آسے پاسے کے گھروں میں بانٹ دینا اور جو بھی یہاں آئے اسے بھی کھلا دینا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹوکرے کے اوپر سے



چمکیلی پنی سرکائی...... ایک لڈو اٹھایا اور میرے منہ کی طرف بڑھایا۔ ''لے کھا، سب سے پہلے تو منہ میٹھا کر......'' میں نے لیٹے لیٹے نصف لڈو منہ میں لے کر توڑا اور بابا نے دوسرا حصہ سدھوری کے منہ میں ڈال دیا۔

دن ماہ و سال بنے گزرتے رہے، میری بچی جس کا نام میں نے سعدیہ رکھا تھا اور پیار سے اسے منی کہتی، دو سال کی ہو گئی...... مجھے اب اپنی بچی کے مستقبل کے بارے میں فکر ستانے لگی تھی۔ حقیقتاً وہ ایک بڑے گھر کی چشم و چراغ تھی۔ اس کا مستقبل اس تنگ و تاریک بستی کی گلیوں میں رولنا نہیں چاہتی تھی جس کے لئے میں نے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ میں ہی نہیں بلکہ سدھوری اور اس کا باپ دھڑیں بخش کو بھی یہاں سے نکال کر کسی نسبتاً بہتر علاقے میں رہائش اختیار کرنا چاہتی تھی جس کا دبے دبے لفظوں میں بالآخر میں نے سدھوری کے باپ سے اظہار کر دیا۔ اسے میں بابا کہتی تھی۔ میری بات سن کر وہ چند ثانیے کے لیے کسی سوچ میں مستغرق ہو گئے تھے۔ میرے لئے ان کے بغیر یہ علاقہ چھوڑنا ممکن نہ تھا کیونکہ انہوں نے بہر حال آڑے وقتوں میں میرا ساتھ دیا تھا۔ میری بات پر بابا نے اتفاق تو کیا مگر جانے کیوں انہیں تامل سا ہو رہا تھا...... لہٰذا وہ بولے۔

''دھیئے! کہتی تو صحیح ہے۔ یہ تیرا حق ہے کہ تو جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے تیرے لئے یہ جگہ یہ علاقہ مناسب نہیں، پر ہمارے لئے یہ علاقہ یہ برادری چھوڑنا ذرا مشکل ہی ہے مگر پھر تیرے لئے سوچتا ہوں تو......'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو رہے ان کی جھریوں بھری پیشانی پر تفکر آمیز سلوٹیں مزید گہری ہو گئی تھیں۔

''بابا! برادری نے ہمیں دیا ہی کیا ہے......'' اس بار یکدم سدھوری اپنے بابا سے بولی۔ ''ادی وڈی! صحیح کہہ رہی ہے......''

''اچھا پھر ذرا صبر کر...... میں کچھ سوچوں گا......'' بابا نے مبہم سا جواب دیا۔ مگر مجھے تسلی نہ ہوئی۔ خود میرے لئے بھی ان لوگوں سے الگ ہونا ممکن نہ تھا۔ اس میں اخلاقی اور معاشرتی رکاوٹ بھی تھی لیکن ایک دن بابا نے مجھ سے اس معاملے میں تفصیلی گفتگو کر کے اپنی مجبوری بتا دی۔ وہ گرمیوں کا پسینہ ٹپکاتی دوپہر تھی...... سدھوری مائی وزیرن کے ساتھ پڑوس میں کہیں گئی ہوئی تھی، بابا شاید یہ بات اپنی بیٹی کے سامنے نہیں کرنا چاہتے

تھے۔انہوں نے مجھ سے سنجیدگی سے کہا۔

"دھیئے! مجھے اپڑیں گڑتی (فکر) نہیں، پر میں فکر مند تم لوگوں کی وجہ سے رہتا ہوں۔ میں اب اپنی عمر کی آخری گھڑیوں میں ہوں...... جانے کب میری آنکھ بند ہو جائے۔ پیچھے تم لوگوں کا کیا بنے گا...... یہاں کم از کم برادری تو ہے، سب رل مل کر رہتے ہیں اور دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام بھی آتے ہیں...... پتہ نہیں نئی جگہ، نیا علاقہ کیسا ہو۔ وہاں کے لوگوں کا کیا برتاؤ ہو۔ دھیئے تو سمجھ رہی ہے ناں میری بات۔"

معا بابا اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولے اور میں نے دھیرے سے پرسوچ انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔ مجھے ان کی بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ محلہ، یہ علاقہ اور اس بستی کے لوگ چاہے جیسے بھی تنگ دست ہو بدحال تھے...... مگر یہاں اکیلے پن کا احساس نہیں تھا...... کوئی بھی غمی خوشی ہوتی سب لوگ ایک زنجیر کی طرح اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ خود میری یہ آنکھوں دیکھی حقیقتیں تھیں کہ اس بستی میں کئی جوان بیوائیں اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے ساتھ تنہا رہا کرتی تھیں اور خود کو کبھی انہوں نے بے سہارا نہیں جانا تھا۔ بستی کی باقاعدہ پنچایت ہوتی تھی...... جس کا بڑا مکھ کہلاتا تھا۔ بہر طور بابا نے اپنے تئیں ہم دونوں یعنی میرے اور سدھوری کے تحفظ کی خاطر دور اندیشانہ بات سوچی تھی۔ اس لئے میں نے بھی سر دست چپ سادھ لی۔

میری بچی سعدیہ سدھوری کے تینوں بچوں، رمو، دلو، نینو کے ساتھ اپنی معصوم عمر کی منزلیں طے کرنے لگی۔ اس دوران ایک تلخ واقعہ رونما ہوا...... یہ وہ وقت تھا جب میں اور سدھوری اندر کوٹھڑی میں چارپائیوں پر بیٹھے رلیاں بنانے میں مصروف تھیں...... دوسرے کمرے میں منی سدھوری کے بچوں کے ساتھ کھیل میں مگن تھی۔ سدھوری کی بڑی بیٹی نینو جو چھ سال کی تھی وہ منی کا بڑا خیال رکھتی تھی اور منی بھی ہمیشہ اس کی گود میں رہتی تھی۔ بابا پانی کا مینگر لئے باہر گئے ہوئے تھے کہ اچانک باہر کسی نے بوسیدہ سے دروازے کے پٹ پر دستک دی۔

"اڑی نینو...... در (دروازہ) کھول جا کر۔" سدھوری نے وہیں سے اپنی بڑی بیٹی کو آواز لگائی۔ نینو فوراً دروازے کی طرف بھاگی۔

"تیری ماں کدھر ہے......؟" تھوڑی دیر بعد صحن میں کسی کی مردانہ آواز گونجی، لہجہ



حد درجہ اکھڑ مزاجی کی غمازی کر رہا تھا۔ میں چونکی...... لیکن سدھوری کا چہرہ اس آواز پر یک دم جیسے فق ہو کر رہ گیا اس کے زرد پڑتے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ اس مردانہ آواز کو پہچانتی تھی۔ کوئی تلخ حوالہ اس سے وابستہ محسوس ہوا۔ وہ یک دم رلی پھینک کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ یہاں کیوں آ گیا؟" یہ الفاظ اس نے خاصے متوحش انداز میں کہے تھے۔ پھر اس نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور کوٹھڑی سے باہر نکل گئی، میں حیران پریشان جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے مجھے باہر سے وہی تیز آواز سنائی دی۔ وہ سدھوری سے مخاطب تھا اور انداز تخاطب سے ظاہر ہوتا تھا جیسے سدھوری سے اس کا کوئی قریبی رشتہ ہو۔

"اڑی! چل میرے نال...... میں تیکوں لینے آیا ہوں۔"

جواباً پھر مجھے سدھوری کی آواز سنائی دی۔ "اتنے سالوں کے بعد کیسے ہمارا خیال آ گیا رے تیکوں...... جا تو، میں اپڑیں پیو کے پاس خوش آں۔"

میں نے محسوس کیا تھا کہ سدھوری کے لہجے میں خوف نام کا شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ ہو نہ ہو وہ شخص سدھوری کا شوہر ہے۔ اس لمحے دوبارہ اس کے شوہر کی آواز ابھری۔ دیکھ سدھوری! اپڑیں پیو کے گھر میں زیادہ نہ اکڑ، تیرا اصلی گھر یہ نہیں ہے، اب میں تیکوں خود لینے آیا ہوں تو تیرا دماغ ہو رہا ہے۔" اس بار لہجے میں شکوہ سا تھا۔ لیکن سدھوری نے پھر فیصلہ کن جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا ناں میں تیرے نال نہیں جا سکتی اور ویسے بھی بابا گھر پر نہیں ہے وہ آ جائے تو......"

"تو...... تو...... کیا...... ہیں...... بے عزت کرانا چاہتی ہے تو میکوں اپڑیں پیو سے۔" اچانک اس کے شوہر نے سدھوری کی بات کاٹتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر مزید بولا۔ "دیکھ سدھوری! میں خود تیکوں لینے آ گیا تو اس کا مطلب ہے بات ختم ہو گئی...... جھگڑا صاف ہو گیا، چل میرے نال...... آ، شاباش، اس بار اس کے لہجے میں مکاری عود کر آئی تھی۔ مجھ سے اب رہا نہ گیا اور میں اس دلچسپ ٹوک جھونک کا نظارہ کرنے کے لئے ذرا کھڑکی کی طرف سرک آئی...... جس کا رخ کھلے صحن کی طرف تھا۔ کھڑکی بند تھی اس کے پٹ کے درمیان کی متوازی جھری سے میں نے اپنی آنکھ لگا

دی۔ سامنے ہی مجھے سدھوری کا شوہر کھڑا نظر آیا...... بالکل اجڈ اور گنوار سا...... پہلی ہی نظر میں مجھے وہ چرسی محسوس ہوا...... دبلا پتلا جسم، آبنوسی رنگت جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں۔ خشخشی داڑھی اور اندر کو دھنسی ہوئی لال انگارہ آنکھیں اس کے ہر وقت نشے میں دھت رہنے کی غمازی کر رہی تھیں۔ اس وقت اس کے بشرے پر بلا کی ہٹ دھرمی پھیلی ہوئی تھی۔

سدھوری نے اس بار اپنے لہجے کو مزید سخت بناتے ہوئے کہا۔ ”تو نے اس سے پہلے بھی یہ ڈرامہ کیا بچل...... پہلے مجھے مار مار کر پیو کے گھر بھیجتا تھا اور لے جا کر پھر وہی کام شروع کر دیتا...... میں تجھے اب اچھی طرح جان گئی ہوں۔ نشئی آدمی کسی کام کا نہیں ہوتا۔ بہت ہو گیا بچل میں یہاں خوش ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے پھر...... تُو نہیں چلتی ہے تو نہ چل...... مگر میں اپنے بچوں کو ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ بچل نامی اس شخص نے گویا دھمکاتے ہوئے سدھوری سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی جارحانہ پن عود کر آیا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی بات پر بے چاری سدھوری کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اب مجھ سے یہ ”تماشا“ زیادہ دیر دیکھنا گوارا نہ ہو سکا اور میں اپنے سر پر چادر سنبھالتی ہوئی دھڑلے کے ساتھ کوٹھری سے باہر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر سدھوری کا شوہر بری طرح ٹھٹھک گیا اور گھورتی ہوئی نگاہوں سے مجھے تکنے لگا۔

”کیا ہوا سدھوری! کون ہے یہ؟“ میں نے سدھوری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”اوی...... تو اندر جا...... یہ میرا مرد (شوہر) ہے...... میں اس سے بات کر رہی ہوں۔“ سدھوری نے جیسے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اب یہ چھپانا ضروری نہیں سمجھا کہ ان میں ان دونوں کی باتیں سن چکی ہوں۔ لہٰذا میں نے تنک کر اس کے شوہر بچل کو مخاطب کر کے کہا۔ ”دیکھو بچل...... اس وقت گھر میں ہم عورتیں اکیلی ہیں اور اس کا باپ بھی گھر پر موجود نہیں ہے۔ تم باہر جا کر بابا کے آنے کا انتظار کرو، جاؤ یہاں سے۔“ میں نے اپنی بات ختم کی۔ بچل کا چہرہ ہنوز حیرت کی عکاسی کر رہا تھا۔ غالباً وہ اس بات پر متحیر تھا کہ میری جیسی ”وضع قطع“ والی خاتون باالفاظ دیگر ”بیگم صاحب“ یہاں کیا کر رہی ہے۔



میری بات پر وہ چونکا اور دوسرے ہی لمحے اس کے سیاہ رو چہرے پر سختی سی کھنڈ آئی اور وہ چند قدم میری جانب بڑھا پھر اوپر سے نیچے تک انتہائی بے ڈھنگے انداز میں دیکھتے ہوئے کھرکھراتی آواز میں بولا۔ ”اے مائی! تُو کون ہے......؟ یہاں کی تو نہیں لگتی تُو......؟“ اس کا طرز تخاطب اس کے حلیے کی طرح اور گنوار پنے کی غمازی کر رہا تھا، جو مجھے انتہائی برا لگا۔ مگر میرے بولنے سے پہلے ہی سدھوری آگے بڑھتے ہوئے بچل سے بولی۔

”دیکھ بچل......! منہ سنبھال کر بات کر، یہ میری بہن ہے تو نے جو بات کرنی ہے میرے پیو سے کرنا جا چلا جا اب......“

”بالکل نہیں میں اپنے بالکوں (بچوں) کو لے کر جاؤں گا تو پھر آپ ہی آ جائے گی......“ بچل نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور منہ اٹھا کر بچوں کو آواز دینے لگا۔ ”ڑے ولو، ڑے رمو، چلو میرے نال۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بچوں والے کمرے کی جانب بڑھا۔ سدھوری کا رنگ پیلا پڑ گیا، خود میں بھی پریشان سی ہو گئی، مجھے تو اس گنوار شخص سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا...... اب ایسے میں جب وہ جارحانہ عزائم پر اتر آیا تھا تو ہم عورتیں بھلا کیا کر سکتی تھیں، مگر بہر حال میں، جسے حالات و مصائب نے کندن بنا ڈالا تھا...... ایک دم بچل کے آگے آ کر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی...... ابھی شاید اس میں اتنی حیا باقی تھی کہ مجھے سامنے آتا دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے تاہم اس نے اپنی برماتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں...... سدھوری جو پہلے خاصی خوف زدہ نظر آ رہی تھی، میری جرأت دیکھ کر اسے بھی حوصلہ ہوا۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ جب بات ”بچوں“ کو ماں سے جدا کرنے کی ہو تو کمزور سے کمزور عورت بھی شیرنی بن جاتی ہے سدھوری نے یک دم بھاگ کر بچوں کی کوٹھری والا دروازہ بند کر دیا اور پٹ کے آگے دیوار بن کر اپنے دونوں بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ اندر موجود بچے بے چارے سہم کر شور مچانے لگے۔ مجھے اپنی منی (سعدیہ) کے بھی رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ جس نے مجھے بے چین سا کر دیا۔ لیکن میں اپنی جگہ سے ہلی نہیں اور بچل کے خونخوار چہرے پر نظریں جمائے جمائے بپھر کر دوبارہ اسے خبردار کرتے ہوئے بولی۔

”بچل! میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ ہم عورتوں سے زبردستی کر کے تو اچھا نہیں کر

رہا۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک دم دروازے پر بابا کھانستے ہوئے داخل ہوئے وہ بوڑھے سہی لیکن ایک "مرد" کی بروقت موجودگی نے ہمیں یک گونہ حوصلہ سا بخش دیا...... بابا، بچل کے عقب میں نمودار ہوئے تھے۔ بچل کی ان کی جانب پیٹھ ہونے کی وجہ سے بچل کو ان کے آنے کا پتہ چلا اور نہ ہی بابا اپنے داماد بچل کو پہچان پائے۔ البتہ ایک اجنبی کو اتنے دھڑلے سے اپنے گھر میں دیکھ کر ششدر سا رہ گیا۔

"بابا! اچھا ہوا تُو آ گیا...... یہ...... یہ...... بچل میرے بچے مجھ سے چھین رہا ہے۔" باپ کو دیکھتے ہی سدھوری زور سے چلائی اور تب بچل بھی چونک کر اپنے عقب میں گھوما۔ بابا اور بچل کی نظریں چار ہوئیں۔ بابا جو کچھ دیر پہلے اپنے گھر کا حیران کن نقشہ دیکھ کر خاصے پریشان سے ہو گئے تھے...... مگر اپنے داماد کو اور وہ بھی ایسی حالت میں دیکھ کر کہ میں نے اس کا راستہ روکا ہوا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

"اڑے...... تُو نے یہاں آنے کی جرأت کس طرح کی......؟" بابا کا لہجہ حد درجہ غصیلا تھا۔

"میں اپنی زال (بیوی) اور بچے لینے آیا ہوں۔" بچل نے جواباً ڈھٹائی سے کہا۔

"واہ ڑے...... صدقے ونجاں......! اتنے دنوں کے بعد کس طرح تجھے اپنے بچوں کی یاد آ گئی۔ سب سمجھتا ہوں تیری چالاکی...... نشہ نہیں مل رہا ہو گا نا...... عادت جو تجھے پڑ گئی تھی عورت کی کمائی کھانے کی، ہیں...... نکھٹو......" بابا نے گھورتے ہوئے اسے کہا۔ ان کے لہجے میں حد درجہ استہزا ابھرا ہوا تھا۔

بچل دوبارہ تن کر بولا۔ "کام پر لگ گیا ہوں میں...... مجدوری کرتا ہوں...... روپیہ دھاڑی ملتی ہے مجھ کو......"

"جانتا ہوں سب اچھی طرح سے تیری اس سو روپے کی دیہاڑی کو میں......" بابا نے جیسے اس کی چالاکی کو بھانپتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تو کیا مجدوری کرے گا چرس اور بھنگ پینے سے تو تجھے پہلے فرصت مل جائے۔"

بابا کی بات پر بچل ذرا خاموش ہو رہا۔ اس کے چہرے کے رنگ گرگٹ کی طرح بدلتے محسوس ہونے لگے۔ اب اس کی اکھڑ مزاجی اور ہٹ دھری ہوا ہونے لگی اور فوراً منت سماجت پر اتر آیا اور اس بار اپنی بیوی سدھوری کی طرف چند قدم اٹھا



ہوئے اس سے بولا۔ "دیکھ ڑی سدھوری! میں کوڑ (جھوٹ) نہیں کہہ رہا...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں روزانہ پورے سو روپے کماتا ہوں۔ میں نے سوچا بال بچوں کے بنا کمانے کا کیا فائدہ......؟ پھر میں نے فیصلہ کیا تمہیں اپنے گھر لے جاؤں، یقین کر لے میری بات کا سدھوری......"

میں نے غور کیا۔ بچل کی ان باتوں نے سدھوری پر خاطر خواہ اثر ڈالا کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کے سانولے چہرے پر اپنے شوہر کے لئے ذرا نرم سے تاثرات ابھرے تھے۔ اور وہ اپنے باپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہ رہی ہو۔ مگر میں نے دیکھا بابا کا چہرہ سپاٹ تھا لہٰذا وہ اسی لہجے میں بچل سے بولے۔

"بچل! جا پھر...... پہلے اپڑاں ٹھور ٹھکانہ بنا...... اپنے لوفر قسم کے یاروں کا وہ اڈا چھوڑ جدھر تُو میری بیٹی کو لے جا کر رکھتا ہے...... پھر کچھ سوچیں گے۔"

"ٹھیک ہے پھر..." اس بار جیسے بچل کو بھی غصہ آ گیا اور وہ بھبھک کر بولا۔ "میں جا رہا ہوں اب برادری والوں کے ساتھ ہی آؤں گا اور صرف اپڑیں تینوں بچوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اپڑیں دھی نوں رکھ بڈھا یہاں...." یہ کہتے ہوئے وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بابا کافی دیر تک غصے سے بڑبڑاتے رہے۔ میں نے پہلی مرتبہ سدھوری جیسی ہنس مکھ لڑکی کو رنجیدہ دیکھا۔ وہ کمرے میں آ کر مجھ سے لپٹ گئی اور لگی زار و قطار آنسو بہانے۔ میں اسے تسلی دینے کے سوا بھلا اور کیا دے سکتی تھی۔

ظہر کی روح پرور اذان کی آواز پر آمنہ بیگم اپنے ہاتھوں میں پکڑی فیروزی رنگ کی ڈائری پڑھتے ہوئے چونکی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے ماضی کی تلخ یادوں کو اپنے دل و دماغ سے جھٹکا اور وضو کرنے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"سعدیہ بیٹی آ گئی۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی بیرونی دروازہ کھولنے کے لئے بڑھ گئیں۔

۞۞۞

کمدار مولا بخش کے پہلے ساتھی نے جنگلی جانور کی طرح غراتے ہوئے دادو پر چھلانگ لگائی اور اسے اپنے ساتھ ہی رگیدتا ہوا لے گیا۔ مگر دادو نے موقع سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے پوری قوت سے اسے پرے اچھال دیا۔ اسی اثناء میں جو دوسرا حملہ آور دادو پر چڑھ کر آ رہا تھا وہ اپنے ساتھی کے فضا میں اڑتے ہوئے وجود سے ٹکرا گیا اور دونوں ہی زمین بوس ہو گئے۔ وہ لڑکی بے چاری حیران پریشان ایک کونے میں دبکی یہ سارا کھیل دیکھ رہی تھی۔ دادو نے اپنی جگہ سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور کوٹھڑی کا چوکھٹا پار کر کے باہر آ گیا۔ جدھر وہ دونوں مضروب حملہ آور اپنے زخموں کو چاٹتے غراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ڈیل ڈول میں دادو سے دبتے ہوئے تھے۔
کمدار اپنے دونوں "مہمان" ساتھیوں کے حشر پر تلملا اٹھا تھا اور دھمکانے کی غرض سے دادو سے بولا۔

"اڑے چھوکرا...... اپڑیں حیثیت پہچان...... رک جا...... ورنہ سائیں وڈا......"

"اڑے بس کر تُو...... اپنی بیٹیوں جیسی غریب مسکین چھوکریوں کی دلالی کرتا ہے شرم نہیں آتی تجھے۔" دادو اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے بولا۔

پھر وہ دونوں حملہ آور بیک وقت دوبارہ دادو پر جھپٹے...... لیکن دادو کے روم روم میں اس وقت جوش غیرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ وہ بھلا سپر ڈالنے والا کہاں تھا لہٰذا جیسے ہی وہ دونوں اس کے قریب پہنچے اس نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے جبڑے پر اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا جڑ دیا اور چاہتا تھا کہ اگلا وار دوسرے حملہ آور پر کرے...... لیکن اس کا اسے موقع نہ مل سکا...... کیونکہ اس نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھتے ہوئے کمال پھرتی سے جھکائی دیتا ہوا کبڈی کے سے انداز میں دادو کو قابو میں کر لیا۔ دادو نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اندازہ لگا لیا کہ اگر اس کا ذرا بھی پاؤں رپٹا تو مد مقابل نہ صرف پوری طرح اس پر حاوی ہو جائے گا بلکہ اسے بری طرح سے پچھاڑ کر رکھ دے گا۔ لہٰذا اس نے مضبوطی سے اپنے پیر زمین پر جمائے رکھے جبکہ مد مقابل کی پوری کوشش تھی کہ وہ دادو کے قدم اکھاڑ ڈالے۔ رات کی ٹمٹماتی تاریکی میں بھربھری مٹی والی زمین پر دونوں کے ہیولے کسی موٹے ستون کی طرح ایک ہی جگہ پر گڑھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ دادو اپنے مد مقابل کے شکنجے میں خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگا۔ ادھر دوسرا حملہ آور بھی اس کے قریب پہنچ کر اس پر حملہ کرنے کے پر تول رہا تھا۔ دادو نے اپنی قوت ایک بار پھر مجتمع کی اور کبڈی کے اس "خطرناک" داؤ سے



نکلنے کے لئے اس نے ایک "توڑ" آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اس میں شکست کے امکانات زیادہ تھے۔ ذرا سی بھی اندازے کی غلطی مد مقابل کو نہ صرف خود پر حاوی کر سکتی تھی بلکہ اچھا خاصا زخمی بھی کر سکتی تھی۔ مگر دادو نے کمال ہوشیاری سے یہ داؤ کھیلتے ہوئے اپنے دونوں پیروں کی مدد سے ہلکا سا جھٹکا لیا اور پھر مد مقابل کی قینچی کی طرح دونوں کھلی ہوئی ٹانگوں کے بیچ خلاء میں اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر سیدھی کر لیں۔ نتیجتاً دادو کے جسم کے وزن پر مد مقابل رکوع کے بل ذرا جھک سا گیا اور یہی دادو چاہتا تھا لہٰذا اس نے پوری قوت سے اپنی دائیں ٹانگ کے گھٹنے کا بھرپور وار حملہ آور پر کیا اور اگلے ہی لمحے رات کے سناٹے میں حملہ آور کے حلق سے برآمد ہونے والی کرب ناک چیخ خاصی دور تک گونجتی چلی گئی اور شدت تکلیف سے وہ بھربھری مٹی والی زمین پر ڈھتا چلا گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

اپنے ساتھی کو جاں کنی کے عالم میں دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی عالم جنون میں چیختا ہوا اس کی جانب بڑھا مگر دادو پر بھی خون سوار تھا لہٰذا اس نے ایک مکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ ادھر کمدار نے جو اپنے مہمانوں کی درگت بنتے دیکھی تو ایک بار پھر غصے سے چیختے ہوئے دادو کو للکارا۔

"اڑے بس کر دے چھوکرے... کیوں اپنی موت کو آواز دے رہا ہے۔ غریب کا بچہ ہے ڑے تُو۔ مر جائے گا سائیں وڈے کے ہاتھوں۔" ابھی اس نے اتنی ہی دھمکی دی تھی کہ اچانک ایک آواز پر وہ لوگ چونک پڑے۔ وہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔

وہ سب آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ ٹمٹماتی تاریکی میں وہ کوئی جیپ ہی تھی جو فارم کے احاطے میں داخل ہو کر ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں اور پھر جیسے ہی وہ جیپ ان کے سامنے پہنچی تو اچانک اس کی صرف ایک بتی روشن ہو گئی۔ وہ سب روشنی کے سیلاب میں نہا سے گئے۔ انہیں ایک لمحے کو یوں لگا جیسے کوئی پر اسرار مخلوق اچانک ان کے آگے آ کر اپنی آنکھ کھولے گھور رہی ہو...... رات دور تک ویران اور سنسان تھی۔

۞۞۞

رات کی تاریکی میں اچانک نمودار ہونے والی جیپ کی اکلوتی ہیڈ لائٹ ہنوز روشن تھی۔ جس کی شدت سے انہیں اپنی آنکھوں میں چبھن کا سا احساس ہونے لگا...... پھر ہیڈ لائٹ آف ہوتے ہی جیپ کا گھر گھراتا ہوا انجن بھی بند ہو گیا...... ایک بار پھر تاریک رات میں چیختا ہوا سناٹا چھا گیا۔ کمدار مولا بخش سمیت دادو بھی اب اس جیپ کو پہچان چکے تھے۔ وہ جیپ زمیندار اختیار علی کی تھی جو اپنے چند حواریوں کے ساتھ جیپ سے اتر آیا تھا۔ اس نے جیپ کے اندر موجود ڈرائیور کو مخصوص اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے اشارہ سمجھتے ہی اس بار پاور لائٹ کی بجائے ہلکے پاور کی ہیڈ لائٹ روشن کر دیں۔ پھر وہ آگے بڑھا اس کے چہرے پر حیرت اور کافی حد تک برہمی کے آثار تھے۔ اس کی نگاہیں، ایک جانب زمین بوس ہوئے اپنے مہمان پر پڑیں تو وہ صورتحال سمجھنے کی سعی کرتا ہوا سامنے کھڑے کمدار سے چبھتے ہوئے لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”اڑے کمدار...... یہ کیا ملا کھڑا ہو رہا ہے یہاں...... یہ خان محمد کو کس نے پھٹی (زخمی) کیا......؟“

”سائیں وڈا...... قہر ہو گیا، اڑاں خسیس (کمتر) چھوکرا...... اس نے ہی آپ کے مہمان کو پھٹی (زخمی) کیا ہے سائیں۔“ کمدار مولا بخش نے زمیندار اختیار علی سے کہا اور تب زمیندار نے قریب ہی کھڑے دادو کے چہرے کی طرف قہر بار نظروں سے گھورا۔ ”کیوں ڑے چھوڑا! میرے مہمان کو کیوں زخمی کیا تو نے؟“ زمیندار نے درشت لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہا تو دادو ذرا بھی اس کے لہجے سے مرعوب نہیں ہوا۔ وہ بلا تامل بولا۔ ”سائیں یہ لوگ کسی کی معصوم چھوکری کو اٹھا کر یہاں لائے تھے اور اس کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے۔“ دادو کی بات سن کر زمیندار اختیار علی ایک لمحے کو چونکا اس کے چہرے سے اب درشتی عنقا ہونے لگی۔ اس نے ایک نظر اپنے کمدار کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور پھر زمیندار کے چہرے پر ایک رنگ سا آ



کر ٹھہر گیا...... اثنائے راہ کوٹھڑی سے وہ مجبور و بے کس لڑکی بھی باہر نکل آئی تھی۔ اس کی حالت زار بتا رہی تھی کہ دادو نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ خوف سے سکڑی سمٹی دادو کے قریب آ کر رونے لگی۔ زمیندار نے فوراً آگے بڑھ کر اس پر اپنی اجرک اتار کر ڈال دی۔ پھر کمدار اور اس کے ہمراہ کھڑے مہمان سے غصیلے لہجے میں بولا۔

”اڑے لخ لعنت ہو تم پر...... اپنے گوٹھ کی چھوکری کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی...... چلو، اٹھاؤ خانو کو جیپ میں ڈالو، میں تم لوگوں سے اوطاق میں جا کر نمٹتا ہوں۔“ اتنا کہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر اس الم نصیب لڑکی کے سر پر ازراہ شفقت ہاتھ دھرا اور ملائمت سے بولا۔ ”تو میری دھی وانگر ہے، چل...... میں خود تیکوں تیرے گھر چھوڑ آؤں بیٹھ جیپ میں......“ یہ کہتے ہوئے زمیندار رُکا تو نہیں اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

اس لڑکی نے ایک نگاہ دادو پر ڈالی۔ دادو نے محسوس کیا اس لڑکی کی نگاہوں میں اظہار تشکر کے جذبات کے ساتھ ایک تذبذب کی کیفیت بھی نمایاں تھی۔ تاہم دادو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی اور زمیندار کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ سب لوگ جا چکے تھے۔

دادو چند ثانیے وہاں تاروں بھری ٹمٹماتی تاریکی میں کھڑا رہا۔ پھر واپس فارم کے بیرونی احاطے سے ہوتا ہوا اپنے لکڑی کے کیبن کے باہر پڑی کھاٹ پر آ گیا۔ دوسری کھاٹ پر پھتو موالی بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا...... اس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں کیا ہو چکا ہے۔ دادو اپنی چارپائی پر دھم سے گر گیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی دو بدو لڑائی نے اس کے جسم میں درد پیدا کر دیا تھا۔ نیند اس کی اڑ چکی تھی۔ اسے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی...... حالانکہ وہ پیتا نہیں تھا سگریٹ۔ لیکن پھتو موالی کے ساتھ رہتے ہوئے اسے بھی سگریٹ کی علت لگ چکی تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک گہرا کش لیتے ہوئے پہلو کے بل نیم دراز سا ہو گیا۔ اسے رہ رہ کر اس معصوم لڑکی کا خیال آ رہا تھا، جو بے چاری جانے کس طرح ان بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ تاہم اسے اندازہ تھا کہ وہ گوٹھ ہی کی رہنے والی تھی...... لیکن وہ کس کی بیٹی تھی، یہ اسے معلوم نہ تھا۔ پھر اس نے زمیندار کے بارے

میں بھی توصیفی انداز میں سوچا کہ وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا کہ وہ اسے سمجھتا تھا...... ورنہ
کمدار مولا بخش جس طرح بار بار زمیندار اختیار علی کے عتاب سے ڈرا رہا تھا اس سے
دادو واقعی ایک لمحے کو دل میں پریشان ضرور ہوگیا تھا۔ مگر زمیندار کے عین وقت پر پہنچنے
اور الٹا اپنے ہی کمدار اور مہمانوں کو بری طرح جھڑکنے پر دادو نے اطمینان کی ایک
ٹھنڈی سانس لی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب وہ معصوم لڑکی زمیندار کے پاس محفوظ تھی اور
خیریت و عافیت سے اپنے گھر بھی پہنچ جائے گی اور یہی وہ لمحہ تھا جب پتہ نہیں
کیوں...... دادو کو اپنے اندر ایک کسک، ایک پچھتاوے کا احساس ہونے لگا جسے وہ
سردست کوئی نام نہ دے سکا...... یہ کسک بے وجہ نہ تھی...... مگر دادو کی سمجھ میں نہیں آرہا
تھا کہ اچانک کیوں وہ اپنے اندر بے چینی محسوس کر رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے ذہن
سے خیالات کو جھٹکا اور اگلے دن گوٹھ جا کر زمیندار سے ملنے کے بارے میں سوچنے
لگا۔ اس کا ارادہ اختیار علی کی اوطاق پہنچ کر کچھ دنوں کی چھٹی لینے کا تھا۔ تا کہ شہر جا کر
شائلہ اور وکیل سعدیہ وغیرہ سے ملاقات کر سکے اور اپنے کیس اور حاضری کے سلسلے میں
بھی آگاہی ہو۔ پھر نجانے کب دادو پر نیند کی دیوی مہربان ہوئی اور وہ سو گیا۔

❁❁❁

اگلے دن اس نے قیدی ہاریوں کو زمینوں پر چھوڑا اور سیدھا زمیندار کی اوطاق
پہنچا۔ کمدار مولا بخش بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کی جانب گھور کر دیکھ رہا تھا۔ دادو کو
جانے کیوں اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں کینہ اور عجیب سا غرور نظر آیا۔ زمیندار
اختیار علی سامنے مونڈھے پر براجمان تھا۔ چند ایک ہاری بھی دائیں بائیں پختہ اینٹوں
کے فرش پر پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ دادو نے آگے بڑھ کر روایتی انداز میں اپنے
دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور بولا۔ ’’سائیں! مجھے کچھ دنوں کی موکل (چھٹی) چاہئے۔
شہر جانا چاہتا ہوں۔‘‘
دادو کی بات سن کر اختیار علی ذرا چونک کر اسے گھورنے لگا۔ پھر اپنی گھنی مونچھوں کو
مروڑتے ہوئے گونج دار لہجے میں بولا۔ ’’کیوں ڑے چھوکرا...! شہر میں تیرا کون ہے؟‘‘
’’سائیں! بس کام ہے ایک ضروری۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا...... بس یہی کوئی دو
تین دن۔‘‘ دادو نے التجائیہ انداز میں زمیندار اختیار علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس



کی بات سن کر زمیندار چند ثانیے کے لئے خاموش ہوگیا۔ دادو نے لوہا گرم جانتے
ہوئے دوبارہ کہا۔ ’’سائیں! وڈی مہربانی ہوگی۔ مجھے شہر جانے کی اجازت دے دو۔
میں...... میں آپ کے لئے شہر کی بڑی مشہور سوغات بھی لاؤں گا ساتھ۔‘‘
’’اچھا بابا چنگا...... جا اب...... لیکن اس پھتو موالی کو ہوشیار کر جانا کہ ان قیدیوں کی
کڑی نگرانی کرے۔‘‘ زمیندار نے کہا تو دادو جھٹ بولا۔
’’ہا سائیں، ہا...... میں کہہ جاؤں گا اس کو......‘‘
دادو نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں ایک مفلوک الحال بوڑھا ’’قہر تھی
ویو، پہر تھی ویو، (ظلم ہوگیا، غضب ہوگیا) سائیں میں لٹ گیا، برباد ہوگیا......‘‘ کی
داد فریاد کرتا زمیندار اختیار علی کے آگے گر گیا۔
’’اڑے بابا! کیا ہوگیا تجھے...... کچھ تو بول......‘‘ زمیندار نے ذرا بلند آواز سے
پوچھا۔ دادو بھی چونک کر روتے دھوتے بوڑھے کی جانب دیکھنے لگا۔
’’سائیں...... میڈھی دھی فاطمہ...... کل سے غائب ہے۔ سارا گوٹھ چھان لیا، اس کا
کہیں پتہ نہیں سائیں...... اسے ڈھونڈ دو سائیں...... تیری وڈی مہربانی ہوگی مجھ غریب
پر...... ہائے میڈھی دی......‘‘ وہ نالہ وشیون کے دوران زار و قطار رونے بیٹھ گیا۔
دادو اس کی بات پر پریشان سا ہوگیا...... ادھر زمیندار نے فوراً کڑک دار لہجے میں
دادو کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’اڑے چھورا! تو جا اب یہاں سے...... تیرے کو چھٹی ہے۔‘‘
دادو کا دل تو چاہا کہ وہ اس بوڑھے کی فریاد پوری ہونے تک وہاں موجود رہے مگر
زمیندار اختیار علی کا حکم وہ ٹال نہ سکا اور اوطاق سے اپنے گھر لوٹ آیا۔ وہ اس وقت
لاری پکڑ کر کراچی پہنچنا چاہتا تھا۔

❁❁❁

آمنہ بیگم پر آج پھر قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔ ان کی بیٹی وکیل سعدیہ سعید خورشید قتل
کیس میں اتنی مصروف ہوگئی تھی کہ اب سہ پہر ہی کو گھر لوٹتی تھی۔ ایسے میں آمنہ بیگم کو
اپنی ڈائری پڑھنے کا خاصا وقت مل جاتا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا اور فجر کی نماز کے بعد ذرا
قیلولہ کر کے اپنی ڈائری کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔
’’سدھوری کا شوہر بچل لڑ کر جب سے گیا تھا...... وہ بے چاری پریشان اور بے

چین سی رہنے لگی تھی۔ اگر چہ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ اگر بجل واقعی راہ راست پر آ چکا تھا اور اپنے ہاتھوں سے مزدوری بھی کرنے لگا تھا تو سدھوری کو اس کے ساتھ جا کر رہنا چاہئے تھا...... لیکن بہر طور...... ابھی اس ضمن میں کچھ باتوں کا کھوج لگانا ضروری تھا کہ آیا بجل اپنے کنبے کے مطابق واقعی محنت مزدوری کرنے لگا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ کیا وہ نشے وغیرہ سے بھی تائب ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے بابا اور سدھوری سے بات کی کہ ان دونوں مذکورہ باتوں کے تحت اگر مشروط طریقے سے سدھوری کو اپنے شوہر بجل کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے تو یہ بہر حال ایک اچھی اور مفید بات ہو سکتی تھی۔ خود سدھوری کے لئے بھی...... کیونکہ آخر کار ایک شادی شدہ بیٹی کا اصل گھر اس کے شوہر کا ہی ہوتا ہے نہ کہ باپ کا...... میری باتوں سے سدھوری تو بے چاری متفق ہو گئی تھی۔ مگر بابا کو ہنوز اس سلسلے میں تامل تھا۔

''بیٹی آمنہ! بجل کی مثال کتے کی دم جیسی ہے۔'' بابا نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''جس طرح کتے کی دُم کو سیدھا کرنے کے لئے حقے کی ''نے'' میں ڈال دو اور پچاس سال بعد بھی نکالو تو وہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح بجل بھی......''

''نہیں بابا......'' میں نے ان کی بات کاٹی، ایک انسان اور جانور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بجل کو ایک موقع اور دے دینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے بیوی بچوں سے دور رہنے پر اسے اچھا خاصا سبق مل گیا ہو اور ویسے بھی بابا تم خود سوچو...... سدھوری کا اصل گھر تو وہی ہے۔ وہ ساری عمر تو تمہارے پاس نہیں رہ سکتی ناں......'' میں نے اشارے کنائے میں بابا کو ایک اٹل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا۔

میری بات سن کر لمحہ بھر کو ان کے چہرے پر سلوٹیں ابھریں پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے گویا ہار مان کر بولے۔ ''ٹھیک ہے دھیئے! تو کہتی ہے تو مانے لیتا ہوں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے بابا! ہم خود سدھوری کو بجل کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔ اس طرح بجل بھی خوش ہو جائے گا......'' میں نے کہا اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔

سدھوری دوسری کوٹھڑی کے دروازے سے لگی ہماری باتیں سن رہی تھی...... جس سے اس کے سانولے چہرے پر خوشی کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ میری بات سن کر بہت خوش تھی۔



پھر اگلے دن ہم سب ساتھ ہی نکلے تھے...... بابا نے ہم سب کو اپنے پانی کے ٹینکر کے کیبن میں سوار کرا لیا تھا۔ بجل کا گھر لانڈھی میں واقع ایک کالونی کی گلی میں تھا۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد ہم ملیر سے لانڈھی پہنچنے پر بجل کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے...... دروازہ بجل نے ہی کھولا تھا۔ وہ اتفاق سے گھر پر اکیلا ہی تھا...... وہ ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن والا نیم پختہ سا گھر تھا۔ گھر کی ابتر حالت بتا رہی تھی کہ یہاں عرصے سے خاتون خانہ کا گزر نہیں ہوا۔

بہر طور بجل ہمیں دیکھ کر خوش ہو گیا اور بڑی عزت اور احترام سے پیش آیا۔ ہم سب اندر کمرے میں بچھی دو جھلنگا سی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

پھر جب وہ بھاگم بھاگ باہر سے بسکٹ وغیرہ لے کر آیا تو سدھوری نے قدرے لجاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''ڑے بجل! چائے میں بناؤں گی......'' یہ کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے بجل کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک خاص رنگ سا اتر آیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے یہ دونوں میاں بیوی معصوم سے لگے۔ قصہ کوتاہ...... میں اور بابا، سدھوری کو اس کے تینوں بچوں سمیت وہاں چھوڑ کر آ گئے۔ آتے آتے مجھے سدھوری نے بڑے راز سے بابا کا خیال رکھنے کی ایک معصومانہ انکسار آمیز تاکید کی۔

سدھوری اور اس کے بچوں کے جاتے ہی اس اندھیری بستی کا یہ جھونپڑا نما گھر مجھے اب کاٹنے کو دوڑتا۔ سدھوری کے جاتے ہی ایک اداسی اور ناقابل بیان سی بے چینی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ بابا تو صبح کو نکلتے اور شام گئے لوٹتے تھے۔ زندگی اچانک پہلے سے زیادہ بے کیف و گھٹی گھٹی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میری منی (سعدیہ) بھی بے چاری تینوں بچوں رمو، دلو اور نینو کے جانے کے بعد اداس اداس رہنے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت صابر بچی تھی حالانکہ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ورنہ اتنی عمر میں بچہ اچانک اداسی اور بے رونقی محسوس کر کے خاصا چڑچڑا اور روہانسا ہونے لگتا ہے لیکن منی بے چاری خاموشی سے ایک کونے میں بچھی کھجی کی چٹائی پر گڑیوں سے بیٹھی کھیلتی رہتی تھی۔ تاہم وہ اکثر مجھ سے معصومیت سے رمو اور دلو وغیرہ کے بارے میں استفسار بھی کرتی تھی...... ''امی! نینو باجی اور رمو بھائی اب کبھی ہمارے گھر نہیں آئیں گے؟'' اس کے

تتلاتے لہجے میں بلا کی معصومیت اور اداسی ٹپک رہی تھی۔ میں نے پیار سے جواباً مسکرا کر کہا۔

"میری جان! وہ کوئی ہمیشہ کے لئے تھوڑا ہی گئے ہیں..... آتے جاتے رہیں گے بلکہ ہم بھی کبھی کبھار مل آیا کریں گے جا کر....."

"امی..... باجی نینو اور بھائی لوگ اپنے ابو کے گھر گئے ہیں ناں.....؟" اس نے پھر معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی.....!" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"امی..... مجھے بھی اپنے ابو کے گھر لے چلیں۔ میرے ابو کہاں ہیں؟"

منی کی بات سن کر اچانک مجھے جھٹکا لگا..... ایک چھناکا میرے اندر ہوا۔ کسی تلخ حقیقت کے اچانک ہی آشکارا ہونے کی اذیت نے میرے دل و دماغ کے خوابیدہ آتش فشاں میں ایک چنگاری نما ٹیس سی جگا دی تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میری آنکھوں میں منی کی بات سن کر یکایک آنسو اُمڈ پڑے..... "یہ تُو نے کیا پوچھ لیا منی؟" ٹیس زدہ اور غم آگیں دل سے یہ الفاظ پھسل کر نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار میرے لبوں پر آ گئے۔

"امی! میں نے آپ کا دل دُکھایا..... اب کبھی میں ابو کے بارے میں آپ سے نہیں پوچھوں گی۔" اس کے معصوم دل نے گویا ممتا کی تکلیف بھانپ لی تھی۔ میں نے بے اختیار فرطِ جذبات سے منی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ ان کٹھن حالات نے میری بچی کے ننھے ذہن کو وقت سے پہلے کندن بنا ڈالا ہے۔ اس کی شخصیت کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہونے والا تھا اس کے احساس کی کونپلیں پھوٹنا شروع ہو چکی تھیں۔ "کیا.....؟ کیوں.....؟ اور کیسے.....؟" والی تکرار کو خاطر خواہ جواب میسر نہ آئیں تو یہیں سے بچے کی شخصیت کے اندر نفسیاتی پیچیدگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بس اس دن کے بعد سے میں نے فیصلہ کیا کہ منی کو زیادہ تنہا نہیں رہنے دوں گی اور اپنے معمولات میں تبدیلی لاتے ہوئے منی کو کہیں باہر اپنے ساتھ سیر کرانے بھی لے جایا کروں گی..... بلکہ خود اب میں بھی یہی چاہنے لگی تھی کہ یہ رلیاں اور دیگر سینے پرونے کا کام چھوڑ کر یا کم کر کے کسی پرائیویٹ سکول میں بطور ٹیچر جاب کر لوں۔



تعلیم تو میری بی اے تھی ہی..... لہٰذا میں نے سب سے پہلے اس اسکول میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا جس میں میری منی پڑھتی تھی۔ یہ اسکول ہماری بستی سے زیادہ دور نہ تھا تاہم اسکول کی وین آ کر میری بچی کو لے جاتی تھی۔ اس بستی میں گنتی کے چند بچے ہی اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ منی کے سلسلے میں اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے میں اکثر ملا کرتی تھی۔ اسکول کی مالک بھی وہی تھیں..... اپنے گھر میں ہی انہوں نے اسکول کھول رکھا تھا۔ خود وہ بے اولاد تھیں۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور اس سلسلے میں میری مدد کریں گی..... لہٰذا اگلے دن میں تیار ہوئی۔ پھر جب منی کو وین لینے آئی تو اس میں، میں خود بھی سوار ہو کر چلی گئی۔

شمشاد بیگم واقعی ایک ملنسار اور حلیم طبع خاتون ثابت ہوئیں۔ اگرچہ فوری طور پر انہوں نے مجھے نوکری پر نہیں رکھا تاہم امید دلاتے ہوئے اتنا ضرور کہا کہ ان کی ایک ٹیچر کچھ عرصے بعد نوکری چھوڑ کر جانے والی ہے اس کی جگہ پر مجھے نوکری دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ تنخواہ فی الحال معمولی تھی لیکن آگے چل کر خاطر خواہ اضافے کی پوری توقع تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی اسکول میں شام میں بھی بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے لہٰذا بطور ٹیوٹر مجھے اس اسکول میں شام کو بھی آنا پڑتا اور بہ طور ٹیوٹر تنخواہ بھی نسبتاً کچھ زیادہ تھی۔ ذہن کچھ "ڈھنگ" کا کام ملنے اور کرنے پر مطمئن سا رہنے لگا۔ میری بچی مونٹیسوری سے اب کلاس ٹو میں آ گئی تھی جبکہ میں دو کلاسیں لیتی تھی۔ ایک پانچویں اور دوسری آٹھویں کی۔

اپنی بچی پر بھی اب میری توجہ پوری ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہیڈ مسٹریس شمشاد بیگم کے ساتھ بھی میں کافی کلوز ہوتی چلی گئی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی ایک اچھی ہمدرد اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں اور نہ صرف یہ بلکہ دوسری ٹیچر کے مقابلے میں وہ مجھے اور میرے کام کو زیادہ پسند کرنے لگی تھیں۔ پھر ایک دن برملا انہوں نے اس بات کا اظہار کر ڈالا۔ "بیٹی آمنہ.....! یقین جانو میں تمہیں کبھی بھی ملازم کی حیثیت سے نہیں دیکھتی، اگر میں کسی کو بیٹی کہہ دیتی ہوں تو اس کا مطلب واقعی یہی ہوتا ہے کہ میں تمہیں بیٹی سمجھتی بھی ہوں۔ اگر تم برا نہیں مناؤ تو ایک بات کہوں تم سے....."

محبت اور ہمدردی کے دو بول ہی میری آنکھوں کو نمناک کرنے کے لئے کافی

تھے...... لہٰذا میں ٹشو پیپر سے انہیں پونچھتے ہوئے ازراہ تشکر بولی...... "میڈم! یہ آپ جیسی خاتون کا وصف ہے کہ آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہیں، میں بھلا آپ کی بات کا کیا برا مناؤں گی بلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس بات میں بھی میرے لئے اچھائی اور رہنمائی کا کوئی پہلو ضرور ہوگا۔"

"ماشاء اللہ بیٹی! تم واقعی ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہو......" وہ رسان سے بولیں اور پھر اضافہ کیا...... "لیکن بیٹی! مجھے لگتا ہے کہ تم بہت دکھی ہو۔ تمہاری وضع قطع اور شخصیت کسی طور بھی "گوٹھ" کے باسیوں سے میل نہیں کھاتی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم وہاں رہتی کس طرح ہو۔ میں سمجھتی ہوں اس میں تمہاری ضرور کوئی مجبوری ہوگی۔"

پھر میں نے انہیں اپنا سمجھتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔ میری دردانگیز کتھا پر وہ دم بخود رہ گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں میرے قریب آئیں اور مجھے بے اختیار اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ میں دنگ رہ گئی کیا غیر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنوں سے بھی بڑھ کر چاہنے لگتے ہیں۔ ان کے انداز و لہجے سے لگتا تھا کہ انہوں نے میرے غم کو اپنے غم کی طرح محسوس کیا ہے جب وہ بولتیں تو ان کے لہجے میں بزرگانہ شفقت آمیز حکم ہوتا تھا۔ "بیٹی! بہت ہو گیا تم اور سعدیہ فوراً میرے یہاں چلے آؤ، فوراً ابھی...... میں اسکول وین ساتھ کر دیتی ہوں۔"

جواباً میں نے مرتعش لہجے میں اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا...... "میڈم! میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ نے میرے دکھ کو سمجھا......"

"نو میڈم......! کوئی میڈم ویڈم نہیں چلے گا۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ "مجھے اب امی کہو اور یہ غیرت والے تکلف چھوڑو۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ بے فکر رہو، مجھے معلوم ہے تم ایک خوددار اور وضع دار خاتون ہو۔ کسی پر بوجھ بننا پسند نہیں کرو گی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تم مجھ پر کسی طرح بھی بوجھ نہیں بنو گی۔ اوپر کا آدھا پورشن تم دونوں ماں بیٹیوں کے لئے کافی ہوگا۔ اس کا میں تم سے باقاعدہ کرایہ لوں گی، لیکن بغیر ایڈوانس کے۔ اب بولو۔"

میں کیا کہتی...... وہ عورت تو میرے لئے فرشتہ ثابت ہو رہی تھی ورنہ کون آج کسی کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ اس کی عزت نفس کی پاسداری کا بھی اسے احساس؟



میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اس بستی سے نکلوں اور کسی ڈھنگ کے علاقے میں بودو باش اختیار کروں اور یہ سب میری بچی کے خوش آئند مستقبل کے لئے بھی ضروری تھا لیکن...... بابا...... ان کا کیا ہوگا۔ اب تو ان کی بیٹی سدھوری بھی اپنے شوہر کے گھر چلی گئی تھی۔ میرے بعد ان کا کون خیال رکھے گا۔ انہیں ایک دم چھوڑنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ انتہا درجے کی خودغرضی تھی کہ جس شخص نے مجھے بے یارو مددگار دیکھ کر اپنے گھر میں پناہ دی اور بیٹیوں بلکہ بیٹیوں سے بھی بڑھ کر میرا خیال رکھا انہیں بھلا دوں۔

بیگم شمشاد قدرے زود فہم واقع ہوئیں، انہوں نے فوراً میرے چہرے سے رمز خاموشی بھانپ لیا اور براہ راست اس کا اظہار کرنے کی بجائے مختلف پیرائے میں حل سجھاتے ہوئے بولیں۔ "تم بابا کو بھی یہاں لے آؤ...... انہیں بھی یہاں مصروف کر دیں گے۔ بلکہ بیک وقت ڈرائیور اور چوکیداری بھی کریں۔"

"جی...... میں کوشش کروں گی کہ ان کے سلسلے میں بھی کچھ کروں۔ لیکن میڈم! ان کا مسئلہ اپنی جگہ رہے گا۔ پتہ نہیں میری بات مانتے بھی ہیں کہ نہیں۔" میں نے تذبذب آمیز لہجے میں کہا۔

"انہیں ماننی پڑے گی تمہاری بات...... آخر کو وہ تمہیں اپنی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔ تو بھلا وہ تمہارا اور منی کے بہتر مستقبل کا برا کیوں سوچیں گے...... یا پھر تم ایسا کرنا، کبھی اپنے ساتھ انہیں یہاں لے آنا۔ میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

میں نے کہا "آپ کی بات درست ہے لیکن پہلے میں خود بابا سے بات کر کے دیکھوں گی۔"

"اچھا بیٹی...... جیسے تمہاری مرضی...... لیکن یہ سب جتنی جلد ممکن ہو کر لو اور وہاں سے نکل آؤ۔" ان کی بات سن کر میں نے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

❁❁❁

شہر کراچی پہنچتے ہی دادو سب سے پہلے کمال اور سعدیہ سے ملا۔ ان کے پاس پہنچتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ پیشی کی تاریخ لے لی۔ جس کورٹ میں اس کا مقدمہ چل رہا تھا اس کی ایک دو پیشیوں کے بعد ہی جج نے اپنے ڈسکریشن پاور استعمال

کرتے ہوئے اسے باعزت طور پر بری کر دیا اور خورشید قتل کیس کے سلسلے میں نئے مقرر کردہ آئی او انسپکٹر ثناء اللہ کو جلد نیا چالان پیش کرنے کی تاکید کرتے ہوئے اصل مجرم کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

اب یہ سب لوگ رانا الطاف ایڈووکیٹ کی پرشکوہ آفس میں بیٹھے تھے۔ ان میں جواں سال اور ایماندار پولیس انسپکٹر ثناء اللہ عباسی بھی موجود تھا۔ تیس پینتیس سال کا ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر سمے آہنی عزم کی رمق دوڑتی محسوس ہوتی۔ یہ رانا صاحب کے دفتر کا ایک پرشکوہ گیسٹ روم تھا...... سامنے شیشے کی میز پر چائے کے ساتھ دیگر لوازم بھی دھرے تھے۔ کمرے کی فضا ائر کنڈیشنڈ تھی۔ وہ سب آمنے سامنے کے صوفوں پر براجمان خاموشی سے چائے رہے تھے۔ گمبھیر خاموشی سے یوں لگتا تھا جیسے کچھ دیر قبل یہ سب کسی اہم موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد اب اپنے اپنے طور پر غور کر رہے تھے۔ تاہم آج کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا باقی تھا اور اس کی ابتداء انسپکٹر ثناء اللہ نے کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''میرا خیال ہے ہمیں فوراً اپنے مطلوبہ مجرم پرویز کے گھر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کر لینا چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رانا الطاف کی جانب دیکھا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے......'' انہوں نے رائے دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''جس طرح بیٹے کمال اور بیٹی سعدیہ نے اصل مجرم (پرویز) کا کھوج لگایا اس پر کو بھی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی...... ویسے بیٹے اگر تم چاہو تو اپنی تسلی کی خاطر اس سلسلے میں اپنے محکمے کو حرکت میں لا سکتے ہو۔''

''بالکل نہیں انکل...... مجھے امید نہیں کہ وہ اپنی کارکردگی کا خاطر خواہ مظاہرہ کر سکیں۔ بلکہ الٹا وہ مجرم کو ہی ہوشیار کر دیں گے۔ کیونکہ بہر حال ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں بھی کالی بھیڑوں کی کمی نہیں......'' انسپکٹر ثناء اللہ نے رانا الطاف کی بات کا جواب دیتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔ پھر ان کی اول الذکر بات کا جواب دیتے ہوئے جوابا بولا۔ ''رہی بات مجرم کو فوری گرفتار کرنے کی تو اس سلسلے میں مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے پورا۔'' پھر اس کے بعد انسپکٹر ثناء اللہ نے کمال اور سعدیہ سے خورشید قتل کیس میں ملوث متوقع مجرم پرویز سے متعلق بات چیت کی۔ سعدیہ نے انسپکٹر ثناء اللہ کو تحریری طور پر بھی پرویز کے متعلق حاصل شدہ مفصل معلومات کی ایک نقل فائل اس کے حوالے کی تو انسپکٹر ثناء اللہ پہلے فائل کو کھول کر سرسری انداز میں پڑھتا رہا۔ پھر سعدیہ کی جانب توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے خفیف سے لہجے میں بولا۔ ''یقین جانیے مس سعدیہ! مجھے یہ فائل آپ سے لیتے ہوئے خاصی ندامت سی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں ایک ہڈ حرام پولیس آفیسر ہوں اور پکی پکائی کھانے کی کوششیں کر رہا ہوں......''



سعدیہ اس کی صاف گوئی پر متحیر رہ گئی۔ اسے یہ شخص تمام پولیس افسروں سے بالکل مختلف لگا۔

ایڈووکیٹ رانا الطاف اور کمال بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئے اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کی خفت مٹانے کی غرض سے بولے۔ ''کوئی بات نہیں بیٹے...... اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں.... تمہارا یہی اعتراف تمہارے اچھے ہونے کی دلیل ہے...... ناؤ لیو اٹ پلیز......''

انسپکٹر کی نگاہیں قدرے جھک سی گئیں۔ سعدیہ کو وہ ایک معصوم سا شخص نظر آنے لگا۔ بس یہی وہ ایک لمحہ تھا جب سعدیہ کو اپنے اندر کسی عمیق گوشے میں ایک ایسا جذبہ جنکی لیتا محسوس ہوا جسے وہ سردست محسوس نہیں کر پائی تھی۔ اس کی ستائشی نگاہیں ہنوز انسپکٹر ثناء اللہ کے جھکے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

❁❁❁

دادو عارضی طور پر ایڈووکیٹ رانا الطاف کے دفتر کی اوپری منزل میں بنے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھا...... شمائلہ سے ملنے کے لئے اس کا دل بری طرح مچل رہا تھا۔ لیکن حالات نے کچھ اس انداز میں کروٹیں بدلی تھیں کہ وہ خود کو ذرا لئے دیئے رکھے ہوئے تھا۔

وکیل سعدیہ نے اس کی بے چینی بھانپتے ہوئے ایک دن سہ پہر کو اسے اپنے ساتھ لئے شمائلہ کے ہاں پہنچ گئی۔ پھر دادو کو شمائلہ کے ساتھ تنہائی فراہم کرنے کی خاطر، سعدیہ دوسرے کمرے میں خالہ کے ساتھ باتیں کرنے بیٹھ گئی جبکہ دادو اور شمائلہ ایک الگ کمرے میں بیٹھے تھے...... فضا میں عجیب سا رنگ آمیز سناٹا طاری تھا۔ کمرے میں

کھڑکی کے راستے پُر بہار ہوا کے نرم جھونکے اندر آ رہے تھے۔ جس سے گرمی کی شدت نہ ہونے کے برابر تھی۔ چھت میں لگا پنکھا اپنی رفتار میں مقدور بھر ہوا بہم پہنچانے کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ دادو ایک معصوم بچے کی طرح شائلہ کے سامنے والی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا...... جبکہ شائلہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دادو کے چہرے کی طرف تکے جا رہی تھی۔ آج اس کے دلکش اور گلابی چہرے پر شادابی چھائی ہوئی تھی جس میں کہیں دور اداسی کی ہلکی سی رمق بھی شامل تھی۔ اس نے پھولدار لان کی شلوار قمیض زیب تن کر رکھی تھی جو اس کے دلکش جسم پر بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"دادو......! تم نے بڑے دن لگا دیئے اپنے گاؤں میں۔ کیا شہر آنے کو دل نہیں چاہتا تھا تمہارا۔" معاً شائلہ نے ہولے سے کہا۔ تو دادو نے یونہی چونک کر اس کی جانب دیکھا...... شائلہ کا لہجہ اسے قدرے معنی خیز سا محسوس ہوا۔

"گوٹھ میں میرا اب دل کہاں لگتا ہے...... وہ تو ماں پیو کی مجبوری کی وجہ سے مجھے کچھ زیادہ دن لگ گئے۔" دادو نے شائلہ کی گہری سرمگیں آنکھوں سے اپنی نگاہیں ہٹائے بغیر کہا۔ شائلہ نے اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے اپنی پلکوں کی سرمئی جھالریں گرا دیں اور یونہی اپنے ہاتھ کے لانبے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "تم اپنی امی ابو کو بھی یہیں لے آؤ ناں شہر......"

"دادو نے اس کی بات پر ایک گہری ہنکاری بھری اور بولا۔ "دل تو یہی کرتا ہے میرا بھی...... انہیں لے آؤں یہاں۔ لیکن......"

"لیکن کیا......؟" شائلہ نے یکدم پوچھا اس کے لہجے سے بے قراری عیاں تھی۔

"اپنے گوٹھ کے بھی کچھ مسئلے ہیں اور پھر یہ شہر بھی میرے لئے اجنبی ہے، اس لئے اتنی جلدی میں یہ سب ممکن نہیں ہو سکے گا شاید......" دادو نے مبہم سے لہجے میں کہا تو شائلہ پھر دھیرے سے بولی۔ "یہ شہر اجنبی صحیح لیکن یہاں کے رہنے والے تو اجنبی نہیں۔ کمال بھائی ہیں...... سعدیہ باجی ہیں اور......"

"اور تم ہو۔" دادو کے منہ سے بے اختیار نکلا اور شائلہ کے عنابی ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ سی رقصاں ہو گئی...... پھر وہ ایک دم جیسے بات بدلنے کی غرض سے بولی۔

"ارے دادو! میں نے تو تمہیں باعزت بری ہونے کی مبارکباد بھی نہیں دی۔"



"کوئی بات نہیں۔" دادو نے کہا۔ "ویسے معلوم ہے شائلہ...... جب مجھے تمہارے ابو کے قتل کے الزام میں دھر لیا گیا تو سب سے زیادہ فکر مجھے تمہاری تھی...... اس لئے بھی کہ تم اکیلی رہ گئی ہو اور مجھے اس بات کی بھی فکر ہو رہی تھی کہ کہیں واقعی مجھے ابو کا قاتل......"

"نہیں دادو...... ایسا مت کہو......" شائلہ اچانک بڑے دکھی لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں نے کبھی بھی تمہیں اپنے ابو کا قاتل نہیں سمجھا۔ یہ تو حالات ہی کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ......"

"اچھا چھوڑو...... میرا مقصد تمہیں دکھی کرنا نہیں تھا......" دادو اچانک اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اس نے شاید شائلہ کے خوبصورت چہرے پر کبیدگی کے تاثرات ابھرتے دیکھ لئے تھے۔ "شائلہ یقین جانو...... مجھے تمہاری بڑی فکر رہتی ہے۔"

"بس صرف فکر رہتی ہے۔" شائلہ نے بڑی ادا سے کہا اور اس لمحے دادو کو وہ بہت اچھی لگی۔

"تبھی تو میں چاہتا ہوں کہ...... کہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"سعدیہ باجی اور کمال بھائی بہت اچھے ہیں اور سچے ہمدرد بھی......" شائلہ نے جیسے دادو کو کسی خیال کے تحت اشارہ دیا۔

"ہاں...... میں موقع دیکھ کر ان سے بات کروں گا...... مگر شائلہ...... میں چاہتا ہوں کہ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں تاکہ ہمیں کوئی معاشی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔"

"دادو! جو کچھ کرنا ہے بس جلدی کر لو...... پتہ نہیں کیوں میرا دل بڑا بے چین رہنے لگا ہے...... کبھی کبھی تو میں خود کو اتنا تنہا محسوس کرنے لگتی ہوں کہ......" یہی وہ لمحہ تھا جب دادو نے آگے بڑھ کر شائلہ کے ہاتھ پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "شائلہ حوصلے سے کام لو...... میں ہوں نا...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، بس تھوڑا سا انتظار...... اس کے بعد......" ابھی دادو نے اتنا ہی کہا تھا کہ سعدیہ کھنکھارتی ہوئی اندر داخل ہوئی...... اس کے ہمراہ نعمت خالہ بھی تھی۔

"ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے......؟" سعدیہ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد سعدیہ، شائلہ کو

خوشخبری سناتے ہوئے بتانے لگی کہ اس کے باپ خورشید احمد کا قاتل عنقریب گرفتار ہونے والا ہے اور اس کے خلاف ثبوت اور دیگر شواہد اکٹھے ہو چکے ہیں جس کی بناء پر اسے کوئی بھی پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکتا۔ بہرطور...... سعدیہ تھوڑی دیر بعد وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہاں سے چلی آئی۔ دادو بھی اس کے ہمراہ تھا۔ پھر دادو، وکیل سعدیہ کو خدا حافظ کہتا ہوا رانا الطاف کے دفتر آ گیا جدھر اس کی ایک کمرے میں عارضی رہائش تھی۔ وہ دفتر کی بالائی منزل پر واقع ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ لکڑی کے تختے والا ایک بیڈ بھی تھا۔ واضح طور پر یہ کہ کمرہ دفتر کے کسی مستقل اور شبینہ ملازم کا معلوم ہوتا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ دادو ایک تنور سے کھانا کھا کر جلد ہی کمرے میں چلا آیا تھا۔ وہ اب بستر پر سونے کے لئے لیٹ تو گیا تھا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اس کے تصور میں بار بار شائلہ کا چہرہ طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جلد از جلد سہارے کی متلاشی تھی...... ایک مرد کے سہارے کی...... اور خود دادو بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اس میں دیر نہ ہونے دے مگر یہ سب سردست اتنی جلدی بھی ممکن نہ تھا کیونکہ اس کے لئے اسے سب سے پہلے اپنے گوٹھ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کرنا تھا۔ یہ تبھی ممکن تھا جب وہ اپنی گردن سے زمیندار اختیار علی کے قرضے کا طوق اتارے جو اسے ابھی کسی طور بھی ممکن نظر نہیں آ رہا تھا لیکن دادو یہ بات بھی بخوبی جانتا تھا کہ وہ ساری زندگی زمیندار اختیار علی کا ''خود ساختہ'' قرض نہیں اتار سکتا۔ جس نے نہ صرف اس کے باپ کی زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا غصب کر رکھا تھا بلکہ ان دونوں (ماں باپ) سے کافی عرصے تک بیگار بھی لیتا رہا تھا۔ لہٰذا دادو نے بالآخر یہی فیصلہ کیا تھا کہ کسی دن خاموشی سے وہ اپنے ماں باپ کو گوٹھ سے یہاں شہر لے آئے اور اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ وہ یہاں اپنا ٹھکانہ اور روزگار کا خاطر خواہ بندوبست کرے۔ اس کے لئے اس نے سب سے پہلے شائلہ کے محلے کے اپنے اسی پرانے ڈاکٹر سے ملنے کا ارادہ کیا جس کے پاس وہ بطور ڈسپنسر رہ چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ ڈاکٹر اسے ضرور اپنے پاس رکھ لے گا۔ کیونکہ وہ اس کے کام سے مطمئن اور خوش تھا۔ اتنا کہ جب کبھی اسے اپنے کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جانا ہوتا تو وہ پورا کلینک اس کے حوالے کر کے چلا جاتا تھا۔ دادو کو ٹرینڈ بھی اس نے ہی کیا تھا...... اور



یہی نہیں وہ ڈاکٹر صبح کسی سرکاری ہسپتال میں بھی ڈیوٹی دیتا تھا لہٰذا صبح میں بھی کلینک کھلا رہتا تھا تو دادو ہی اسے سنبھالے رکھتا تھا۔ دادو سے بھی کافی مریض مانوس ہو گئے تھے۔ یہ سب سوچتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

❁❁❁

وکیل سعدیہ آج صبح اپنے ایک دو چھوٹے کیس جلدی جلدی نمٹا کر اور ایک آدھ کیس کی تاریخ لے کر کورٹ سے فارغ ہوئی اور ٹیکسی لے کر سیدھی پی ای سی ایچ ایس کالونی کے لئے روانہ ہو گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی سعدیہ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ''عثمان ٹریڈرز'' کے دفتر جا رہی تھی۔ جہاں کسی بھی لمحے اس کا اپنے باپ واثق علی سے سامنا ہو سکتا تھا اور اس کی تلخ ماضی کی راکھ سے کسی بھی لمحے چنگاری بھڑک سکتی تھی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد ٹیکسی نے سعدیہ کو مطلوبہ جگہ پر اتار دیا وہ دانستہ ''عثمان ٹریڈرز'' کی عمارت کے دفتر سے ذرا فاصلے پر اُتری تھی۔ وہ اب سروس روڈ کے کنارے کنارے پیدل چلی جا رہی تھی۔ یہاں قطار در قطار مختلف اور سرکاری و غیر سرکاری دفاتر کی عمارتیں تھیں...... جن میں چند ایک بینکوں کی برانچیں بھی تھیں۔ ایک جانب لائن سے نئے ماڈلز کی نئی چمچماتی کاریں ترچھے انداز میں پارک تھیں۔ پھر چند فرلانگ چلنے کے بعد سعدیہ ایک بلند عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر اس عمارت کو دیکھا۔ اسی عمارت کے اندر کسی منزل میں ''عثمان ٹریڈرز'' کا دفتر تھا...... وہ اس سے پہلے بھی یہاں آتی رہتی...... بلکہ اکثر و بیشتر آتی رہتی تھی۔ لیکن کبھی اندر اس نے قدم نہیں رکھا تھا۔ یہاں آ کر خاموشی سے واپس لوٹ جاتی تھی۔ وہ یہاں آ کر عجیب نظروں سے عمارت کو خاموشی سے گھورتی رہتی تھی کہ اپنے اندر ہی اندر کسی عزم...... کسی عہد کی تجدید کرتی رہتی...... اپنے کسی ارادے کو مضبوط اور پختہ کرنے کی غرض سے وہ یہاں کھڑے کھڑے من ہی من میں ایک عہد دہرایا کرتی...... ''اے سنگ دل شخص! مجھے افسوس ہے کہ تو میرا باپ ہے...... لیکن یاد رکھ! تو نے میری معصوم ماں کو پچیس سال پہلے جو دھوکا دیا تھا اور جس طرح تو نے اس کی دولت پر قبضہ کر کے اسے دھتکارتے ہوئے بے خانماں کیا...... بہت جلد اس کا تمہیں حساب دینا ہو گا۔'' اس بار

بھی اس کے اندر کہیں عمیق گوشے میں یہ الفاظ ابھرے تھے۔ وہ یہاں کھڑے ہوکر اپنے باپ واثق علی کی جھلک بھی دیکھ چکی تھی...... اونچا لانبا قد، سرخ و سفید رنگت، پچاس پچپن کی عمر میں بھی مردانہ وجاہت کا حامل...... کنپٹیوں پر جھلکتی ہوئی نیلگوں مائل سفیدی...... پہلی بار جب سعدیہ نے اپنے باپ کو دیکھا تو اسے خود پر فخر سا محسوس ہوا تھا کہ وہ اتنے وجیہہ باپ کی بیٹی ہے۔ ماں کے لبوں سے بھی اکثر اس نے یہی سنا تھا کہ اس کے ڈیڈی خوبصورت شخصیت کے حامل ہیں لیکن پھر جب سعدیہ کی نظروں کے سامنے اپنی دکھیاری اور الم نصیب ماں کا چہرہ گھوم جاتا تو یہی فخر شدید قسم کی نفرت میں بدل جاتا۔

بہرطور سعدیہ نے چند ثانیے وہاں کھڑے کھڑے ایک گہری سانس کھینچی۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے باپ کے دفتر میں قدم رکھنے جارہی تھی پھر اس نے قدم بڑھا لئے۔ لفٹ کے ذریعے وہ چھٹی منزل پر پہنچی اس منزل پر ''عثمان ٹریڈرز'' کا عالی شان دفتر تھا جس کی راہداریوں تک میں سبز رنگ کا کارپٹ بچھا ہوا تھا اور پوری منزل میں اے سی پلانٹ کی خوشگوار ٹھنڈ سی پھیلی ہوئی تھی...... بند دروازوں کے دائیں بائیں شفاف شیشوں کے پٹ والی ''ایئر ٹائٹ'' کھڑکیاں بھی تھیں جو ظاہر ہے بند تھیں۔ اندر بیٹھے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر کئی افراد اپنے کام میں مگن تھے۔ راہداری پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کا دل نجانے کیوں دھک دھک سا کرتا محسوس ہورہا تھا۔

اچانک کبھی...... کسی ہال کے کمرے کا ایئر ٹائٹ اور بھاری بھرکم دروازہ کھلتا تو اس کی ہلکی ہلکی ''گھرر...... گھرر'' کی آواز سن کر سعدیہ ایک لمحے کو بری طرح چونک سی جاتی ہے۔ وہ دل میں یہی دعا مانگ رہی تھی کہ وہ جس مقصد کے لئے آئی ہے، وہ فوری اور خاموشی سے پورا ہوجائے اور بحفاظت یہاں سے نکل جائے...... پھر قریب ہی اسے ریسپشن پر چپراسی ٹائپ کے کچھ لوگ چائے پیتے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ ایک دیوہیکل سی چوبی میز فرش اور دیوار میں نصب تھی۔ ٹیلی فون کا سیٹ بھی وہاں موجود تھا...... سعدیہ اس میز کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی وہ تینوں افراد سعدیہ کو دیکھ کر ایک دم چونکے تھے۔

❁❁❁



وکیل سعدیہ سعید نے آہستگی کے ساتھ اپنے پرس سے پرویز کی پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر ان تینوں افراد کی جانب بڑھائی اور پوچھا۔ ''یہ صاحب یہاں پر کون سے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' سعدیہ کی گفتگو نے فوری اثر دکھایا اور ان تینوں میں سے ایک نے تصویر اپنے ہاتھ میں لے کر بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو اپنا پرویز بھائی ہے گودام میں ڈیوٹی ہے اس کی......''

سعدیہ کو اب تسلی ہوگئی تھی۔ اس نے پھر ایک لمحہ بھی وہاں رکنا گوارہ نہیں کیا اور اس کا شکریہ ادا کرتی واپس لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ لفٹ ابھی نہیں پہنچی تھی۔ سعدیہ لفٹ کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ اس کے ذہن میں تیزی کے ساتھ اتھل پتھل جاری تھی۔ مقتول خورشید اور اس کا قاتل پرویز دونوں ہی کی ''عثمان ٹریڈرز'' سے وابستگی سعدیہ کو اچنبھے میں مبتلا کررہی تھی۔ پھر مقتول خورشید کے قتل میں دادو جیسے سیدھے سادے انسان کو پھنسانے کی کوشش اور یہ سب ایک معمولی کارکن پرویز کو بچانے کی خاطر...... سعدیہ کو ان سب باتوں کے تناظر میں کسی گہرے جرم کی پراسرار سرگرمی محسوس ہو رہی تھی...... جو درپردہ ''عثمان ٹریڈرز'' کے سائے تلے نمو پارہی تھی......

'کیا قدرت مجھے موقع فراہم کررہی ہے کہ میں واثق علی یعنی اپنے باپ سے ماں کے اوپر ہونے والی زیادتیوں کا باآسانی اور عبرت انگیز بدلہ لے سکوں۔'

یہ سوچتے ہی اس کا ذہن خود بخود کھلتا چلا گیا...... ایک چین کی طرح کی مؤثر منصوبہ بندی اپنے باپ کے خلاف اس کے دماغ میں ترتیب پاتی چلی گئی۔ ''خورشید احمد کا قتل...... اور قاتل پرویز...... اور دونوں ہی قاتل و مقتول کا تعلق ''عثمان ٹریڈرز'' کے ساتھ'' وہ جتنا سوچتی جارہی تھی حیرت انگیز طور پر اسے اپنے اندازے اور قیاس پر یقین ہوتا جارہا تھا۔ ''پرویز......'' یہی وہ شخص تھا جو وجہ قتل اور محرک قتل بتا سکتا تھا۔

اثنائے راہ لفٹ آ گئی سعدیہ ذرا سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ لفٹ کے سلائیڈنگ ڈور خودکار انداز میں وا ہوئے...... اور اس میں سے برآمد ہونے والے شخص پر نگاہ پڑتے ہی سعدیہ بری طرح چونک پڑی۔ سامنے لفٹ سے برآمد ہونے والا شخص جس نے ہلکے کلر کا سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ سعدیہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو چونکا تھا۔

وہ واثق علی تھا۔ سعدیہ کا باپ اور ''عثمان ٹریڈرز'' کا روح رواں...... اس کی آنکھوں میں سعدیہ پر نظر پڑتے ہی شناسائی کی ایک چمک ابھری تھی۔ لیکن یہ شناسائی کی چمک کسی دیرینہ خونی رشتے کو پہچاننے کی نہیں تھی...... بلکہ شناسائی عام انداز کی تھی۔

''تم غالباً وکیل سعدیہ ہو......'' یہ واثق علی تھا...... سعدیہ کا باپ...... جس نے اپنی آنکھیں ذرا سکیڑ کر سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے گونج دار لہجے میں کہا تھا۔

''جی؟'' سعدیہ نے باپ کے چہرے کی طرف دیکھ کر مختصراً کہا۔

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟'' پھر چبھتے ہوئے لہجے میں سوال داغا گیا تھا۔ سعدیہ نے محسوس کیا وہ کچھ نروس سی ہو رہی تھی۔ سوال بالکل واضح اور برحق تھا۔ ''مجھے ''اسٹار انٹرپرائزز'' جانا تھا۔ غلطی سے یہاں آ گئی تھی......''

سعدیہ نے کہا اور جلدی سے لفٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے...... تب اسے اپنے جھوٹے جواب کے گھڑنے پر پچھتاوا سا ہونے لگا اور وہ سوچنے لگی...... اگر اس کے باپ نے وہاں موجود ان لوگوں سے اس کے بارے میں کچھ پوچھ لیا، جن لوگوں کو اس نے پرویز کی تصویر دکھائی تھی تو وہ افراد اسے سعدیہ کے وہاں آنے کے اصل مقصد سے آگاہ کر سکتے تھے اور یوں اس کا ہوشیار باش ہو جانا لازمی تھا۔ علاوہ ازیں سعدیہ کو اس بات پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اس کے باپ نے اسے بہ طور وکیل کس طرح پہچانا...... کیونکہ وہ ابھی اتنی زیادہ مشہور بھی نہیں تھی کہ اتنے بڑے بڑے بزنس مین اسے پہچاننے لگیں...... گراؤنڈ فلور پر پہنچتے ہی وہ باہر آ گئی۔ اب اسے ٹیکسی کی تلاش تھی۔

❁❁❁

گرمیوں کی دوپہریں عروج پر تھیں...... صحن میں تپتی ہوئی دھوپ میں گاہے بہ گاہے چڑیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں گونج رہی تھیں...... ان کی چہچہاہٹ میں ہانپنے کا عنصر غالب تھا۔ آمنہ بیگم کھانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ آرام کر کے اپنی فیروزی



رنگ کی ڈائری پڑھنے بیٹھ گئیں۔

''ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی تھی...... اگر واثق علی جیسے کٹھور اور سنگ دل انسان دنیا میں تھے تو ایسے فرعون کے لئے موسیٰ صفت لوگ بھی موجود تھے...... بابا اور سدھوری...... جنہوں نے بلاشبہ مجھ بے خانماں کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ حقیقی بیٹی اور بہن کا پیار بھی دیا اس کے بعد شمشاد بیگم جیسی مہربان اور ہمدرد و مونس خاتون مجھے اندھیروں سے نکالنے کے لئے پورے خلوص کے ساتھ کوشاں تھی۔ میں سمجھ رہی تھی اب اللہ تعالیٰ نے مجھے نافرمانی کی سزا میں ڈالنے کے بعد اب مجھے معاف کر دیا تھا...... بے شک وہ قہار و جبار بھی ہے تو غفور و رحیم بھی ہے۔ بلاشبہ اس قادر المطلق کی قہاری و جباری میں بھی بندے کے لئے بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس طرح وہ بندے کو ایک ڈھلنے کی کیفیت سے گزارتا ہے اور شاید میں بھی اب ڈھلنے کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔

میرے معمولات اب کچھ بندھے انداز میں بیتنے لگے تھے۔ صبح اسکول، دوپہر کو واپسی پھر شام کو ٹیوشن پڑھانے جاتی اور رات سات بجے تک واپس گھر آ جاتی۔ خالہ وزیران سے اب میں نے کترنے سینے کے لئے ٹوکرے لینے بھی بند کر دیئے تھے...... کیونکہ اس اندھیرے جھونپڑی نما گھر میں کترنیں، رلیاں اور نہ جانے کیا کیا الا بلا سی کر میری نظریں کمزور ہونے لگی تھیں...... بجلی کا تو یہاں آئے دن بحران رہتا تھا اور جس تھوڑے سے مختصر عرصے میں رہتی بھی تھی تو وہ ایسی ہی تھی جیسے اپنی جگنو ایسی روشنی سے اس اندھیری بستی کے باسیوں پر احسان کر رہی ہو...... بہرطور...... میں نے اب سنجیدگی سے شمشاد خاتون کی مفید نصیحت پر نہ صرف غور بلکہ فوری عمل کر کے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور روزانہ دل میں تہیہ کرتی کہ بابا سے آج اس سلسلے میں بات کر کے رہوں گی، لیکن پھر جانے کیوں ہمت نہیں پڑتی تھی...... مگر شاید بابا کی جہاندیدہ نظروں نے میرے چہرے کی بے چینی کو بھانپ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن خود ہی انہوں نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''دھیئے! میں دیکھ رہا ہوں، تجھے یہاں اب وہ پہلے سی خوشی نہیں ہوتی۔ اس میں تیرا قصور بھی نہیں...... کیونکہ یہ جگہ، یہ بستی اور شاید یہ جھونپڑی نما گھر تیرے رہنے کے لائق نہیں تھا...... انسان کو اپنی بہتری کے لئے سوچنے اور اس پر عمل کرنے کا پورا حق ہے

دھیئے......! اگر تُو کہیں اور زیادہ خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے تو میں بالکل رکاوٹ نہیں بنوں گا.....تو اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہے میڈی دھی...."

بابا کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ میری آنکھوں سے بھل بھل آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے۔

"اڑے......ڑی...... یہ کیا...... روتی کیوں پڑی ہے بابا تُو...... بری لگ گئی میری بات...... اچھا ماپھ کر دے، پھر اڑیں بابا نوں...... یہ دیکھ ہت جوڑتا...... ہوں میں نے تیرا دل دکھا دیا اڑیں سوہنڑیں دھی کا دل دکھا دیا۔" بابا مجھے روتا پا کر ایک دم میرے قریب آ کر اپنے ہاتھ جوڑنے لگے اور میں نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنے رندھے ہوئے لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "نہیں بابا! میں بھلا آپ کو چھوڑ کر یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ کیا آپ نے مجھے اتنا ہی خود غرض سمجھ لیا بابا کہ جہاں مجھ بے خانماں کو آپ کی شفقت بھری چھاؤں ملی اور...... اور سدھوری جیسی معصوم بہن کا حقیقی پیار نصیب ہوا...... میں بھلا کس طرح اس سائبان کو چھوڑ دوں گی...... آپ لوگوں ہی کی وجہ سے تو آج میں زندہ ہوں...... اگر آپ لوگ مجھ الم نصیب کو سہارا نہیں دیتے تو کب کی مر چکی ہوتی۔"

"نہ دھیئے! نہ...... ایسا مت آکھ (بول)...... زندگی اور موت رب سائیں کے ہاتھ میں ہے پر دھیئے! تو مجھے پھر بھی غلط سمجھ رہی ہے۔" بابا ایک دم بولے اور پھر اضافہ کیا۔ "میں نے تو تمہارے اور منی کے بھلے کے واسطے یہ بات کہی تھی۔ آخر ہمیں اس ننھی جان کے لئے بھی تو سوچنا ہے منی میری بھی تو چھوٹی نیاڑیں (بیٹی) ہے۔ میں اسے یہاں کے اندھیروں میں پرورش نہیں پانے دوں گا۔ آخر کو وہ ایک استانی کی بیٹی ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا دھیئے!"

آخر میں انہوں نے میرا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر اوپر کرتے ہوئے کہا۔ میں نے محسوس کیا ان کی آواز واضح طور پر کپکپا رہی تھی۔ مجھے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور چپ ہو رہی...... یوں یہ بات کچھ دنوں کے لئے دب سی گئی۔

ایک روز جب بابا صبح دم پانی کا ٹینکر لے کر ملیر چلے گئے اور میں بھی اسکول کے لئے منی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے لگی تو اچانک مجھے اپنے قریب کسی کے عجیب بے



ہودہ انداز میں کھنکھارنے کی آواز سنائی دی...... میں نے قدرے چونک کر آواز کی سمت دیکھا اور ایک گینڈے جیسی جسامت کے شخص پر نظر پڑتے ہی میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی...... یہ شخص اکثر مجھے نکڑ والی گلی کے ایک پان والے کیبن کے پاس گھورتا ہوا نظر آتا تھا...... جس پر میں نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ موڑ کاٹنے کے لئے مجھے مجبوراً پان کے کیبن کے قریب سے گزرنا پڑتا تھا کیونکہ سامنے بجری کا ایک ڈھیر بھی پڑا تھا۔ لہٰذا اسکول آتے جاتے جب میں جی کڑا کر کے وہاں سے گزرنے لگتی تو اس بد ہیئت اور سیاہ رنگت والے اوباش شخص کو اپنی طرف گھورتا ہوا پاتی اور جب میں وہاں سے گزرنے لگتی تو وہ بڑے بے ہودہ انداز میں کوئی تھرڈ کلاس فلمی گانا بھی گنگنانے لگتا تھا...... لیکن آج اس شخص کی ڈھٹائی پر مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور مجھے وین کے ڈرائیور پر بھی از حد طیش آ رہا تھا جس نے ہمیشہ کی طرح آج بھی ناغہ کر دیا تھا۔ میں اس کا انتظار نہیں کرتی تھی اور وقت کی پابندی کی خاطر مجھے پیدل ہی نکل جانا پڑتا۔ عموماً ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ مجھے راستے میں بھی مل جایا کرتا تھا اور میں ڈرائیور کو کوستی ہوئی اس میں سوار ہو جایا کرتی...... میں نے منی کا ہاتھ پکڑا اور ایک نفرت انگیز نگاہ اس اوباش فطرت شخص پر ڈالتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ گلی میں جا بجا کچرا بکھرا ہوا تھا۔ لوگ بھی بس اکا دکا ہی تھے۔ تیز تیز چلتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شخص میرا تعاقب کر رہا تھا۔ یہی نہیں مجھے حسب توقع اپنے عقب سے اس کے لچر پن کا بھی احساس ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑے گھٹیا انداز میں گنگناتا ہوا میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ گلی بھی ویران تھی۔ مجھے اب غصے کی بجائے گھبراہٹ بھی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے منی کو اپنی گود میں اٹھا لیا اس کے معصوم اور ننھے ذہن نے شاید یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک اوباش شخص میرا پیچھا کرتے ہوئے مجھے تنگ کر رہا ہے۔

"امی یہ بہت گندا آدمی ہے۔" بالآخر اس نے میری گود میں چڑھے چڑھے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ ادھر وہ کمینہ شخص بھی نجانے کس طرح ایک دم میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا...... میرا وجود غصے سے پھنکنے لگا۔ میں اسے قہر بار نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ ہٹو راستے سے میرے......"

میری بات سن کر وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہنسنے لگا...... بولا۔ ''کاوڑ (غصہ) کیوں کرتی ہے......ادھر کا ہی بندہ ہوں میں۔''

''میں کہتی ہوں بکواس بند کرو اور راستہ چھوڑو میرا......'' میں بپھر کر بولی تو وہ پھر بڑے بے ہودہ انداز میں ہنسنے لگا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''بھورل خان نام ہے میرا...... چھوٹے موٹے ٹھیکے لیتا ہوں۔ بڑی اجت (عزت) ہے اپنی اس پوری بستی میں...... ادھر جناح اسکوائر میں بہت عالی شان مکان ہے اپڑاں......''

''میں کہتی ہوں بکواس بند کرو اپنی...... راستہ چھوڑتے ہو یا مچاؤں شور۔'' میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ لیکن میرا راستہ چھوڑتے چھوڑتے بھی وہ پہلے ذرا آگے بڑھا اور میری گود میں سوار منی کے پھول سے گال پر اپنے بھدے ہاتھ سے تھپکی دیتا ہوا ایک طرف کو ہو گیا۔ اس کے وجود سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ مجھے اس کی یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹنے کی سعی کی تاکہ وہ میری پھول سی بچی کو اپنے مکروہ ہاتھوں سے چھو نہ سکے۔ لیکن میری یہ کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ بہرطور میں اس پر اور اس کی یاوہ گوئی پر لعنت بھیجتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ بے چاری منی بھی گھبرا سی گئی تھی۔ میں نے چلتے چلتے اسے پیار کیا اور اسکول وین کے ڈرائیور کو دل ہی دل میں کوستی ہوئی چوراہے تک پہنچی...... وہاں سے ٹوسیٹر میں بیٹھ کر جناح اسکوائر آ گئی۔ اسکول میں بچوں کو پڑھانے پر دل مائل نہیں ہو رہا تھا۔ آج والے واقعہ نے طبیعت مکدر کر کے رکھ دی تھی...... جی میں آئی کہ شمشاد بیگم سے اس اوباش صفت بھورل کی شکایت کروں تاکہ وہ اس موذی کا کوئی سدباب کر سکیں...... پر ہمت نہ کر سکی اور چپ ہو رہی۔ لیکن میرے چہرے کا تکدر ان سے چھپا نہ رہ سکا۔

''کیا بات ہے آمنہ! کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی ہو؟'' انہوں نے شفاف اور نفیس عینک کے پیچھے سے میری طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔ وہ اس وقت آسمانی رنگ کی سادہ سی ساڑھی میں بڑی باوقار نظر آ رہی تھیں...... ان کی بات سن کر میں یونہی اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔ آنکھوں میں ہنوز میری تفکیر نمایاں تھی۔ جب انہوں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو مجھے بالآخر بتانا پڑا...... وہ میری سچی ہمدرد اور غم خوار تھیں...... میری بات سن کر ان کے چہرے پر بھی تفکر عود کر آیا تھا۔ تاہم لمحہ بھر



خاموشی کے بعد معتدل لہجے میں مجھے تشفی دیتے ہوئے بولیں۔ ''دیکھو بیٹی! تم ذرا بھی گھبرانا نہیں...... بھورل جیسے بدذات لوگ اکیلی عورت کی گھبراہٹ ہی سے اور شہہ پاتے ہیں...... تم نے یہ اچھا کیا کہ اسے خوب سنائیں...... لیکن بہرحال تم ذرا احتاط رہنا اور مجھے باخبر کرتی رہنا اپنے حالات سے، جب تک کہ تم اپنی بچی سمیت یہاں سے شفٹ نہیں ہو جاتیں۔'' انہوں نے اپنی بات ختم کی تو میں ان کی جانب ممنون نظروں سے دیکھنے لگی۔

دوپہر کو اسکول سے واپسی پر بھی خیریت رہی، یہ الگ بات تھی کہ گلی کے نکڑ پر پان والے کیبن کے قریب سے گزرنے پر بھورل نے حسب فطرت گھٹیا انداز کا فلمی گانا گنگنایا تھا اور میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ لوفر کچھ فاصلے تک میرا پیچھا بھی کرتا آیا تھا مگر اس سے زیادہ کی وہ بھی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ بہرطور...... میں گھر آ گئی...... منی میرے ہمراہ تھی۔ بابا سے میں نے اس بات کا ذکر کرنا سردست مناسب نہیں سمجھا۔ پھر شام ہوئی اسکول میں ٹیوشن پڑھانے کا ٹائم ہونے لگا۔ لیکن اس بار مجھے شمشاد بیگم نے تاکید کی تھی کہ پیدل نہ نکلوں اور گھر بیٹھ کر ہی اسکول وین کا انتظار کروں اور اس میں ہی سوار ہو کر آؤں...... لیکن مجھے حیرت تھی کہ بھلا اسکول وین کون لے کر آئے گا کیونکہ آج صبح ہی شمشاد بیگم نے ڈرائیور کا حساب کتاب کر کے اسے فارغ کر دیا تھا۔ اس کی شکایات کافی بڑھ گئی تھیں اور آج والے واقعے سے تو شمشاد بیگم کسی طور بھی اسے رعایت دینے پر آمادہ نہ تھیں۔ بہرطور پانچ بجنے والے تھے۔ بابا گھر پر ہی تھے مجھے اسکول ٹیوشن پڑھانے کی جلد ہو رہی تھی کیونکہ اپنی ڈیوٹی کے معاملے میں میں پابند اور سخت تھی۔ میں دل میں یہی سوچ رہی تھی کہ ہوسکتا ہے شمشاد بیگم یہ بات بھول گئی ہوں کہ انہوں نے آج صبح ہی ڈرائیور کو نوکری سے نکال دیا ہے اور یوں وہ روا روی میں مجھے وین کے انتظار میں گھر ہی میں بیٹھ رہنے کی تاکید کر دی ہو...... معاً باہر کسی گاڑی کی آواز اور ساتھ ہی ہارن پر میں چونک سی گئی۔ یہ آواز اسکول وین ہی کی تھی...... مجھے حیرت کے ساتھ کسی قدر طمانیت بھی ہوئی کہ اب آرام سے اسکول پہنچوں گی لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہو رہی تھی کہ گاڑی چلا کر کون لایا تھا...... کیا اتنی جلدی آنٹی کو کوئی نیا ڈرائیور مل گیا تھا...... یا پھر آنٹی خود ڈرائیو کر کے وین لائی تھیں۔ لیکن جب

میں منی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلی تو میرے دونوں ہی اندازے غلط ثابت ہوئے۔ میں نے دیکھا ڈرائینگ سیٹ پر ایک نفیس قسم کے بزرگ تشریف فرما تھے۔ سرخ و سفید رنگت پر سفید داڑھی بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ درمیانے قد کے مالک محمد اسماعیل تھے۔ اگرچہ میں نے انہیں کم ہی دیکھا تھا لیکن پہلی نظر میں ہی ان کو پہچان گئی تھی۔ مجھے حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ وہ مجھے لینے خود آئے تھے۔ دروازے پر انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور وہیں سے ہی مجھے دیکھ کر اپنے سر کے ہلکے اشارے سے شفقت بھری مسکراہٹ سے بھی نوازا۔ میں بھی جواباً دھیرے سے مسکرائی اور وین میں منی سمیت سوار ہو گئی۔

"انکل آپ نے بھلا کیوں تکلیف کی یہاں آنے کی...... میں آ جاتی خود ہی۔" میں نے دھیرے سے تشکر بھرے انداز میں ان سے کہا...... وہ آنٹی شمشاد بیگم کے شوہر تھے اور حال ہی میں ریٹائر ہوئے تھے۔ آنٹی کی طرح وہ بھی ایک نفیس اور شفیق انسان تھے۔ وہ کسی سرکاری ادارے میں اکاؤنٹنٹ تھے...... میری بات پر وہ دھیرے سے مسکرائے اور جب وین آگے بڑھا دی تو انتہائی حلیم لہجے میں گویا ہوئے۔ "بیٹی! تکلیف کیسی بھلا...... مجھے آج ہی شمی (شمشاد بیگم) نے بتایا تھا کہ کوئی نامعقول سا شخص ہماری بیٹی کو آتے جاتے تنگ کرتا ہے اور بالائے ستم یہ کہ ڈرائیور کو بھی نوکری سے برطرف کر دیا گیا ہے...... لہٰذا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی بیٹی کو آج ہم خود ہی لینے آئیں گے۔" ان کے اپنائیت بھرے لہجے نے میرا دل احساس تشکر سے معمور کر دیا۔ ان کا مجھے بار بار "ہماری بیٹی" کہنا اس قدر اپنا اپنا سا لگا کہ مجھے ان کے نورانی چہرے پر اپنے ڈیڈی کا عکس سا جھلکتا محسوس ہوا۔ وفورِ جذبات میرا آپ اتنا بھر آیا کہ دوبارہ بولنے کی ہمت نہ کر سکی اور چپ ہو رہی...... اس دوران انہوں نے مجھے اس بات پر زور دیا کہ میں اس گندی بستی سے نکل آؤں اور نہ صرف یہ بلکہ اپنے محسن صفت بابا کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آؤں اور انہیں اسکول کی ایک اچھی سی جاب دے کر وہیں رہائش پذیر بھی کر دیا جائے مجھے حیرت تھی کہ آنٹی شمشاد اور انکل اسماعیل کی آپس میں کتنی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ اور ان دونوں ہی کی میری بھلائی کے سلسلے میں ایک ہی سوچ تھی۔



اس دن وقت بہت اچھا گزرا...... واپسی میں بھی مجھے انکل اسماعیل ہی چھوڑنے آئے تھے۔ پھر چند دنوں بعد ایک ڈرائیور بھی رکھ لیا گیا، جو مجھے باقاعدگی اور بلاناغہ صبح شام لینے اور چھوڑنے آیا کرتا تھا۔

اس دن چھٹی تھی...... میں گھر پر ہی تھی۔ بابا حسب معمول باہر تھے...... منی باہر چارپائی پر بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی۔ بجلی حسب معمول عنقا تھی۔ گرمی کا عالم بھی کچھ سوا ہی ہو رہا تھا۔ آج...... چھٹی والے دن میں جلد ہی گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑے وغیرہ دھو لیتی۔ ساتھ ہی باورچی خانہ بھی آباد رہتا۔ پھر دوپہر سے پہلے پہل سارے کاموں سے فارغ ہو بیٹھتی اور اس کے بعد منی کو بھی نہلا دھلا کر کھانا کھلاتی اور اسے سلا دیتی اور خود بابا کے آنے کی منتظر رہتی۔ کھانا میں ان کے ہمراہ کھاتی تھی...... مگر آج انہیں ذرا دیر ہو گئی تھی...... لہٰذا ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ کھانا کھا کر ذرا آرام کیا جائے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی...... میں کمرے سے نکل کر صحن میں آئی۔

"کون ہے؟" دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے پوچھا۔

"اے بٹی میں ہوں...... خالہ وزیرن۔" باہر سے شناسا آواز ابھری جس کو سن کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ بھلا وہ کیوں آئی تھی...... کیونکہ ایک عرصہ ہوا میں نے اس سے کترن کا ٹوکرا لینا چھوڑ دیا تھا۔ بہر طور میں نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا...... وہ اندر آ گئی اور گری گری پکارتی ہوئی دھڑلے کے ساتھ اندر کمرے میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا شٹل کاک برقعہ اتار کر پھینک دیا تھا۔ میں حیران اور کچھ بیزار سی اس کے عقب میں کمرے میں چلی آئی۔

"اماں! خیریت تو ہے...... کیسے آنا ہوا؟" میں نے پوچھا تو وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ "ارے بٹی! ذرا دم تو لینے دے...... اچھا سن یوں سمجھ تیرا نصیب جاگ گیا......"

"کیا مطلب؟" میں نے عجیب سے لہجے میں ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اری پگلی...... ادھر آ...... بیٹھ پہلے ادھر میرے پاس۔" اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ ہی چارپائی پر بٹھا لیا۔

"سن...... دیکھ بٹی......! تو مجھے اپنی بیٹیوں جیسی عزیز ہے...... تیرا بھلا میں نہیں

سوچوں گی تو اور کون سوچے گا...... سچ پوچھے تو تیرے جیسی ہیرا عورت کو یہاں گلتے سڑتے دیکھ کر میرا تو بڑا جی کڑھتا ہے۔"

"خالہ آپ کہنا کیا چاہ رہی ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" میں اس کے عجیب طرز تخاطب پر سپاٹ سے لہجے میں بولی۔ میری بات پر اس نے ذرا توقف کیا۔ پھر بولی۔ "اڑی میں نے بتایا ناں...... تیرے نصیب جاگ گئے ہیں...... اب تُو ہی بتا...... بھلا اتنی پہاڑ جیسی زندگی...... اس پر یہ نگوڑی جوانی بنا سہارے تو نہیں گزرتی ناں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ "تیرے جیسی خوبصورت عورت بنا سہارے کے بھلا کب تک یوں عمر بتائے گی۔ شکر مان میرا کہ ایک رشتہ لائی ہوں تیرا...... بڑا اچھا لڑکا ہے...... ٹھیکے داری کرتا ہے ادھر جناح اسکوائر میں اپنا مکان ہے...... پہلی سے بنی نہیں...... طلاق دے دی...... سب لوگ جانتے ہیں بیوی ہی کی خطا تھی...... بات تو میں نے یہ تیرے بابا سے کرنی تھی...... پر میں نے سوچا پہلے اپنی بٹیا رانی سے پوچھ لوں۔" اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان نے ذرا دم لیا تو میں نے اسے تقریباً گھورتے ہوئے پوچھا۔

"خالہ ذرا نام تو بتانا اس کا......" مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کی "بھیجی" ہوئی تھی...... لیکن پھر بھی اپنی تسلی چاہتی تھی۔ تاکہ ایک ہی بار اس مردود خالہ کے لتے لیتے ہوئے دھکے دے کر باہر نکال دوں اسے، کیونکہ اس کی زبان سے نکلنے والے لفظوں نے میرا پورا وجود سلگا کر رکھ دیا تھا۔

"بھورل خان نام ہے اس کا بٹی۔" اس نے بتایا اور مجھے اپنے بدترین اندازے کی تصدیق ہوتے ہی میں یک دم چارپائی سے کھڑی ہو گئی اور غصے سے پھنکتے ہوئے خالہ کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔ "خالہ کھڑی ہو جاؤ، اگر تو مجھ سے عمر میں بڑی نہ ہوتی تو میں تیری چٹیا پکڑ کر اور دھکے دیتے ہوئے باہر نکال دیتی یہاں سے......"

میری بات سن کر وزیرن خالہ کو جیسے یک لخت سانپ سونگھ گیا...... شاید اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا کہ میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ بھی کر سکتی ہوں۔ اگلے ہی لمحے پھر جیسے وہ ہوش میں آ گئی اور تنک کر بولی۔ "اے ہئے...... نا ادب...... نا تمیز...... تیرے بھلے کے واسطے......"



"بھاڑ میں گیا میرا بھلا...... اب تُو دفعان ہو جا یہاں سے ورنہ......" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔ میری آنکھوں سے ایک دم جیسے قہر و غضب کے شعلے لپکنے لگے تھے۔ جس کی تپش غالباً وزیرن نے بھی محسوس کر لی تھی...... کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر پہلے برہمی اس کے بعد قدرے خوف کے آثار نمودار ہوئے اور پھر اس نے اپنا برقعہ اٹھایا اور کمرے سے نکلتے نکلتے اسے اوڑھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میرا رواں رواں غم و غصے کی شدت سے سلگ رہا تھا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اپنی تقدیر کو کوسنے کے سوا میرے پاس اور رکھا ہی کیا تھا۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس بری طرح گھائل کرنے لگا۔ اس کمینے بھورل نے وزیرن کو اپنے ناپاک مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بات بھی بعید از قیاس نہ تھی کہ اس رذیل انسان بھورل خان نے وزیرن کو خاطر خواہ لالچ بھی دیا ہو گا۔ میں نے گھڑونچی پر رکھے مٹکے سے پانی کا گلاس بھر کر نکالا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ بھوک میری اڑ چکی تھی۔ اس ناخوشگوار واقعے کے بعد سے مجھے اب صحیح معنوں میں ایک انجانے سے خوف اور مستقل پریشانی نے آ لیا تھا۔ اب مجھے یہ گھر ہی کیا بلکہ پوری بستی ہی اپنے اور منی کے لئے غیر محفوظ نظر آ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس بھورل خان جیسے اوباش انسان سے کیونکر پیچھا چھڑایا جائے؟" جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے اب وہ اس واقعے کے بعد سے مجھ سے باقاعدہ دشمنی پر اتر آئے گا...... ان بدمعاش صفت لوگوں سے ہر طرح کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اس پر میں نے بالآخر یہی سوچا کہ سردست چپ ہی رہا جائے اور سب سے پہلے بابا کو کسی نہ کسی طرح راضی کرنے کے بعد یہاں سے خاموشی کے ساتھ شمشاد بیگم ایسی فرشتہ صفت خاتون کے ہاں منتقل ہوا جائے...... ہو سکتا ہے اس بستی سے میرے کوچ کر جانے کے بعد اس کی چیرہ دستیوں میں کمی واقع ہو جائے۔ اثنائے راہ...... بابا گھر آ گئے...... میں نے اپنا حلیہ ذرا درست کیا۔ کھانا نکالا جب تک بابا صحن کے کونے میں لگے نلکے سے منہ ہاتھ دھو کر اندر چارپائی پر آ بیٹھے اور اپنے کاندھے پر دھرے انگوچھے سے ہاتھ پونچھنے لگے۔ میں نے خاموشی کے ساتھ ان کے سامنے سالن کی پلیٹ اور روٹیوں کی چنگیر رکھی...... وہ کھانا کھانے لگے اور میں پانی لینے چلی گئی...... جب واپس آئی تو بے دلی کے ساتھ

خود بھی خاموشی سے کھانا زہر مار کرنے لگی۔ میری کھانے سے بے دلی بابا کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی وہ فوراً قدرے فکرمندی سے میری جانب تکتے ہوئے بولے۔

"ڑی دھیئے! توں مانی (روٹی) نہیں کھا رہی...... چاک تو ہے ناں تیری طبیعت؟"

"ہاں بابا......! آپ کھائیں روٹی۔ میرا آج جانے کیوں روٹی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔" میں نے مبہم سے لہجے میں اور ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ لیکن شاید بابا کی جہاندیدہ نگاہوں نے میرے چہرے پر دکھ اور پریشانی کے خار وخس بھانپ لئے تھے۔ نتیجتاً انہوں نے فوراً کھانے سے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"کیا بات ہے دھیئے! کوئی پریشانی ہے...... مجھے نہیں بتاؤ گی...... اپنے بابا کو......" انہوں نے محبت آمیز لہجے میں میرے کبیدہ خاطر چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"بابا......! ایسی کوئی بات نہیں آپ پہلے روٹی کھالیں۔"

میں نے درگزر کرنی چاہی لیکن بابا کی تو جیسے بھوک ہی اڑ چکی تھی...... تب وہ قطعیت سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "آمنہ دھیئے! میں بڈھا ضرور ہوں، پر ابھی میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ اپڑیں دہی کی چھاں کرسکوں...... چل مُن بتادے میکوں...... تیرا یہاں دل نہیں لگتا تو بتا...... کہیں اور چل کر رہیں...... بول میڈی دھی...... شاباش......" بابا کے لہجے میں جانے کون سا جادو تھا کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے...... یہی نہیں، میں نے ہچکیوں کے ساتھ باقاعدہ رونا شروع کردیا۔ بابا فوراً میرے قریب سرک آئے اور ازراہ شفقت میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"نہ میڈی دھی! روتے نہیں...... بتا...... کیا بات ہوئی ہے...... تُو واقعی مجھے کئی دنوں سے بہت زیادہ ہی پریشان نظر آ رہی ہے۔" بابا نے کہا اور میں نے پھر بھورل خان اور آج والے واقعے کے بارے میں بابا کو بتا دیا۔ حسب توقع میری بات سن کر بابا کو ایک چپ سی لگ گئی۔ میں جانتی تھی اندر سے وہ بھی میری طرح ایک ابال کی کیفیت سے دوچار تھے، لمحہ بھر توقف کے بعد وہ گونج دار لہجے میں بولے۔ "اس کتے بھورل کو میں اچھی طرح سے دیکھ لوں گا، ساری بستی اس کے کرتوتوں سے واقف ہے۔"



"نہیں بابا......! ایسے لوگوں کو چھیڑنا مناسب نہیں ہے...... دفع کریں۔" میں نے تڑپ کر کہا تو بابا جیسے یک دم بولے۔ "کیوں دفع کروں دھیئے! اس طرح وہ اور شیر ہو جائے گا۔ میں بستی کے وڈوں سے بات کروں گا...... بلکہ پولیس کے حوالے کروں گا اس مردود کو۔" بابا کے اندر کا ابال یک دم اٹھتا چلا آ رہا تھا...... میں نے محسوس کیا کہ غصے کی شدت سے وہ کپکپا بھی رہے تھے۔ میں نے فوراً انہیں پانی پلایا اور سمجھاتے ہوئے بولی۔ "بابا جب ہمارے پاس اس کتے کو چھیڑے بغیر نجات حاصل کرنے کا راستہ ہے تو پھر کیوں اسے پتھر مار کر اپنے پیچھے لگایا جائے۔" مقام شکر تھا کہ بابا کو میری بات سمجھ میں آ گئی تھی...... ان کا غصہ قدرے کم ہوا تو وہ استفہامیہ نظروں سے میری جانب تکنے لگے۔

تب میں نے یہ بہتر سمجھا کہ بابا کو آنٹی شمشاد کی مفید تجویز سے مفصل طور پر آگاہ کر دینا چاہئے...... لہٰذا بولی۔ "بابا! اب یہ جگہ ہمارے لئے مناسب نہیں رہی۔ مجھے یہ کہنے اور سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ آپ میری بات کو غلط نہیں سمجھیں گے۔ اگر قسمت ہمیں یہاں سے نکلنے کا اور کسی اچھی جگہ زندگی بسر کرنے کا موقع دے رہی ہے تو ہم کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔

آنٹی شمشاد اور انکل اسماعیل ایک نہایت ہی ہمدرد اور ملنسار لوگ ہیں...... آپ کو بھی وہاں اپنے اسکول میں آرام دہ نوکری دلا دیں گے...... اور ویسے بھی بابا...... آپ کی عمر اب اتنے بھاری ٹرک چلانے کی نہیں رہی...... بابا پلیز...... میرے اچھے بابا...... ہم آپ کے بغیر یہاں سے کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بابا آپ کو ہماری خاطر یہاں سے چلنا ہوگا۔ میری خاطر...... منی کی خاطر......" آخر میں میرا لہجہ رندھ سا گیا۔

بابا کے چہرے پر بھی رقت طاری ہوگئی تھی۔ کافی دیر تک ان کا جھریوں بھرا چہرہ کسی گہری سوچ میں غلطاں رہا، میری نگاہیں ان پر جمی رہیں، لمحہ بھر بعد وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ "دھیئے......! ہم جیسے بڈھوں کے لئے اپنی جگہ اپنا گھر اپنا علاقہ اور اپنی زمین کو خیر باد کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔" ان کے لہجے میں مجھے عہد رفتگاں کی کسک سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بہ غور ان کی بات سن رہی تھی۔ وہ بولے۔ "لیکن دھیئے! ابھی

کبھی ایڑیاں بال بچوں کی کھاتر...... ان کی اچھی زندگی کی کھاتر یہ تکلیف دہ فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ آمنہ دھیئے! تجھے شاید یہ معلوم نہیں کہ میرا بچپن بھی اسی گھر میں بیتا ہے، اسی گھر کے صحن میں جب میرا پیو تھکا ہارا آتا تھا تو میں اس کے کندھے پر چڑھ جاتا تھا، وہ اتنا تھکا ہوا ہونے کے باوجود مجھے پیار کرتا تھا...... آمنہ دھیئے...... اس گھر کی چھت تلے میں نے بڑی پیاری جنت دیکھی ہے۔ آج بھی میرے کانوں میں پیو کی شفقت بھری ڈانٹ...... آمڑ (ماں) کا دلار...... پھر میری زال (بیوی) عنایتاں کی محبت آمیز لڑائیاں...... سدھوری کی معصوم شرارت بھری گلکاریاں گونجتی رہتی ہیں، جو شاید مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں لیکن میں جانتا ہوں اگر میں نے یہ جگہ چھوڑ دی تو شاید زیادہ عرصہ جی نہ سکوں۔"

اتنا کہہ کر ان کا جی بے اختیار بھر آیا۔ وہ اپنا سر جھکا کر اپنے کندھے پر دھرے انگوچھے سے اپنے آنسو پونچھنے لگے اور مجھے اس سمے بابا پر بڑا ترس آیا...... پھر میں خود کو سرزنش کرنے لگی کہ میں بھی کیسی خود غرض اور تنگ نظر تھی...... کتنے آرام سے میں نے اس گھر کے در و دیوار کو بے قیمت اور بے وقعت جان لیا تھا بے شک اگر میرے لئے ان میں کوئی کشش نہ تھی لیکن بابا کے لئے تو بہر طور یہ قیمتی سرمایہ حیات تھے۔ میں کتنی خود غرض تھی کہ بڑے آرام سے میں یہ بات بھی بھلا بیٹھی تھی کہ اس سائبان نے کبھی مجھ بدنصیب و بے اماں کو بھی سایہ دیا تھا...... لیکن پھر منی کا ننھا منا معصوم سا چہرہ میری حسرت زدہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا تو میں بے اختیار دل مسوس کر رہ جاتی۔ لیکن بہر حال مجھے اپنے محسن کے ہی فیصلے کو مقدم رکھنا تھا۔ بابا اپنی کہہ کر چپ ہو رہے تھے اور میں نے قریب آ کر ان کے کندھے سے اپنا سر ٹکا دیا اور وہ ہولے ہولے پرشفقت انداز میں پیار سے میرے سر پر اپنا مرتعش ہاتھ پھیرنے لگے۔ تب میں اپنے آنسوؤں کو پیتی ہوئی گھٹے گھٹے انداز میں دھیرے سے مخاطب ہوئی۔

"بابا مجھے معاف کر دینا...... میں...... میں نے آپ کا دل دکھایا۔"

"نہیں دھیئے......! ایسا مت بول...... تیرا کوئی دوش نہیں...... تیرا کوئی دوش نہیں...... تو اپنی جگہ صحیح ہے، یہ تو مجھ بڈھے کے دماغ میں نجانے کیا سنک سمائی اور تجھ سے پتہ نہیں کیا اول فول بکتا چلا گیا۔ بھلا ان بوسیدہ سی باتوں میں کیا رکھا ہے، کچھ بھی



تو نہیں سوائے اپنا جی جلانے کے۔" بابا نے خود ہی اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ان کا لہجہ بڑا بوجھل اور اداس سا ہو رہا تھا وہ دوبارہ بولے۔ "میری دھی......! تو ایڈیں آنٹی سے بات کر لینا...... ساتھ ہی میری نوکری کی بھی بات کر لینا...... چھوڑ دیں گے ہم یہ علاقہ...... یہ جگہ...... یہ گھر......" وہ بولتے چلے گئے...... اور میرے سینے پر یہ انجانا سا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

معاً عصر کی اذان کی آواز آمنہ بیگم کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چونک کر اپنے ماضی کی گم گشتہ وادیوں سے نکل آئیں۔ پھر جب انہوں نے اپنی فیروزی رنگ کی ڈائری کو پڑھتے پڑھتے بند کیا تو انہیں یوں لگا جیسے وہ اچانک صدیوں پرانی دنیا سے نکل کر حال میں آ پہنچی ہوں اور یہ حقیقت تھی وہ جب بھی اپنے ماضی کے عبرت اثر واقعات کی راکھ کریدنے بیٹھتیں تو انہیں گرد و پیش کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔

بہر طور انہوں نے ایک لمبی اور تھکی تھکی سی سانس لے کر ڈائری کو بند کیا اور وضو کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سعدیہ ابھی تک گھر نہیں آئی تھی، باعث تاخیر اس کی خورشید قتل کیس میں حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت اور غیر معمولی دلچسپی تھی، جس سے آمنہ بیگم بہ خوبی واقف تھیں اسی لئے وہ مطلق پریشان نہیں ہوتی تھیں۔

❁❁❁

انسپکٹر ثناء اللہ عباسی نے جب اطمینان سے بیٹھ کر وکیل سعدیہ سعید سے لی گئی اس فائل کا مطالعہ کیا جس میں خورشید احمد قتل کیس کے متوقع اور اصل قاتل پرویز سے متعلق تفصیلی شواہد و واقعات مندرج تھے، تو وہ ایک لمحے کو دنگ سا رہ گیا اور وکیل سعدیہ کی فہم و فراست کا دل سے قائل ہونے لگا اور اسے اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ سعدیہ نے جس جانفشانی، عرق ریزی اور ذہانت سے اصل قاتل کو نہ صرف ڈھونڈ نکالا تھا بلکہ اس کے خلاف مختلف ذرائع سے حاصل شدہ شواہد اور دیگر تفصیلی کارآمد مواد بھی جمع کر کے قاتل کے گرد ایسا مضبوط و مربوط جال بُنا تھا کہ یہ کام اپنے محکمے (پولیس) کے بس کا نہ تھا۔

انسپکٹر ثناء اللہ کو خاص طور پر ڈینٹل سرجن ڈاکٹر عشرت سے حاصل کیا گیا پرویز کے دانتوں سمیت پورے جبڑے کا وہ نمونہ جو اس کے قاتل ہونے کا پورا پورا ثبوت پیش کر

رہا تھا انتہائی کارآمد اور مفید معلوم ہو رہا تھا اور یہی نہیں بلکہ مجرم کو محتاط اور چوکنا کیے
بغیر وکیل سعدیہ نے نہ صرف بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے اس کے گھر اور آفس کا
پتہ بھی حاصل کرلیا تھا۔

وکیل سعدیہ نے اپنی رائے تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اگرچہ واقعات وشواہد
خورشید احمد قتل کیس کے اصل مجرم پرویز کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے بلاشبہ اصلی
قاتل ٹھہراتے ہیں لیکن اگر قاتل ومقتول کے دونوں کے بیک گراؤنڈ کا بہ نظر غائر جائزہ
لیا جائے تو پرویز کی حیثیت ایک سفاک قاتل سے زیادہ محض ایک کٹھ پتلی یا کسی بڑے
گینگ کے مہرے سے بڑھ کر کچھ نہیں......''

فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد انسپکٹر ثناء اللہ عباسی کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ فائل بند
کر کے وہ عجیب گومگو کے عالم میں اپنی کرسی پر بیٹھا رہا، اس کی عقابی نظریں بظاہر کسی
غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں لیکن درحقیقت وہ تصور میں اس اصل مجرم کا چہرہ دیکھنے کی
سعی کر رہا تھا جو در پردہ رہتے ہوئے ڈوریاں ہلا رہا تھا۔

فائل کے مندرجات کے بارے میں غور کرتے ہوئے انسپکٹر ثناء اللہ عباسی سوچنے لگا
کہ آخر وکیل سعدیہ کا اشارہ کس بڑے مجرم کی طرف ہے، کیا اس مجرم سے سعدیہ خود
بھی واقف تھی...... یعنی کوئی شک...... یہ تو اس سے مل کر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ہی
معلوم ہو سکتا ہے۔ انسپکٹر ثناء اللہ کو امید تھی کہ سعدیہ ضرور اور بھی بہت کچھ جانتی
ہے...... حتیٰ کہ خورشید احمد کے قتل کے پوشیدہ محرکات کے بارے میں بھی، لیکن کسی
مصلحت کی بناء پر اس نے فائل میں ظاہر نہیں کیا۔ کیا بالمشافہ ملاقات پر وہ مزید کچھ
انکشافات کرے گی......؟ اس نے عجیب انداز میں سوچا اور جلدی سے ٹیلی فون سیٹ کی
طرف ہاتھ بڑھا دیا اور وہ ایڈووکیٹ رانا الطاف کے چیمبر کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

❁❁❁

بذریعہ فون ملاقات کا وقت لینے کے بعد بالآخر انسپکٹر ثناء اللہ چیمبر میں وکیل سعدیہ
کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ وہ دونوں اکیلے تھے......

''وکیل صاحبہ! واقعی آپ ہر میدان کی شہسوار نظر آتی ہیں......'' انسپکٹر ثناء اللہ نے
خوشدلی سے کہنا شروع کیا۔ جب کہ سعدیہ نے محض ہولے سے مسکراتے پر اکتفا کیا



تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر عجیب سی دلکشی دمک رہی تھی، اس کی نگاہیں میز پر رکھی
چائے کے برتنوں پر یونہی جمی ہوئی تھیں۔

انسپکٹر ثناء اللہ کا توصیفی وتہنیتی اندازِ بیان جاری تھا۔ ''آپ نے جس غیر معمولی
دلچسپی، ذہانت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خورشید قتل کیس کے پہلے بے گناہ مجرم
داد محمد عرف دادو کو باعزت بری کر دیا، اس کے بعد اصل مجرم پرویز تک پہنچنے پر اس
کے خلاف شواہد اکٹھے کر کے باقاعدہ ایک فائل مرتب کی اور وہ مفید اور کارآمد فائل
بڑی سعادت مندی کے ساتھ نکمی پولیس کے حوالے کر دی۔ بلاشبہ آپ کا یہ ایک قابلِ
لحاظ عمل اور ہم پولیس والوں پر بڑا احسان ہے۔''

''معاف کیجیے گا انسپکٹر ثناء اللہ صاحب! میں نے یہ فائل نکمی پولیس کے حوالے نہیں
کی، بلکہ ایک دیانتدار، محنتی اور فرض شناس پولیس افسر کے حوالے کی ہے۔'' معاً سعدیہ
نے انسپکٹر ثناء اللہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور مزید بولی۔ ''علاوہ ازیں میں نے
پولیس پر کوئی احسان نہیں کیا، بلکہ میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اصل
مجرموں کو بے نقاب کروں۔''

''باوجود اس کے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔'' انسپکٹر ثناء اللہ نے جلدی سے کہا اور
پھر فوراً مطلب کی بات پر آنے کی غرض سے مزید بولا۔ ''بجائے اس کے کہ یہ کسرِ نفسی
کی بحث طول پکڑے میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا مس سعدیہ صاحبہ کہ آپ کی یہ
فائل ہماری تفتیش کی گاڑی کو خاطر خواہ ایندھن فراہم کر سکتی ہے اور اس کی مدد سے ہم
انشاء اللہ اصل قاتل کو بھی بے نقاب کر کے رہیں گے...... لہٰذا اسی تناظر میں آپ سے
ایک اور مدد چاہوں گا...... وہ یہ کہ آپ نے فائل میں اپنے ایک مشاہداتی نوٹ میں کسی
پراسرار مجرم کی طرف اشارہ کیا ہے...... اگر آپ محض اپنے شک کی بناء پر ہی سہی اس کا
نام بتا دیں تو میں اصل مجرم تک مع ثبوت پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔''

اتنا کہہ کر انسپکٹر ثناء اللہ سعدیہ کے چہرے کی طرف کھوجتی نظروں سے تکنے لگا،
جانے کیوں وہ وکیل سعدیہ سعید کی تحریر سے کوئی اسرار بھانپنا چاہ رہا تھا...... ایسا اسرار
جسے ظاہر کرنے سے وہ ہچکچا رہی تھی۔ سعدیہ اس کی بات پر ایک لمحے کو بوکھلا سی گئی تھی
لیکن پھر جلد ہی سنبھلنے کے بعد اس کی جانب دیکھتے ہوئے مبہم سے لہجے میں بولی۔

"انسپکٹر صاحب! شاید فی الحال یہ بات آپ کو نہ بتا سکوں......"

"لیکن کیوں......؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"کوئی مجبوری سمجھ لیں......" وہ بولی۔

"کیا ذاتی نوعیت کی مجبوری ہے...... جس سے آپ گریزاں ہیں۔" انسپکٹر ثناء اللہ نے سعدیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا اور سعدیہ ایک دم چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

❁❁❁



وکیل سعدیہ سعید کو قطعی امید نہ تھی کہ انسپکٹر ثناء اللہ اس سے کوئی ٹیڑھا سوال بھی کر بیٹھے گا، مگر سعدیہ بھی ایک کائیاں تھی، بجائے جواب دینے کے الٹا سوال داغ ڈالا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ نے بھلا یہ کس طرح اندازہ لگا لیا کہ میں اپنی کسی ذاتی مجبوری کی بناء پر اصل مجرم کا نام نہیں بتا رہی۔"

ادھر انسپکٹر بھی بھٹکنے والا نہیں تھا، قدرے مسکراتے ہوئے بولا۔ "محترمہ وکیل صاحبہ! ابھی تو آپ نے خود ہی اقرار کیا ہے کہ آپ سر دست کسی مجبوری کی وجہ سے اصل مجرم یا پورے گینگ کا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں، جن پر آپ کو غالباً یقین کی حد تک شک بھی ہے۔" آخری ٹکڑا انسپکٹر نے غالباً سعدیہ کو پٹڑی سے اتارنے کے لئے اپنی طرف سے لگایا تھا، تب اس کی بات پر سعدیہ کو پچھتاوا سا ہونے لگا کہ اس نے رواروی میں بلاوجہ اس بات کو اپنے منہ سے نکال دیا تھا جسے اس زیرک انسپکٹر نے پکڑ لیا تھا۔ تاہم سعدیہ بات ٹالنے کی غرض سے ازراہ تفنن بولی۔

"چھوڑیں انسپکٹر صاحب، آپ تو ہم سے بالکل روایتی پولیس والوں کی طرح پوچھ گچھ کرنے بیٹھ گئے، یونہی میرے منہ سے رواروی میں نکل گیا ہوگا یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، بہر حال ویسے حیرت ہے آپ نے پرویز کی گرفتاری کے سلسلے میں ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہی اصل مجرم کی نشاندہی کر سکتا ہے اور ظاہر ہے اس سے یہ اگلوانا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا......"

سعدیہ نے اپنے تئیں خواہ مخواہ ایک طویل گفتگو کا سہارا لیا لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ انسپکٹر اس کی طویل گفتگو میں الجھ کر اپنی راہ سے بھٹک گیا اور جواباً بولا۔

"ایسا میں نے دانستہ کیا ہے، ویسے میں نے اپنی اسپیشل برانچ کے چند ہوشیار سادہ لباس ڈالے جوانوں کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا ہے۔ دراصل میں چاہتا ہوں اس کی

گرفتاری سے قبل میرے آدمی چوبیس گھنٹے اس کی خفیہ نگرانی کرتے ہوئے پہلے اچھی طرح سے اس کے معمولات کے بارے میں آگاہی حاصل کرلیں، بعدازاں میں اسے گرفتار کرلوں گا۔"

"مجھے آپ کا یہ طریقہ کار پسند آیا۔" سعدیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی...... میں گرم حلوہ یعنی پکی پکائی بھی طریقے سے کھانے کا عادی ہوں۔" انسپکٹر ثناء اللہ نے سعدیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، پھر مزید وضاحتی لہجے میں بولا۔

"چونکہ مجرم ڈیٹکٹ ہو چکا ہے اور جس کا سہرا بلاشبہ آپ کے بیرسٹر کمال کے سر جاتا ہے اسی لئے میں نے سوچا کہ اس کے معمولات پر پہلے نظر رکھی جائے، وہ کہاں جاتا ہے، کن کن لوگوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے...... یا وہ مزید کن پر اسرار اور خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے، نیز اس بات کی بھی آپ تسلی رکھیں کہ مجرم کہیں فرار ہوسکتا ہے۔ میرے آدمی اس کی طرف سے ذرا بھی غافل نہیں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا...... پھر مہربان مسکراہٹ سے سعدیہ کی طرف دیکھ کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔

❁❁❁

اس قسم کی الوداعی ملاقات دونوں کے لئے تکلیف دہ ہوتی تھی مگر دادو اس سے زیادہ متاثر ہوتا تھا کیونکہ وہ جب بھی شائلہ سے مل کر واپس اپنے گوٹھ جانے کا قصد کرتا تھا تو اسے یہ بھی پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کب دوبارہ لوٹ کر کراچی آئے گا......؟ آج جب وہ واپس گوٹھ جانے کے لئے شائلہ سے ملنے آیا تو خاصا کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ شائلہ کی کیفیت بھی کسی سے مختلف نہ تھی۔

"پتہ نہیں شائلہ...... میں جب تم سے ملنے کے بعد گوٹھ جاتا ہوں تو دل میں بڑا بوجھ سا محسوس کرتا ہوں۔" شائلہ کو ہمیشہ کی طرح دادو کے لہجے میں ایک دکھ کی سی کیفیت محسوس ہوئی...... بولی۔ "دادو! مجھے یقین ہے اس بار جب تم گوٹھ سے واپس آؤ گے تو تمہیں واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

دادو نے چونک کر اس کی سرمگیں آنکھوں میں دیکھا جہاں اسے امید کے دیئے سے جلتے نظر آئے...... مگر وہ خاموش رہا۔



"ویسے دادو! تم اس بار ہمیشہ کے لئے آؤ گے ناں...... اپنے امی ابو کو لے کر......"
اس نے اچانک وہ سوال کر ڈالا جس کا جواب دادو کے پاس بھی نہ تھا۔

"ہاں......" دادو جب بولا تو اس کے لہجے میں مبہم سی بے یقینی تھی، جسے شاید شائلہ سمجھ نہ پائی۔ وہ قدرے خوش ہو کر بولی۔ "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنے امی ابو کو سیدھے یہاں لے آنا...... میرے پاس، لیکن میں تمہیں ہرگز یہاں نہیں رہنے دوں گی...... شادی سے پہلے۔" شائلہ نے آخری معنی خیز جملہ قدرے دھیمے لہجے میں ادا کیا تھا...... وہ بے چاری جس کام کو اتنا آسان سمجھ رہی تھی وہی کام دادو کو مشکل نظر آ رہا تھا...... لیکن وہ اس کا اظہار شائلہ سے کر کے اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر طور وہ اندھی جدائی کا پتھر اپنے سینے پر رکھے وہاں سے چلا آیا۔

سہراب گوٹھ سے اس نے سستے روٹ والی لاری پکڑ لی اور بیٹھ گیا...... پھر وہ جامشورو پھاٹک سے چند کوس پہلے اترا تو اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا لیکن چونکہ یہ جون کے سخت اور طویل گرم دن تھے اسی لئے قریب کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے کچے پکے مکانوں کے خاکے واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ دادو ویران سڑک پر چند قدم چلتے رہنے کے بعد دائیں جانب ایک کچی پگڈنڈی نما راستے پر اتر گیا۔ یہ راستہ سیدھا اس کے گوٹھ کی طرف جاتا تھا، اس کے ایک جانب چٹیل میدان دور تک پھیلا ہوا تھا جب کہ دوسری جانب گندم، مٹر کے کھیت تھے۔ اس نے مختصر سی کپڑوں کی پوٹلی بھی تھام رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ خود میں مگن بل کھاتی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا لیکن دل و دماغ اس وقت کراچی میں اٹکا ہوا تھا اور شائلہ کی حسین صورت اور اس کی مدھ بھری باتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ اچانک چلتے چلتے وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

اس نے ایک مجہول سے بڈھے کو تیزی کے ساتھ اپنی جانب دوڑتے ہوئے دیکھا، وہ بڈھا جس کے سر اور داڑھی حتیٰ کہ بھنوؤں اور مونچھوں تک کے بال بھی بے تحاشا بڑھے اور مٹی سے اٹی ہوئی جٹاؤں کی طرح جھول رہے تھے...... اور وہ اس قدر مٹی سے میلے چیکٹ ہو رہے تھے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا اصل رنگ کون سا ہے، غرض اس بڈھے کی ہیت کذائی ایک پاگل اور غلیظ فقیر جیسی تھی یہی نہیں جب وہ دادو کے قریب پہنچ کر رکا تو اس کے گدلے اور مفلوک الحال وجود سے بدبو کے بھبکے سے اٹھتے

محسوس ہوئے۔

"ہے...... ہے چھورا...... تت...... تو نے میڈی دھی...... سسی...... سسی کو تو نہیں دیکھا......" وہ پاگلوں کی طرح دادو کو مخاطب کر کے بولا۔ "بتا ناں...... تو نے میری سسی کو دیکھا...... وہ...... گوٹھ والے کہتے ہیں کہ...... کہ...... مم...... میری سسی ریت میں دب گئی۔ دفن ہو گئی ہے...... مجھے پتہ ہے وہ کوڑ (جھوٹ) بولتے ہیں۔"

دادو بے چارہ اس اچانک افتاد سے پریشان سا ہو گیا تاہم اسے اس بدحال بوڑھے پر ترس بھی آیا لہٰذا نرم لہجے میں بولا۔ "بابا! تو کس سسی کی بات کر رہا ہے؟"

"ہے پٹ...... میڈی دھی...... سسی میڈی جوان دھی تھی وہ...... بتا ناں...... تو نے اسے کہیں دیکھا تو نہیں۔" جواباً اس بوڑھے نے اس بار دادو کو قدرے جھنجھوڑ کر کہا تو دادو ذرا گڑبڑا سا گیا اور اسے کوفت سی ہونے لگی۔ وہ اس بوڑھے کو پہچاننے کی ناکام سعی کرنے لگا۔ اس نے دل میں سوچا کہ لگتا ہے یہ اپنے گوٹھ کا ہی ہے۔ شاید کوئی پاگل ہے، جو اپنی جوان بیٹی کی موت کے جانکاہ صدمے سے پاگل ہو چکا ہے۔

وہ بولا۔ "بابا! نہیں، میں نے تمہاری سسی کو نہیں دیکھا...... پر تو یہاں کہاں اسے ڈھونڈ رہا ہے...... گوٹھ جا...... لوگوں سے پوچھ...... میں تو خود شہر سے ابھی آ رہا ہوں، مجھے بھلا کیا معلوم۔" دادو کی بات پر اس کی جھاڑ جھنکاڑ بھنوؤں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں بجھ سی گئیں اور سارا پاگل پنے کا دورہ اور جوش یک دم سرد پڑنے لگا۔ تب وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔ "گوٹھ کے ماڑوں (لوگ) میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں...... میری سسی تو بھنبھور کے ریگستان میں زندہ دفن ہو گئی ہے۔"

"نہیں بابا...... ایسا نہیں ہے...... وہ ضرور جھوٹ بولتے ہیں۔" دادو اسے دلاسا دیتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ اچانک دادو کسی خیال کے تحت چونکا اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔ اسے اچانک ہی فارم ہاؤس کی وہ اندھیری رات یاد آ گئی جب زمیندار اختیار علی کے دو لحیم شحیم غنڈوں نے ایک معصوم اور جوان لڑکی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی اور جسے بعد میں دادو نے اسے ان کے ہولناک پنجوں سے چھڑایا تھا پھر بعد میں زمیندار اختیار علی کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر زمیندار نے اپنے مہمانوں کو سخت سرزنش کرتے ہوئے اس معصوم لڑکی کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا



کر اسے گھر چھوڑنے کے لئے واپس لوٹ گیا تھا۔ نجانے کیوں دادو کا یونہی اس حرماں نصیب لڑکی کی طرف خیال چلا گیا تھا، تب اس نے کسی خیال کے تحت اس بوڑھے سے دریافت کیا۔ "بابا تمہاری بیٹی کو فوت ہوئے میرا مطلب ہے گم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہو گا۔"

"پٹ...... میں نے اپڑیں سسی کی جدائی کا ایک ایک لحہ گنا ہے، اسے گم ہوئے آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں...... پر...... مجھے لگتا ہے اسے...... اسے کوئی کھمب (اغواء) کر کے لے گیا ہے۔" اس بوڑھے نے یکدم بتایا اور دادو کو فوراً یاد آیا کہ یہ واقعہ کم و بیش اتنی ہی مدت کا ہے جس رات کو وہ فارم ہاؤس میں سویا تھا اور اس لڑکی کو بچایا تھا تو کیا وہی سسی تھی۔" اس نے سوچا۔ "لیکن اس لڑکی کو تو بعد میں زمیندار سائیں اپنی جیپ میں سوار کرا کر اس کے گھر چھوڑنے کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔" یہاں وہ ذرا الجھ سا گیا۔ ذہن ایک سنسنی خیز اور بے رحم سے شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگا اس کے اندر کھٹک سی ہونے لگی لیکن اسے اس بات پر سخت پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ کاش وہ اس لڑکی کا نام پوچھ لیتا۔ تاہم ایک خیال ذہن میں آتے ہی اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

"بابا! ایک بات بتاؤ ذرا سوچ کر کہ کیا تمہارے پاس تمہاری بیٹی سسی کی کوئی تصویر موجود ہے۔"

دادو کی بات سن کر وہ ایک دم چونکا پھر لحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "ہاں...... ہاں...... یاد آیا...... ایک بادشاہ سائیں کے میلے میں اس کی تصویر کھنچوائی تھی۔ وہ...... وہ ضرور میرے پاس ہو گی پر...... پر پٹ...... تو تصویر کا کیا کرے گا؟"

"بابا ہو سکتا ہے میں تمہاری سسی کی تصویر دیکھ کر اسے پہچان سکوں۔" دادو نے کہا تو ایک بار پھر اس بوڑھے کی جھریوں بھرے چہرے پر امید کی رمق سی دوڑی اور وہ بولا۔ "تو کیا تو نے میڈی دھی سسی کو دیکھا ہے کہیں...... بتا...... بتا ناں پٹ...... میکوں...... کہاں ہے وہ......"

"بابا...... آپ پہلے مجھے اس کی تصویر دکھا۔" دادو نے کسی خیال کے تحت پھر اپنا سوال دہرایا۔ جانے کیوں اس کے اندر ایک خدشہ بار بار سر ابھارتے ہوئے اس کے ذہن

کے کسی عمیق گوشے میں ایک بھیانک اندازے کی تصدیق چاہ رہا تھا۔ فارم ہاؤس کی اندھیری رات ایک معصوم دوشیزہ کا زمیندار اختیار علی کے غنڈوں کے ہاتھوں اغواء اور پھر بعد میں اختیار علی کا اس دوشیزہ کو جیپ میں سوار کروا کے اس کے گھر لے جانے کے لئے روانہ ہونا یہی وہ بات تھی جہاں سے دادو کو کھٹک لگ گئی تھی کہ کیا واقعی زمیندار اختیار علی اس معصوم دوشیزہ کو وعدے کے مطابق اس کے گھر پہنچا آیا تھا اور کیا وہ لڑکی اس مفلوک الحال بوڑھے کی بیٹی سسی، تھی جسے وہ دیوانہ وار ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا تھا۔

”تو کیا سوچنے لگا پٹ! چل ناں میرے ساتھ تیکوں میں سسی کی تصویر دکھاؤں آ۔“

وہ بوڑھا دادو کو سوچ میں مستغرق پا کر اچانک بولا تو دادو خیالات کے تانے بانے سے یکدم چونکا۔ اگرچہ پورے تین گھنٹوں کی کم توڑ مسافت نے اسے تھکا سا دیا لیکن ایک الم ناک کہانی کو متوقع انجام تک پہنچانے اور اپنے بدترین اندازے کی تصدیق چاہنے کے جنون نے دادو کو ہر قسم کی تکان سے یکسر عاری کر دیا تھا۔

پھر وہ اس بوڑھے کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا...... بوڑھے کے گھر پہنچنے تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گھر کیا تھا گارے مٹی کی کچی شکستہ دیواروں پر گھاس پھونس کی چھت منڈھ دی گئی تھی۔ اندر لالٹین کی مدھم پیلی روشنی مقدور بھر تاریکی کو چیرنے کی سعی کر رہی تھی۔ گھر خالی تھا اور ماحول سے عجیب سی غم انگیز وحشت برس رہی تھی۔ ایک تاریک سی کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہی...... اس بوڑھے نے جانے کون سے کونے کھدرے میں بکھرے ٹاٹ اور پوٹلیوں کے درمیان سے ایک میلے رومال میں سے تصویر نکال کر دادو کی جانب بڑھائی...... وہ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی اور ایک ہنستی مسکراتی جوان خوبصورت لڑکی کی تھی۔ مدھم روشنی ہونے کے باوجود معصوم لڑکی کے چہرے کے خدوخال واضح تھے اور جسے دادو فوراً پہچان گیا۔ تصویر دیکھتے ہی اسے ایک شدید جھٹکا لگا۔ اس کے اندر اس الم نصیب معصوم سی لڑکی کی درد انگیز سسکیاں گونجنے لگیں جس نے اسے ادا سائیں (بھائی) کہہ کر پکارا تھا...... دادو فوراً شکستہ سے بوسیدہ صحن میں آ گیا۔ جدھر پھونس کے سائبان تلے ایک ٹیڑھے میڑھے بھدے سے بانس کے ساتھ لالٹین جھول رہی تھی...... اس کی روشنی کے قریب ہوتے ہوئے دادو نے ہاتھ



میں پکڑی ہوئی تصویر کو ایک بار پھر غیر یقینی انداز میں دیکھا اور تب دکھ اور پچھتاوے کی ایک تیز ٹیس نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا وہ زخمی ہوئے دل کے ساتھ سوچنے لگا، کاش وہ اسی رات لڑکی کو بدطینت زمیندار اختیار علی کے ساتھ نہ بھیجتا۔ کیونکہ دادو اس تصویر کو دیکھ کر پہچان چکا تھا کہ یہی وہ سسی تھی جسے فارم ہاؤس والی رات کو غنڈوں کے نرغے سے نجات دلائی تھی۔

دادو کو اب بوڑھے سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بھلا کہتا بھی کیا اس بے چارے سے کہ...... اس کی معصوم سسی کو اس نے خود قعرفنا میں دھکیل دیا تھا۔ اس میں بے چارے دادو کا بھی کیا تصور تھا...... اسے کیا معلوم تھا کہ زمیندار اسے دھوکا دے دے گا...... معصوم سسی...... واقعی ظلم و جبر کے ریت میں زندہ دفن ہو گئی تھی۔ آسمان سے گری اور کھجور میں جا اٹکی تھی۔ پھر دادو بوڑھے مجہول کو حیران و پریشان چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔ راستے بھر وہ یہی سوچتا آ رہا تھا کہ آخر وہ زمیندار سے کس طرح سسی کے بارے میں استفسار کرے کہ وہ اس رات کو واقعی سسی کو اس کے گھر چھوڑ آیا تھا یا چالاکی سے دوبارہ اپنی حویلی لے جا کر اپنے بدمعاش مہمانوں کے دسترخوان پر سجا ڈالا تھا۔

”زمیندار سائیں! تجھے...... بتانا ہی پڑے گا کہ سسی کو تو نے کہاں گم کیا ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا......

سسی والے معاملے میں وہ اپنا مسئلہ بھول بیٹھا تھا کہ وہ اس بار گوٹھ آخری بار آیا ہے اور رات کی تاریکی میں خاموشی سے اس نے اپنے ماں باپ سمیت شہر کوچ کر جانا تھا تاکہ ساری عمر کے لئے زمیندار کے ناختم ہونے والے خودساختہ قرضے سے نجات مل سکے۔

۞۞۞

”نا...... میڈ اپٹ نا...... ایسا بھول کر بھی مت سوچنا...... ہمیں اِجت کے ساتھ یہاں دکت کاٹنے دے، کیوں بڑھاپے میں ہم کو خوار کرے گا۔“

ماما اللہ وسایا نے دادو کی بات سن کر حقے کا ایک گہرا کش لگاتے ہوئے کہا۔ رات تو دبے پاؤں گزر رہی تھی...... بوسیدہ صحن میں بکھرے ہوئے جابجا گھاس پھونس کے تنکے دریائے سندھ سے آنے والی ہواؤں کے زور پر ادھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ پھونس

کے چھپر نما سائبان کے بدنما بانس سے یرقان زدہ لالٹین جھول رہی تھی۔ صحن کے وسط میں میلی رلی اور گودڑی میں وہ چاروں اپنے گھٹنے سکیڑے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان میں گھٹیا سا حقہ رکھا ہوا تھا...... ماما وسایا نے اپنے بھانجے کی بات پر اسے کرارے جواب سے نوازتے ہوئے اور حقے کا گہرا کش لینے کے بعد نے اپنے قریب بیٹھے بہنوئی حضورے کی طرف بڑھا دی...... جس نے اپنی بے نور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے...... کپکپاتے، ٹٹولتے ہاتھ سے حقے کی نے تھامی...... پھر اپنے پوپلے منہ سے لگا کر جلدی جلدی دو تین کش لئے اس کے بعد اپنے ساتھ بیٹھی بیوی مائی تجل کی طرف بڑھا دی۔

دادو اپنے ماما وسائے کا کرارا جواب سن کر چپ سا ہو رہا...... لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ آگے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے سامنے ہی قریب بیٹھے ضعیف العمر ماں باپ کی طرف دیکھا...... جیسے وہ ان کی مرضی معلوم کرنا چاہ رہا ہو۔ لیکن بے سود، عرصہ ہوا وہ بے چارے سننے اور دیکھنے کی قوت سے تقریباً محروم ہو چکے تھے۔ زمیندار کی بیگار نے انہیں لیموں کی طرح نچوڑ دیا تھا...... لہٰذا اب گفتگو صرف ماما بھانجے کے درمیان ہی ہو رہی تھی۔

''ماما سائیں! تو سمجھتا کیوں نہیں......'' دادو نے چند ثانئے بعد توقف کے گویا قائل کرنے کی غرض سے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''شہر میں رہنے سے ہمیں بہت فائدہ ہو گا...... آخر کو کب تک ہم یہاں پڑے سڑتے رہیں گے۔ تو بتا اپڑیں مرشد کی قسم کھا کر...... کوئی ایک پل...... ایک گھڑی بھی ہم نے سکھ سے گزاری ہے...... یا آزادی کا سانس لیا ہے۔ صبح شام...... گرمی، سردی...... آندھی طوفان بارش میں جان توڑ محنت کرو...... اس کے بعد کیا ملتا ہے مٹھی بھر گندم یا چاول...... کام کے بدلے پیسے مانگو تو قرضے کی صورت میں ملتا ہے...... قرضہ بھی ایسا جو آگے چل کر غلام بنا ڈالتا ہے۔ ماما بات صاف ہے تم لوگوں نے کنویں کے مینڈکوں کی طرح یہاں خود کو گلا سڑا لیا...... اب دھڑیں واسطے میرا تو کچھ سوچو۔'' دادو کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے...... لہجہ رندھ گیا تھا۔ ماما وسایا کو دادو کے اس لہجے پر جانے کیوں تشویش سی ہونے لگی۔ وہ گھاگ آدمی تھا اور ان بزرگوں میں سے تھا جو محض عہد رفتہ کی باتوں کو ہی اپنے سینے سے نہیں لگائے



رکھتے بلکہ عہد حاضر اور فکر فردا کا التزام بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے بھانجے دادو کے لہجے سے پہلے بغاوت و سرکشی، پھر بے ادبی...... اس کے بعد مجبوری کی عاجزانہ التجا محسوس ہوئی اور آخری بات پر بالآخر ماما وسایا کو بھی متفق ہونا پڑ رہا تھا...... جس کا وہ ابھی اظہار نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ بہر طور ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دادو کی ماں تجل نے قدرے کھانستے ہوئے ماما وسائے سے پوچھا۔ ''ڑے ادا! میڈا پٹ دادو کیا کہتا ہے کچھ ہمیں بھی بتا۔'' تو ماما نے قدرے چلا کر کہا۔ ''میڈی ادی تجل! تیرا پٹ دادو کہتا ہے کہ وہ تیکوں اور بھا حضور کو اپڑیں نال شہر لے جاسان......'' ماما وسائے کی بات حضور نے بھی سن لی اور دونوں ہی اس کی بات اور اپنے بیٹے دادو کے عزائم سن کر جیسے بھمک گئے لیکن بجائے تجل کے جواب دینے کے دادو کا باپ حضور بول پڑا۔ ''نا...... میڈا پٹ ناں...... ایسا سوچ بھی ناں...... زمیندار سائیں نوں پتہ چل گیا تو ہماری خیر نہیں...... کیوں ہم پوڑوں (بڈھوں) کی پچھاڑی (بڑھاپا) کھراب کرتا ہے۔ تیکوں جاڑاں ہے تو سداں جا......'' اس کے ساتھ ہی وہ کھانسنے لگا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی حقے کی نے ماما وسائے کو تھما دی۔ دادو کی طبیعت بوجھل سی ہونے لگی۔ صحن میں ہوا اب بین کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ قریب ہی جھولتی ہوئی لالٹین کی لو بھی ہوا سے لرز رہی تھی...... جس کی وجہ سے ان چاروں کے ہیولے صحن کی شکستہ دیواروں پر لرزاں، عجیب اسرار بکھیر رہے تھے...... دادو نے مزید بولنا بیکار سمجھا اور چپ سادھ لی۔

❁❁❁

صبح دم وہ اوطاق میں موجود تھا۔ اگرچہ یہاں آنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن معصوم سسی کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں وہ زمیندار اختیار علی سے اس کے بارے میں کچھ بلکہ بہت کچھ پوچھنے آیا تھا۔ بہت کچھ اس لئے کہ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس رات وہ معصوم لڑکی (سسی) کو کہاں لے گیا تھا، جب اس کے دو مہمان نما بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑا کر اس نے اس کے حوالے کیا تھا...... تاکہ وہ اسے باعزت طریقے سے اس کے گھر پہنچا دے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی بھی وقت اس کے اور زمیندار اختیار علی کے درمیان تلخ بحثی ہو سکتی تھی۔ لیکن اوطاق میں اس کی مڈھ بھیڑ بجائے زمیندار کے اس کے کمدار اور مصاحب خاص مولا بخش سے ہو گئی...... کچھ ہاری

بھی زمین پر بیٹھے تھے...... مولا بخش سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھا تھا...... دادو پر نظر پڑتے ہی یکدم اٹھ کھڑا ہوا...... اس کے چہرے پر آ کر ایک رنگ سا گزر گیا پھر اگلے ہی لمحے معتدل ہوتا چلا گیا اور اب اس کے چہرے پر قدرے ناگواری سی کھنڈ آئی بولا۔

''اڑے بابا تو کدھر تھا اتنے دن......''

دادو جواباً خاموشی سے اس کے چہرے کی جانب تکتا رہا۔ پھر عجیب سے سپاٹ لہجے میں اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''سائیں وڈا! کدھر ہے...... مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے......'' مولا بخش اس کی بات سن کر بہ غور اس کا چہرہ تکنے لگا جہاں اسے کچھ اور ہی تیور نظر آ رہے تھے۔ بولا......''سائیں وڈا آج اوطاق نہیں آ سکتا۔ اس کی طبیعت چاک (ٹھیک) نہیں ہے...... پر تجھے اس سے کیا۔ بابا جا تو فارم ہاؤس سنبھال تیرے جانے کے بعد بیگاری بڑے ست ہوئے پھر رہے ہیں۔''

''لیکن مجھے سائیں وڈے سے پہلے ملنا ہے ضروری بات کرنی ہے مجھے اس سے، ٹھیک ہے میں حویلی میں ہی جا کر مل لیتا ہوں اس سے۔'' یہ کہتے ہوئے دادو واپس جانے کے لئے مڑا تو کمدار مولا بخش نے اسے آواز دی۔ ''ٹھہر جا ڑے چھوکرا! میں نے کہا نا سائیں وڈے کی طبیعت چاک نہیں ہے انہوں نے ملنے جلنے سے ہم کو منع کر رکھا ہے پر تجھے بات کیا کرنی ہے ان سے، مجھے بتا...... ہو سکتا ہے میں تیری بات سائیں وڈے تک پہنچا دوں۔''

دادو رک گیا...... چند ثانیے کسی سوچ میں مستغرق رہنے کے بعد اس نے اپنی قمیض کی جیب سے سسی کی تصویر نکالی۔ مولا بخش کے قریب آیا اور اس کے سامنے وہ تصویر کرتے ہوئے اس کے چہرے پر اپنی تیز نظریں جما کر بولا۔ ''اس چھوکری کو تم اچھی طرح جانتے ہو ناں۔''

مولا بخش نے جو تصویر پر نظر ڈالی تو بری طرح ٹھٹھک گیا...... دادو کی برماتی ہوئی نگاہوں نے مولا بخش کے چہرے کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگوں کو بھانپتے ہوئے اندازہ لگایا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

''یہ کون ہے......؟ میں نہیں جانتا اس چھوکری کو۔'' کمدار مولا بخش قدرے بوکھلا کر بولا۔ مگر اس کے لہجے میں چور دادو سے چھپا نہیں رہ سکا...... اس نے مولا بخش کے



چہرے سے جھوٹ کی لکیر محسوس کر لی تھی، اس نے دیکھا مولا بخش کچھ بے چین سا ہو گیا تھا تصویر دیکھ کر...... اس کے یک دم بوکھلا جانے کا عالم یہ تھا کہ اس نے پھر خود چند لمحوں بعد پوچھا۔ ''ویسے یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملے......؟''

''کیوں جھوٹ بولتے ہو مولا بخش۔'' دادو نے بالآخر زہر خند لہجے میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور اضافہ کیا۔ ''کیا تم اس معصوم چھوکری کو بھول بیٹھے...... مولا بخش...... جس رات تو فارم ہاؤس میں اپنے......''

''اڑے بابا بس کر...... کیا بکواس کرتا ہے...... پتہ نہیں کیا بکواس کئے جا رہا ہے تو۔'' مولا بخش نے یکدم اس کی بات کاٹتے ہوئے قدرے درشت اور بلند لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے کن انکھیوں سے ایک طرف حیران و پریشان بیٹھے ہاریوں کی طرف دیکھا جو عجیب عجیب نظروں سے ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے...... دادو، مولا بخش کا اشارہ سمجھتے ہوئے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو رہا، پر وہاں سے گیا نہیں...... وہ جان گیا تھا کہ مولا بخش ہاریوں کی موجودگی میں اس موضوع پر کوئی بات کرنے سے کترا رہا ہے۔ مگر دادو بھی ایک کائیاں تھا۔ وہاں سے ٹلا وہ بھی نہیں۔ بالآخر مولا بخش نے زمین پر بیٹھے ہاریوں کو غصیلے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اڑے بابا! تم لوگ کیا منہ تک رہے ہو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے...... آج سائیں بھوتار نہیں آئیں گے......'' وہ بے چارے مولا بخش کی جھڑکی سن کر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور اوطاق سے یوں ڈرتے کانپتے ہوئے نکلے جیسے انہیں ذرا بھی دیر ہوئی تو مولا بخش انہیں کھا جائے گا...... کچھ ایسی ہی نگاہوں سے تو مولا بخش نے ان بے چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے جھڑکا تھا۔

''ہاں بابا...... اب بول چھوکرا تیرا مقصد کیا ہے...... آخر تُو ہمیں ڈرانا چاہتا ہے۔'' ہاریوں کے وہاں سے جاتے ہی مولا بخش نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دادو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ دادو نے اس کے غصیلے لہجے میں چھپی ہوئی بوکھلاہٹ محسوس کرتے ہوئے قدرے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کمدار صاحب! تم میری بات کا مطلب غلط سمجھ رہے ہو۔ میں بھلا ایک غریب ہاری کا بیٹا تم کو کیوں ڈرانے لگا...... میں تو صرف اس لڑکی سسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے تم اور

تمہارے دو مہمان اس رات کو فارم ہاؤس میں اغواء کر کے لائے تھے اور جہاں میں بھی موجود تھا۔ لیکن بعد میں تمہارے سائیں بھوتار اس لڑکی کو اپنی جیپ میں بٹھا کر اس کے گھر چھوڑنے کی غرض سے لے گئے تھے۔ لیکن اس رات سے وہ لڑکی جس کا نام سسی ہے۔ اپنے گھر نہیں پہنچی اور اس کا بوڑھا باپ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" دادو نے تفصیلاً کمدار کو آگاہ کرتے ہوئے بتایا اور اپنی نظریں اس کے بدلتے چہرے کے تاثرات پر مرکوز کر دیں، کمدار کا چہرہ اس بار پھیکا سا پڑنے لگا۔ اس کے لہجے کی ڈھٹائی آمیز درشتی اب کافور ہونے لگی تھی لہٰذا وہ اس بار قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "ادھر آ بابا! ادھر تجھے میں سمجھاؤں گا...... ادھر بیٹھ آ میرے پاس۔" اس نے دادو کو جیسے پچکارا اور قریب بلایا۔ دادو اس کی طرف گھورتا ہوا قریب آیا مگر بیٹھا نہیں۔ "اڑے بابا! چھوکرا، بے نا اتھے چارپائی پر......" کمدار نے اپنے مونڈھے کے قریب رلی بچھی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دادو سے کہا۔

"نہیں کمدار سائیں میں ادھر ٹھیک ہوں آپ بات کرو مجھ کو آواز آ جائے گی۔" کمدار نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "دیکھو بابا! تو ایک غریب ہاری کا پٹ ہے۔ اس معاملے میں نہ ہی پڑ...... اب پتہ نہیں وہ چھوکری (سسی) کس کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور تو اس کا الزام ہمارے سر مڑھ رہا ہے...... جا، جا کر فارم سنبھال، شاباش...... میں سائیں وڈے کو کچھ نہیں بتاؤں گا کیا سمجھے ورنہ تو سمجھتا ہے اس تک بات پہنچ گئی تو......" اس نے ایک نیا پینترا بدلتے ہوئے دانستہ آخری جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ لیکن دادو اس کے ست رنگی لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی محسوس کرتے ہوئے اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سائیں وڈے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے بھی اب بھلا کہاں اس نے یہاں رہنا تھا مگر پھر اچانک اس معصوم اور حرماں نصیب لڑکی سسی کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے رقصاں ہونے لگتا اور اس کے انتہائی فریاد بھرے "ادا سائیں" کے الفاظ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگتے تو وہ بے چین سا ہو جاتا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ دادو کی کوئی بہن نہ تھی اور اس نے مجبور و بے کس لڑکی سسی کو ایک بہن ہی کے روپ میں دیکھا تھا۔ غریب لڑکی کے لہجے میں بے چارگی آمیز مان بھی محسوس کیا تھا۔ ایسا مان جن پر بہنیں فخر کیا کرتی ہیں اپنے بھائیوں



پر، پس یہی وہ لمحہ تھا جب دادو نے ایک اٹل فیصلہ کر لیا پھر گویا قطعیت بھرے لہجے میں کمدار مولا بخش سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو کمدار سائیں! میں اب آخری بار کہہ رہا ہوں سائیں وڈے سے کہہ دینا کہ سسی کو میں نے ایک بہن کا درجہ دے دیا ہے اور تو بھی اچھی طرح جانتا ہوگا کہ ایک بار ہم کسی لڑکی کو بہن کے روپ میں دیکھ لیں تو وہ پھر سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر اہم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آج شام تک میری بہن اپنے گھر جانی چاہئے۔ ورنہ ہمیں گوٹھ کی کچہری میں یہ بات لے جاؤں گا، سمجھے......"

یہ کہتا ہوا دادو وہاں سے پلٹ آیا۔ سارے راستے وہ اپنے الفاظ پر سوچتا آیا جو اس نے بغیر کسی ڈر و خوف کے کمدار مولا بخش سے کہے تھے۔ دادو اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مولا بخش زمیندار اختیار علی کا مصاحب خاص ہے اور وہ نہ صرف اس تک یہ دھمکی پہنچائے گا بلکہ اسے اس کے خلاف ورغلانے کی بھی کوششیں کرے گا۔ لیکن دادو کو اب ان سب باتوں کی مطلق پروا نہیں تھی، اس کا رخ اب اپنے گھر کی طرف تھا۔

۞۞۞

"واہ بھئی! یہ اپنا انسپکٹر ثناء اللہ تو بڑے برق رفتار پولیس افسر نکلے۔ آناً فاناً پرویز کو گرفتار بھی کر لیا اور عدالت سے ریمانڈ بھی لے لیا۔" خوبرو کمال نے سعدیہ سے کہا اور جواباً سعدیہ نے پرسوچ انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔ "لگتا ہے اب خورشید احمد قتل کیس کا قضیہ جلد ہی نمٹ جائے گا۔" کمال نے سعدیہ کی خاموشی پر مزید کہا تو اس بار سعدیہ بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے جواباً بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ پرویز اس کیس میں تنہا ملوث ہے۔" سعدیہ نے جیسے پہلی مرتبہ کمال کے سامنے انکشاف کیا تو کمال چونکے بنا نہ رہ سکا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ پرویز کی حیثیت میرے سامنے مجرم سے زیادہ ایک کٹھ پتلی کی سی ہے جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں ہے۔" سعدیہ نے کہا تو کمال کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ بولا۔ "ہاں یاد آیا میں نے تمہاری تحریر کردہ "خورشید قتل" کی فائل پڑھی تھی اس میں تم نے لکھا تھا کہ پرویز کے پیچھے پورا گینگ ہے۔ اس سلسلے میں ذرا روشنی ڈالنا فرمائیں گی محترمہ وکیل صاحبہ! پلس جاسوس ڈبل ادسیون۔"

"اگر تم بجائے بھونڈا مذاق کرنے کے غور کرو تو اس نتیجے پر باسانی پہنچ جاؤ گے

کہ......"

"اچھا...... اچھا زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔" کمال نے سعدیہ کی بات کاٹتے ہوئے قدرے زچ ہو کر کہا تو سعدیہ نے اسے مزید ستائے بغیر کہا۔"اگر تم مقتول خورشید اور پرویز کے بیک گراؤنڈ پر ذرا غور کرو تو بہ ظاہر ان دونوں کے بیچ کوئی ایسی بات سامنے نہیں آتی کہ پرویز قتل جیسا اقدام کر بیٹھے کیونکہ پرویز کا ماضی اس طرح کے جرائم سے پاک ہے۔"

"ہو سکتا ہے دونوں کے بیچ کسی دیرینہ جھگڑے کی بنیاد چلی آ رہی ہو جو آخر کار خورشید احمد کے قتل پر منتج ہوئی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔" سعدیہ نے کمال کی بات رد کرتے ہوئے کہا اور مزید بولی۔"دونوں کے بیچ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ دونوں ہی ایک کمپنی میں ادنیٰ سے ملازم تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پر امن گھریلو زندگی بسر کر رہے تھے۔تم صرف اس موٹی سی بات سے اس امر کا یقینی اندازہ لگا سکتے ہو کہ جب خورشید احمد کا قتل ہوا تو دادو کو ایک بروقت سوچی سمجھی سازش کے تحت گرفتار کروا دیا گیا یہی نہیں بلکہ اس سیدھے سادے دیہاتی نوجوان کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے نہ صرف پولیس بلکہ عدالت اور استغاثہ کے وکیل کو بھی خرید لیا گیا اور یہ کام ایک اوسط زندگی بسر کرنے اور ادنیٰ ملازمت کرنے والے پرویز کے بس کی بات نہیں تھی۔ ضرور اس کی پشت پر کسی "بڑے" کا ہاتھ تھا۔ جس نے اپنے تئیں پرویز کے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔"

سعدیہ کی صراحت بھری گفتگو پر کمال بھونچکا سا رہ گیا...... اسے سعدیہ کی باتوں میں خاصا وزن محسوس ہوا تھا اور تب وہ سعدیہ کی بات پر اتفاق کرنے کی غرض سے بولا۔

"تمہارا مطلب ہے کسی "بڑے" نے اپنے کسی خاص مقصد کے لئے مقتول خورشید احمد کا قتل پرویز سے کروایا اور پھر......"

"بالکل درست......" سعدیہ یک دم درمیان میں بول پڑی۔

"وہ "بڑا" کون ہے پھر......؟" کمال نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔ آج اسے صدق دل سے اعتراف ہو رہا تھا کہ سعدیہ محض ایک ذہین وکیل ہی نہیں بلکہ اس سے



بھی آگے کی "چیز" تھی جس نے اندر ہی اندر بہت سی باتوں کا کھوج لگا لیا تھا جو "اصل قاتل" کو بے نقاب کرنے والی تھی۔ سعدیہ، کمال کی بات پر دھیرے سے مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ میں فخر آمیز رعونت کی بجائے کسی گھناؤنے ڈرامے پر سے دھیرے دھیرے اٹھنے والے پردے کی فتح کا راز مضمر تھا جس کا سہرا بلاشبہ اس کے سر جاتا تھا۔ بہر طور...... سعدیہ نے پھر انکشاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا۔"تمہیں شاید معلوم ہو کہ مقتول خورشید احمد "عثمان ٹریڈرز" نامی ایک فرم میں گوڈاؤن کیپر تھا اور اس فرم میں پرویز بھی کام کرتا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے مذکورہ قتل میں "عثمان ٹریڈرز" ملوث ہے یا اس سے کوئی "بڑا"...... کمال نے یک دم درمیان میں کہا تو سعدیہ نے بھی اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"وہ "بڑا" پھر کون ہو سکتا ہے سعدیہ؟" کمال نے پوچھا۔

"عثمان ٹریڈرز" کا روح رواں...... واثق علی۔" سعدیہ نے پورے تیقن سے گویا انکشافات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی اور اسی سے اس کا ملیح چہرہ بھی کسی ناگوار اور خفیہ جوش سے تمتما اٹھا...... کمال تو یہ سن کر کافی دیر گم صم سا رہا۔ لیکن پھر اچانک وہ سعدیہ کی جانب کچھ عجیب سی نظروں سے تکتا ہوا بولا۔"کیا تم قیاسات کی یہ ساری کھچڑی اس لئے پکار رہی ہو تا کہ تم اپنے ایک دیرینہ انتقام کی آگ کو سرد کرنے کی غرض سے اپنے باپ واثق علی کے گرد جال تنگ کر سکو۔"

"نہیں...... ہرگز نہیں کمال! مجھے افسوس ہے تم نے بالکل ایک عامیانہ سی بات سوچی۔" کمال کی پر تشکیک گفتگو نے سعدیہ کو جھنجھوڑ سا دیا کیونکہ کمال اس بات سے پوری طرح واقف تھا کہ واثق علی سعدیہ کا باپ تھا جس نے اس کی ماں آمنہ بیگم کو دھوکا دیتے ہوئے اس کی پیشانی پر طلاق کی مہر ثبت کر کے بے یار و مددگار گھر سے نکال دیا تھا لہٰذا سعدیہ کو کمال کی اس بات نے جھنجھوڑ سا دیا تھا کہ وہ شخص اپنے باپ سے اپنی ماں پر کئے گئے ظلم کا انتقام لینا چاہ رہی ہے اور اسے خواہ مخواہ خورشید قتل کیس میں ملوث کر رہی ہے، لیکن کمال کی یہ بات غلط تھی...... کیونکہ سعدیہ نے محض اپنے ذاتی اور دیرینہ مقصد کے لئے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا بلکہ اس میں اس کی خود خورشید احمد کے قتل

کے اصل مجرم کو تختۂ دار تک پہنچانے کے لئے ایک اور غیر جانبدارانہ کوشش کارفرما تھی اب یہ حالات کی بوالعجبی تھی یا پھر کاتب تقدیر واثق علی کو مکافاتِ عمل سے دوچار کرتے ہوئے اسے اس کی اپنی بیٹی سعدیہ سعید کے ذریعے منطقی انجام تک پہنچا رہا تھا۔

خورشید احمد قتل کیس کی کڑیاں پہلے پرویز پھر "عثمان ٹریڈرز" اور اس کے بعد سعدیہ کے باپ واثق علی سے جا ملی تھیں لیکن جب سعدیہ نے اپنے استدلال کے زور پر مفروضے کا اظہار کیا تو کمال کا بھی اس پر جانبداری کا شک کرنے کا جواز بن رہا تھا جس نے سعدیہ جیسی لڑکی کو ایک لمحے کے لئے کمال سے خائف سا کر دیا تھا مگر یہ خفت محض عارضی ثابت ہوئی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے کمال سے اپنی بات کی معافی مانگ لی تھی مگر کوتاہ بین کمال بھی نہ تھا اسے بھی اب ان سب باتوں کے تناظر میں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ سعدیہ کی بات کافی حد تک درست ہے۔ کچھ دنوں کے درمیان پر سوچ خاموشی طاری رہی اس کے بعد سعدیہ نے اچانک کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کمال! اٹھو ذرا تھانے چلتے ہیں...... مجھے امید ہے انسپکٹر ثناء اللہ نے پرویز سے کچھ نہ کچھ ضرور اگلوا لیا ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے وہ خود بھی ہمیں کچھ بتانے کے لئے بے چین ہو۔" سعدیہ نے یہ بات اتنے تیقن سے کہی تھی کہ کمال کو ایک لمحے کے لئے سعدیہ پر مافوق الفطرت ہستی ہونے کا گمان ہونے لگا کیونکہ جب یہ دونوں ایڈووکیٹ رانا الطاف کے چیمبر سے روانہ ہوئے اور انسپکٹر ثناء اللہ عباس کے پاس پولیس اسٹیشن پہنچے تو واقعی وہ انہی کا منتظر تھا۔

"آیئے جناب! میں آپ ہی لوگوں کا منتظر تھا، تشریف لائیں۔" ان دونوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انسپکٹر ثناء اللہ نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر پرتپاک استقبال کرنے کے بعد اس نے بڑے احترام کے ساتھ سعدیہ اور کمال کو اپنے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔ سعدیہ نے انسپکٹر ثناء اللہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جیسے وہ کسی الجھن میں مبتلا ہو۔ تاہم ابتدائی رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد کمال نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! پرویز سے کچھ معلوم ہوا اب تو اس کے ریمانڈ کی مدت بھی ختم ہونے کو ہے۔ اس نے کم از کم اقرار جرم تو کر لیا ہوگا؟"

اس کی بات سن کر انسپکٹر ثناء اللہ نے پرخیال نظروں سے دونوں کی جانب دیکھتے



ہوئے کہا۔ "پرویز نے خیر اقبال جرم تو کر لیا ہے اور میں اس پر تین سو دو کا چالان بنا کر اس کا مقدمہ عدالت کے روبرو پیش کروں گا مگر......"

"مگر کیا انسپکٹر صاحب!" سعدیہ یک دم بولی تو انسپکٹر ثناء اللہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "مس سعدیہ! وہ ابھی یہ نہیں بک رہا کہ اس نے آخر کس کے ایماء پر خورشید احمد کا قتل کیا ہے؟"

اس کی بات سن کر سعدیہ کا چہرہ بجھ گیا اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے انسپکٹر دوبارہ سعدیہ سے بولا۔ "لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ان لوگوں کا بھی نام بتا دے جن کے ہاتھوں میں بقول آپ کے اس کی ڈوریاں تھیں۔" انسپکٹر کی بات پر سعدیہ کو گہری چپ سی لگ گئی...... یوں وہ اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی ہو۔ "ویسے میں سعدیہ صاحبہ! ایک بات کا مجھے اب پورا یقین ہو چلا ہے کہ خورشید احمد قتل کیس میں "عثمان ٹریڈرز" کے واثق علی کا پورا پورا ہاتھ ہے۔" آخر میں ثناء اللہ کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا۔

"کیا مطلب؟" وکیل سعدیہ نے قدرے چونک کر استفسار کیا تو وہ پراسراری مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "پرویز کے گرفتار ہوتے ہی واثق علی میرے پاس آیا تھا، پرویز کی رہائی کے سلسلے میں اور اس سلسلے میں مجھے بڑی بھاری رشوت کی پیش کش کر رہا تھا۔" اس نے جیسے دھماکہ کیا...... کمال اور سعدیہ دونوں چونکے بنا نہ رہ سکے تھے۔

"انسپکٹر صاحب! آپ فوراً اسے رشوت دینے کے الزام میں اندر کر دیتے۔" کمال نے فوراً کہا تو وہ فلسفیانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ "میں ایسا بھی کر سکتا تھا مگر میرا اصول یہ ہے کہ کسی "بڑے" مجرم کو اس کی بے خبری میں پکڑنا چاہئے ورنہ وہ مختلف وسیلوں سے خود کو باسانی رہا کرا سکتا ہے اور واثق علی کے پاس مضبوط وسیلہ اس کی بے انتہا دولت ہے۔" سعدیہ کو اس بات سے اتفاق تھا مگر وہ خاموش رہی...... وہ اب مطمئن تھی کہ انسپکٹر ثناء اللہ جو کچھ کر رہا ہے وہ درست ہے وہ ایک دن ضرور اصل مجرم پر ہاتھ ڈال کر ہی رہے گا۔ بہرطور تھوڑی دیر اور وہاں رکنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہوئے۔

پھر جب وہ واپس دوبارہ ایڈووکیٹ رانا الطاف کے چیمبر میں آئے تو سیکرٹری نے آ
کر مطلع کیا کہ کوئی صاحب انتظار گاہ میں ان کے منتظر ہیں۔
"کون ہیں وہ...... کیا وہ ڈیڈی سے ملنا چاہتے ہیں؟" کمال نے سیکرٹری سے کہا
تو وہ بولی۔
"جی نہیں...... وہ سعدیہ صاحبہ سے ملنا چاہتے ہیں اور خاصی دیر سے منتظر ہیں۔"
سیکرٹری نے بتایا اور سعدیہ نے پھر سیکرٹری کو ان صاحب کو اندر بھیجنے کے لئے کہا۔ پھر
سیکرٹری کے جاتے ہی ایک شخص اندر داخل ہوا جس پر نظر پڑتے ہی کمال اور سعدیہ
دونوں بری طرح چونکے۔ سامنے سعدیہ کا باپ موجود تھا...... واثق علی......

❁❁❁



"تشریف رکھیں......" وکیل سعدیہ سعید اپنے باپ واثق علی کو دیکھ کر بولی۔ اس نے
کسی قدر خود پر قابو پا لیا تھا اور چونکنے کی کیفیت سے نکل آئی تھی۔
"شکریہ......" کہتے ہوئے واثق علی قریب کے ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔
کمال اور سعدیہ مستفسرانہ نظروں سے واثق علی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ واثق علی نے
بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور بشرے سے خاصی لاپروائی ہویدا تھی۔ وہ
سعدیہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا مطمع نظر بیان کرنے کی غرض سے ذرا
کھنکھار کر بولا۔
"مس سعدیہ! میں ایک کیس کے سلسلے میں آیا تھا میری فرم "عثمان ٹریڈرز" کا ایک
ملازم ہے پرویز، جسے پولیس نے خورشید احمد قتل کیس کے سلسلے میں بے گناہ گرفتار کر لیا
ہے، لہٰذا میں آپ سے وکیل صفائی کے طور پر کیس لڑنے کی درخواست کرنے آیا تھا۔"
واثق علی نے اپنی بات ختم کی۔ سعدیہ نے اس کی بات سن کر اپنے اندر ہونے والی ایک
نفرت انگیز ہلچل پر قابو پایا۔ تاہم جب وہ جواباً اس سے بولی تو اس کا لہجہ حد درجہ سپاٹ
تھا۔ "دیکھئے واثق صاحب! آپ کا ملازم پرویز اگر واقعی بے گناہ ہے تو وہ باعزت بری
ہو سکتا ہے لیکن اگر اس پر فرد جرم ثابت ہو گئی تو نہ صرف اسے بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے جتنے
بھی اس کی ڈوری ہلانے والے "بگ باس" ہیں انہیں بھی پھانسی کے پھندے سے دنیا
کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔"
یہ کہتے ہوئے سعدیہ نے بہ غور اپنے باپ واثق علی کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے
پر ایک تغیر سا آ کر گزر گیا۔ غالباً سعدیہ کے آخری الفاظ نے اسے ذرا گڑبڑا سا دیا تھا
اور یہی سعدیہ بھانپنا بھی چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی معنی خیز مسکراہٹ ابھری
تھی۔ تاہم جب واثق علی بولا۔ تو اس کے لہجے میں ہلکی سی طنز آمیز چبھن تھی۔ "دیکھئے

محترمہ! اب میں اس بحث میں تو پڑنے نہیں آیا کہ اصل مجرم کون ہے؟ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ پرویز میرا ایک ادنیٰ ملازم ہے جو شریف اور بے گناہ بھی ہے، اس کو بے قصور ثابت کرنے اور عدالت سے باعزت بری کرنے کے لئے میں آپ کو منہ مانگی فیس بھی دے سکتا ہوں۔"

"ویسے آپ کو اپنے ادنیٰ ملازم کی رہائی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ مسٹر واثق علی!" جواباً سعدیہ نے بھی قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا مگر پھر جلد ہی اسے اپنے بچگانہ سوال کا احساس ہو گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا واثق علی فوراً بولا۔ "یہ میری اور کمپنی کی ساکھ کا معاملہ ہے۔"

سعدیہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بعد اچانک اسے کیا سوجھی کہ وہ اپنے ملیح چہرے پر پروفیشنل مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولی۔ "آپ ایسا کریں کہ میری رہائش پر تشریف لے آئیں، میرا خیال ہے وہاں زیادہ بہتر طریقے سے بات ہو سکتی ہے اور فیس کے سلسلے میں بھی کچھ طے ہو سکتا ہے۔"

واثق علی نے جواباً مسکرا کر حامی بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا پھر اس کے بعد سعدیہ نے اپنے پرس سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کل شام تشریف لے آئیں میرے گھر....."

"ویسے میں چاہتا ہوں کم از کم پرویز کی ضمانت ہو جائے۔" اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی ہو جائے گی بہت جلد....." سعدیہ نے عجیب سی نظروں سے اپنے باپ واثق علی سے کہا اور پھر اس کے رخصت ہونے کے بعد کمال فوراً سعدیہ سے مخاطب ہوا۔ "واہ کیا ٹریجک فلمی سین تھا۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کے روبرو تھے اور باپ لاعلم تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے شرف کلام حاصل کر رہا ہے اور وہ بھی اس بیٹی سے جس نے اپنے باپ کو کٹہرے میں گھسیٹنے کے لئے پورا پورا عہد کر رکھا ہے۔ ویسے محترمہ! کیا آپ میری حیرت دور کریں گی کہ آخر آپ اس کی مدد کیوں کرنا چاہتی ہیں..... اور وہ بھی اپنے گھر بلا کر....."

اس کی بات سن کر سعدیہ نے اپنی پر سوچ نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز کرتے



ہوئے کہا۔ "کمال میں اسے بہت بڑا شاک دینا چاہتی ہوں تاکہ وہ جان لے کہ وہ جس کے گھر میں سوالی بن کر آیا ہے انہی کو اس نے بے گھر کر دیا تھا..... اور میں اس عورت کی بیٹی ہوں جس کا وہ حق مار کر آج "عثمان ٹریڈرز" کا روح رواں بنا بیٹھا ہے اور وہ یہ بھی جان لے کہ جس عورت کا اس نے سب کچھ چھین کر بے یار و مددگار اپنے در سے دھتکار دیا تھا اب اسی مظلوم عورت کی بیٹی کے در پر وہ سوالی بن کر آیا ہے۔ یہ جان کر وہ جتنا سوچے گا، اتنا ہی اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے سعدیہ کا ملیح چہرہ جوش و جذبات کی بوچھار سے سرخ ہو گیا تھا۔ کمال کے لئے ہمیشہ اس کا یہ روپ اچنبھے کا باعث بنتا تھا۔ وہ اسے پل میں ایک نرم و نازک لڑکی سے یک دم ایک آتش جوالہ سی محسوس ہونے لگتی تھی۔

"تم شاید واثق علی کے چہرے کو پڑھ نہ سکے، وہ اندر سے بہت گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ میرے سو فیصد اور محتاط اندازے کے مطابق پرویز جیسے قاتل کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ پردہ اس نے ہی اپنے کسی مذموم مقصد کی خاطر بے گناہ اور معصوم خورشید احمد کا قتل کروایا ہے کیونکہ جو شخص دولت کی خاطر اپنی مظلوم بیوی کی پیشانی پر طلاق کا داغ سجا کر اسے گھر سے دھکے دے کر گھر سے نکال سکتا ہے تو ایسے بد طینت شخص سے ہر قسم کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔" سعدیہ اپنی رو میں کہتی چلی جا رہی تھی..... لحظہ بہ لحظہ اس کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کمال نے بھی جانے کیوں اسے درمیان میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا تھا اور خاموشی سے اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ تب پھر ذرا دیر بعد ہی سعدیہ کی کیفیت معتدل ہو گئی اور کمال کو مخاطب کرتے ہوئے گویا استفسار طلب لہجے میں بولی۔ "ویسے کمال! یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آخر واثق علی جیسے با اثر اور دولت مند شخص نے مذکورہ کیس کے سلسلے میں میری ہی خدمات کیوں لینی ضروری سمجھیں، وہ کسی اور کو بھی تو وکیل مقرر کر سکتا تھا..... میں تو پھر بھی ابھی اپرنٹس شپ پر ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا کہ آپ نے مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع فراہم کیا، ویسے تو یہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اس نے یقیناً پچھلے مقدمے میں یعنی جب دادو کو خورشید احمد قتل کیس میں پھنسایا گیا تھا، دوران جرح تمہارے جوہر دیکھ لئے ہوں گے

اور وہ دل سے تمہاری پر اثر وکالت کا قائل ہو گیا ہو گا۔“ کمال نے خوشدلی سے کہا اور سعدیہ اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگی جیسے وہ اس بات کا قبل ہی اندازہ لگا چکی ہو۔

❀❀❀

آمنہ بیگم نے سلام پھیرا...... پھر ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر وہ تخت سے نیچے اتر آئیں۔ دیوار گیر گھڑی میں اڑھائی کا وقت تھا، باہر صحن میں دھوپ کی تپش کمرے میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ حسب معمول آمنہ بیگم نے الماری سے اپنی فیروزی رنگ کی ڈائری نکالی اور اپنے عہد رفتہ کی تلخ و شیریں دنیا میں کھو گئیں۔

”اس دن کے بعد میں نے پھر بابا سے اس اندھیری اور شکستہ بستی سے کوچ کرنے کے سلسلے میں بات نہیں کی اور تن بہ تقدیر ہو کر لشتم پشتم زندگی گزارنے لگی۔ پھر یوں ہوا، انہیں دنوں سدھوری آ گئی، اس کے ہمراہ بچے بھی تھے رمو، دلو اور نینو...... تینوں اب ماشاء اللہ بڑے ہو گئے تھے۔ میری بچی بھی اب ماشاء اللہ سات سال کی ہو چکی تھی۔ سدھوری کا شوہر بچل اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا سدھوری اب بہت سکھی تھی۔ اس کی صحت بھی اب پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی، جو اس بات کی بین گواہ تھی کہ اس کا شوہر بچل اب راہ راست پر آ گیا تھا۔ بابا بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گئے تھے اور سدھوری کے آنے سے گھر میں کچھ رونق بھی ہو چکی تھی۔ لیکن یہ الگ بات تھی کہ اس کے تینوں بچے بہت شریر تھے سارا دن گھر میں اودھم مچائے رکھتے تھے جس کی وجہ سے میری بچی سعدیہ کی پڑھائی بھی خاصی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ یہ اس دن رات کا ذکر تھا مجھے سعدیہ کے ساتھ چونکہ صبح دم اسکول جانا ہوتا تھا، اس لئے رات کو جلد ہی سو جاتی تھی۔ بابا اور سدھوری باہر شکستہ سے صحن میں چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے جب کہ میں اندر کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ بابا اور سدھوری آپس میں باتوں میں مصروف ہیں، مجھے ٹوہ لینے کی عادت تو نہ تھی لیکن یونہی اچانک مجھے بابا کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ وہ سدھوری سے کہہ رہے تھے۔

”دھی! میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں، تیس ہزار تو بہت بڑی رقم ہے میرے لئے۔“

”پیو! بچل کہتا ہے کہ اگر میرا دھندہ چل نکلا تو میں ایک ایک پائی لوٹا دوں گا۔“



سدھوری نے کسی قدر رسان سے اپنے باپ سے کہا۔

اس پر جواباً مجھے بابا کی آواز سنائی دی۔ ”میڈھی دھدی! بھلا پیسے تیرے سے بڑے ہیں کوئی...... میرے پاس ہوتے تو بھلا میں کیوں نہ دیتا، اگر میرا ٹرک بھی اڑاں ہوتا تو میں اسے بھی بیچ دیتا۔“

پھر اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ جہاں تک میں نے سدھوری کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا وہ یہ تھا کہ غالباً اس کا شوہر اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا اور جس کے لئے اسے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ اس وقت تو میں نے چپ سادھ لی۔ لیکن اگلے دن جب میں اسکول سے لوٹی تو دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے سدھوری سے پوچھا۔ ”سدھوری! کیا بچل کوئی اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے؟“

میری بات پر پہلے تو وہ قدرے چونک کر مجھے دیکھنے لگی، پھر اپنا سر جھکا کر دھیرے سے اثبات میں ہلا دیا۔ لمحہ بھر توقف کے بعد میں نے پھر پوچھا۔ ”کتنے پیسے چاہئیں اسے......؟“

میرا اشارہ اس کے شوہر بچل کی طرف تھا۔ جواباً سدھوری میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بیس، تیس ہزار تو ہوں کم از کم...... پر وہ کہتا ہے اگر اس کا کام چل نکلا تو......“ اس نے پھر وہی بات کہنی چاہی جو وہ رات کو اس ضمن میں اپنے بابا سے کہہ چکی تھی اور میں جانتی تھی یہ اس کے شوہر بچل نے ہی اسے رٹایا تھا۔ لہٰذا میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”ٹھیک ہے...... میرے پاس کچھ پیسے ہیں...... تقریباً پچیس ہزار...... کیا اس سے کام......“

”جی جی ادی...... یہ بھی کافی ہیں مگر تم......“ وہ جلدی سے بولی اور اسی سرعت کے ساتھ چپ بھی ہو گئی۔ میں اس کی بات کا مطلب جان گئی تھی۔ لہٰذا ملائمت بھرے لہجے میں بولی۔ ”سدھوری! تو میری بہن ہے...... تیرے کام آنا میرا فرض ہے۔ میں بھلا وہ دن کس طرح بھول سکتی ہوں جب تو نے بہن بن کر مجھ دکھیاری اور غیر عورت......“

”نا...... ادی نا...... اللہ واسطے میری دل آزاری نہ کر مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔“

سدھوری ایک دم میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے درمیان میں بولی۔ ''ہم نے تیرے پر کوئی احسان نہیں کیا یہ اللہ کی زمین ہے وہی سب کا آسرا اور سہارا ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے کے کام آتا ہے تو یہ بھی اس رب سائیں کی دین ہے۔'' اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی، ماسوائے رسمی گفتگو کے۔ قصہ کوتاہ سدھوری کو میں نے پچیس ہزار کی رقم دے دی وہ خوش خوش چلی گئی۔ لیکن پھر بعد میں اس کے جاتے ہی میں نے محسوس کیا کہ بابا ذرا چپ چپ سے تھے ان کی عجیب سی خاموشی مجھے تشویشناک سی محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں پتہ تھا کہ میں نے سدھوری کو اپنے پاس سے رقم دی تھی۔ ''دھیئے! سدھوری اور تو، تم دونوں ہی میری دھیوں (بیٹیوں) کی طرح ہو اس مشکل کی وجہ سے میں تجھے سدھوری کو روپے دینے سے منع بھی نہ کرسکا۔''

''اچھا کیا آپ نے بابا۔'' میں بولی۔ ''سدھوری میری بہن ہے بابا وہ ہر دکھ درد میں سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر میرے کام آتی رہی ہے اور آج اگر اسے میری ضرورت پڑی تو بھلا میں کس طرح چپکی بیٹھی رہ سکتی ہوں۔ سدھوری اپنے گھر میں خوش ہے اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کون سی خوشی کی بات ہو سکتی ہے بابا......!'' میں نے آخر میں بابا کی طرف رسان سے دیکھتے ہوئے کہا اور بے اختیار بابا کی آنکھیں تشکر سے نمناک سی ہو گئیں۔ میں نے دھیرے سے بڑی محبت کے ساتھ بابا کے کاندھے پر ہاتھ دھر دیا۔

سدھوری کے جانے کے بعد اس گھر کے شکستہ در و دیوار سے ایک بار پھر اداسی ٹپکنے لگی لیکن پھر جلد ہی میں نے خود کو معمول کی مصروفیات میں مگن کر لیا۔ سدھوری پورے چار دن گزار کر گئی تھی اور جس دن وہ لوٹی تھی یہ اسی رات کا ذکر تھا...... بابا حسب معمول باہر صحن میں چارپائی پر سو رہے تھے، میں کمرے میں سعدیہ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے لیکن علاقہ مضافات کا ہونے کی وجہ سے نرم نرم اور ٹھنڈی خوشگوار ہوا کے جھونکے محو خرام رہتے تھے۔ میں اندر دروازہ اور ایک شکستہ سے چوکھٹے والی کھڑکی کھلی چھوڑ کر سوتی تھی۔ نجانے پھر اچانک رات کے کسی پہر میری آنکھ کھلی یقیناً کسی آہٹ یا کھٹکے سے ہی میں جاگی تھی۔ میری نیند ہوتی بھی کچی تھی اور ایک بار جاگنے کے دوبارہ نیند آتی ہی نہیں تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے سن گن لینے کی کوشش کی



رات آدھی سے زائد سرک چکی تھی، باہر گلی کے کتے بھی جانے کہاں دبک چکے ہوں گے البتہ کبھی دور کہیں سے گیدڑ کے اُلسائے ہوئے انداز میں رونے کی آواز آ جاتی، باہر چھپر نما سائبان کے بانس سے جھولتی ہوئی لالٹین کی روشنی کی لو مدھم تھی، جس کی ہلکی روشنی لکیر کی صورت اندر میرے کمرے میں بھی پڑ رہی تھی۔ میں نے دم بخود لیٹے لیٹے صحن میں کسی کی آہٹ سنی۔ قیاس یہی لگایا کہ بابا پانی پینے کے لئے اٹھے ہوں گے لیکن غور کرنے پر مجھے یہ آہٹ ایسی لگی جیسے کوئی اچانک چلتے چلتے سنبھلا ہو۔ تب میرا دل کسی انجانے خدشے کے تحت دھک دھک کرنے لگا۔ سب سے پہلے میرے ذہن میں ابھرنے والا کھٹکا کسی چور کا تھا۔ کہتے ہیں چور کا پاؤں بہت منحوس اور بھاری ہوتا ہے اگر گھر کے کسی مکین کو چور کے داخل ہونے کا شبہ ہو جائے تو ایک لمحے کو حواس معطل ہونے لگتے ہیں اور وہ ایک پراسرار قسم کی ناتوانی سی محسوس کرنے لگتا ہے اور یہی کچھ کیفیات میرے ساتھ بھی ہو رہی تھیں۔ میں یک لخت خود کو مفلوج سی محسوس کرنے لگی...... لیکن پھر شاید آیت کریمہ اور کلمے کا اثر تھا جو میں سونے سے پہلے پڑھ کر خود پر اور اپنی بیٹی سعدیہ پر پھونکتی تھی کہ اچانک مجھ میں ایک نئی قوت بیدار ہوئی اور میں آہستہ سے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہار اطراف چھایا ہوا سناٹا مجھے سائیں سائیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں کمرے کے اکھڑے ہوئے فرش پر دم سادھے کھڑی ہو کر ارد گرد نظریں دوڑانے لگی اور تب میری نظر ایک کونے میں رکھے بیٹ پر پڑی۔ یہ بچوں کے کرکٹ کھیلنے کا بلا تھا۔ میں نے آہستہ سے بڑھ کر وہ اٹھا لیا اور اسے اپنے ہاتھوں میں تول کر کھڑی ہو گئی۔ پھر دھیرے دھیرے کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ یہاں پہنچ کر میں چند ثانیے کھڑی رہی، اب مجھے کسی کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں کسی واہمے کا گمان ہوا۔ لیکن پھر دل نے تھوڑی پیش قدمی پر اکسایا اور پھر میں نے محتاط انداز میں بلے کو ہاتھوں میں پکڑے کمرے کی چوکھٹ سے باہر قدم نکالا اور تب اگلے ہی لمحے مجھے اپنی داہنی طرف ایک سایہ سا حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ ابھی میں نے اسے للکارنا چاہا ہی تھا کہ اچانک مجھے اپنے بائیں جانب بھی کسی کے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوئی حرکت کرتا دکھائی دیا۔ میں نے ابھی چلانے کے لئے منہ وا کیا ہی تھا کہ اچانک ایک سائے نے پھرتی سے میری ناک اور منہ پر رومال

رکھ دیا اس میں غالباً کوئی سریع الاثر دوائی تھی کہ جو فوری طور پر میرے نتھنوں کے ذریعے دماغ میں اتر گئی اور مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا اور اگلے ہی لمحے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

❁❁❁

معاً باہر دروازے پر دستک ہوئی اور اندر کمرے میں ڈائری پڑھتے پڑھتے آمنہ بیگم چونکی پھر دوسری دستک پر وہ ڈائری بند کر کے اسے الماری میں رکھتے ہوئے صحن میں آئی۔ دستک دینے کے انداز سے وہ سمجھ گئی تھی کہ باہر کون ہوگا۔ پھر حسب توقع دروازہ کھولنے پر سعدیہ ماں کو سلام کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ آمنہ بیگم کو سعدیہ کے آج جلدی گھر آنے پر حیرت تھی۔

''آج جلدی آ گئی بیٹی!'' آمنہ بیگم نے ملائمت سے پوچھا۔

''جی امی!'' سعدیہ نے مختصراً جواب دیا اور کمرے میں آ گئی۔ پھر اپنا سیاہ گاؤن ایک جانب رکھا اور تھکی تھکی سانسیں خارج کرتی ہوئی چارپائی پر ڈھیری ہو گئی۔

''سعدیہ بیٹی! کبھی آرام بھی کر لیا کرو تم نے کچھ زیادہ ہی خود کو مصروف کر لیا ہے۔ پتہ نہیں دوپہر کا کھانا کھاتی بھی ہو کہ نہیں۔'' اس کی ماں آمنہ بیگم نے کمرے میں داخل ہو کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو سعدیہ بڑی گہری نظروں سے چارپائی پر لیٹے لیٹے ماں کی جانب تکنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو میری جانب؟'' بیٹی کو متواتر اپنی جانب تکتا دیکھ کر آمنہ بیگم سامنے کرسی پر براجمان ہو کر بولی تو سعدیہ چارپائی سے اٹھ بیٹھی اور ماں سے بولی۔

''امی آج شام کو میں آپ کو ایک سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔ بشرطیکہ آپ کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔''

''تو پھر ایسا سرپرائز تم مجھے دینا ہی کیوں چاہتی ہو بیٹی؟'' اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سعدیہ پر خیال لہجے میں ماں سے بولی۔ ''امی جان یہ سرپرائز صرف آپ کے لئے ہی نہیں ہوگا بلکہ کسی اور کے لئے بھی باعث شاک ہوگا اور آپ سے زیادہ یہ کسی دوسرے کے لئے گراں گزرے گا اور یہ سب ضروری بھی ہے۔''

''کون؟ کس کی بات کر رہی ہو تم؟'' اس بار اس کی ماں نے قدرے چونک کر



سمجھ میں آنے والے انداز میں کہا تو سعدیہ موضوع بدلنے کی غرض سے فوراً بولی۔

''چھوڑیں امی ان باتوں کو مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔''

''اچھا پھر جاؤ، پہلے نہا دھو لو، میں کھانا لگاتی ہوں جب تک۔'' آمنہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ سعدیہ چند ثانیے اپنی جگہ بیٹھی یہ سوچتی رہ گئی کہ وہ لمحہ کیسا ہوگا...... جب عہد گم گشتہ کا ایک ناقابل برداشت کردار اس کی ماں کا سامنا کرے گا اور اسے اچانک پتہ چلے گا کہ وہ جسے پرویز کے لئے وکیل صفائی مقرر کرنا چاہتا ہے وہ آمنہ بیگم کی بیٹی سعدیہ سعید ہے۔ اس کی بیٹی جس کی ماں کو اس نے اس کا دھوکے سے سارا کچھ غصب کر کے اور طلاق دے کر گھر سے باہر پھینک دیا تھا۔

دن ڈھلا...... شام اتر آئی...... واثق علی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا...... سعدیہ کی ماں بے چاری یہ سوچ سوچ کر ہی باؤلی سی ہوئی جا رہی تھی کہ آخر اس کی بیٹی آج شام کو کون سا ایسا سرپرائز دینا چاہ رہی ہے۔ جو تکلیف دہ ہونے کے باوجود ضروری بھی ہے۔

جون کی تپتی ہوئی دھوپ آنگن سے سرک کر مکان کی ممٹیوں سے بھی اتر چکی تھی۔ پرتپش دن کے بعد قدرے خنک شام کا آغاز ہو چلا تھا۔ ماسی کھلے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر چکی تھی۔ وہیں دو تین بید کی کرسیاں لگا کر بیچ میں ایک چھوٹی سی تپائی بھی رکھ دی گئی تھی۔ معاً کال بیل بج اٹھی۔ سعدیہ چونکی...... آمنہ بیگم بھی انجانے سرپرائز کی آمد پر ٹھٹھکی...... وہ اندر چلی گئی۔

سعدیہ نے آنگن میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے ماسی کو دروازہ کھولنے کا کہا۔ دروازہ کھلا، سعدیہ کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں، پھر واثق علی یعنی اپنے باپ کو دیکھ کر عجیب سی پرمتانت مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ یہاں تشریف رکھیں میں ابھی آتی ہوں......'' سعدیہ نے واثق علی سے کہا اور پھر اس کے کرسی پر براجمان ہوتے ہی اندر کمرے میں آ گئی جہاں آمنہ بیگم اس کی منتظر تھی۔

''امی جان خود کو سنبھالے رکھیے گا۔'' سعدیہ ماں کی طرف دیکھ کر قدرے پراسرار سے لہجے میں بولی۔ ''جس شخص نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا اور آپ کی زندگی میں زہر بھرا، دیکھئے اسے آج...... وہ بھکاری کی طرح کس طرح آپ کی بیٹی سے بھیک مانگنے

آیا ہے۔ آئیں چلیں میرے ساتھ اسے دیکھ کر آپ کا وجود ضرور تسکین پائے گا۔"
سعدیہ نے آخر میں کہا اور حیران پریشان دم بخود ماں کو اپنے ہمراہ لئے باہر صحن میں آ گئی۔

واثق علی بالکل سامنے کی کرسی پر براجمان تھا۔ ٹھیک اس لمحے آمنہ بیگم اور واثق علی کی نگاہیں چار ہوئیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں شناسائی کی رمق جھلکی، ماضی کی کچھ بلکہ بہت سی تلخ یادوں نے انگڑائیاں لیں...... صدیوں کے کٹھور فاصلے لمحوں میں سمٹنے لگے اور پھر جب شناسائی نے واہمے کو رد کرتے ہوئے گم صم کھڑی آمنہ بیگم پر پوری طرح تیقن کے ساتھ شب خون مارا تو انہیں بے اختیار ہلکا سا چکر آ گیا کسی فلم کی طرح ہی تو ماضی کی تلخ کہانی ان پر وا ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ یک دم پاس رکھی کرسی کا سہارا لیتے ہوئے اس پر ڈھے سی گئیں۔ سعدیہ نے فوراً ماں کو سنبھالا اور ان کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی...... لیکن اس کی تیز اور نفرت انگیز نظریں اپنے باپ واثق علی کے متغیر چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کمال کا دل گردہ اور غیر معمولی اعصاب پائے تھے واثق علی نے...... اس کا چہرہ اپنی مطلقہ بیوی کو دیکھ کر ایک لمحے کو متغیر ضرور ہوا تھا لیکن وہ کسی بھی قسم کے شاک سے مبرا تھا، وہ چہرہ پتھر تھا...... بے حسی نے ہی اس کے اعصاب کو غالباً تقویت دے رکھی تھی۔ واثق علی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اس نے قدرے ناگوار نظروں سے سعدیہ کی جانب دیکھا اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سعدیہ کی "شرارت" کو صاف طور پر سمجھ گیا تھا۔

"بیٹھئے! واثق علی عثمان صاحب!" سعدیہ نے انجان بنتے ہوئے پہلی بار واثق علی کو پورے نام سے پکارا۔ اس کے چہرے پر ہنوز تضحیک آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جسے واثق علی محسوس کرتے ہوئے اور اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔ "محترمہ! تم نے اسمارٹ بننے کی اچھی کوشش کی ہے، اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اس طرح کی اوچھی حرکت کر کے مجھ پر اپنا حق جما لوگی تو تمہاری یہ بھول ہے۔" اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ اس نے سعدیہ کی اس حرکت کو دوسرے معنی میں لیا تھا جسے سن کر سعدیہ کے تن بدن میں ایک دم آگ سی لگ گئی اور وہ ادب و آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے باپ سے بولی۔ "مسٹر واثق علی عثمان صاحب!



آپ نے غالباً میرے پورے نام پر غور نہیں کیا...... میرا نام سعدیہ سعید ہے اور آپ اس خوش فہمی میں نہیں پڑنا کہ میں اپنا حق آپ پر جتانا چاہ رہی ہوں۔ کیونکہ آپ میرے لئے باعث فخر نہیں بلکہ باعث ندامت ہیں اور نہ ہی مجھے اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام لگانے کا کوئی شوق ہے۔ میرے لئے میری ماں کی ذات اور نام ہی قابل فخر ہے، جس کے حق پر آپ نے نہ صرف ڈاکہ ڈالا بلکہ اسے دھتکارا بھی۔" سعدیہ فرط جوش سے کانپنے لگی، اس کی ماں آمنہ بیگم سر جھکائے دم بخود بیٹھی تھی۔ واثق علی نے نخوت سے منہ پھیرا اور جب وہ واپس جانے کے لئے لوٹنے لگا تو سعدیہ نے پھر اسے مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر واثق علی! آپ کو میری ایک نصیحت ہے، آپ اسے اپنے لئے تنبیہ بھی سمجھ سکتے ہیں، وہ یہ کہ جتنی جلدی ہو سکے، میری ماں کا حق جس پر آپ نے اب تک غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اسے فوراً لوٹا دیں، ورنہ آپ کو کٹہرے میں لانے کے لیے مجھے ذرا بھی شرمندگی نہیں محسوس ہو گی۔" اس کی دھمکی آمیز تنبیہ پر واثق علی دروازے تک پہنچتے پہنچتے رکا پھر ایڑی کے بل سعدیہ کی طرف گھوما۔ اس کے پھیکے چہرے پر زہرخندی مسکراہٹ تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا سعدیہ کے قریب آیا۔ پھر اس کی طرف تضحیک آمیز نظروں سے تکتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "بے بی! دو چار کتابیں قانون کی پڑھنے سے تم کیا سمجھتی ہو کہ کوئی تیر مار لوگی...... یہ تمہاری بھول ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

باپ کے روکھے اور اجنبی لہجے نے سعدیہ کے ذہن کو کہیں عمیق گوشے میں دبی طور پر مجبور سا کیا لیکن پھر جلد ہی وہ واپس جذباتی کیفیت سے نکل آئی۔ اس کے دماغ نے بھی واثق علی کو اپنا باپ تصور ہی نہیں کیا تھا اگرچہ ایک لمحے کو اس کے دل میں یہ خیال ابھرا تھا کہ جب واثق علی اس کی ماں آمنہ بیگم کا سامنا کرے گا اور پھر اسے اس حقیقت کا بھی پتہ چلے گا کہ وکیل سعدیہ سعید اس کی بیٹی ہے...... اس کا اپنا خون ہے تو اس پر کیا بیتے گی، وہ کیا محسوس کرے گا...... کیا پدرانہ محبت بیٹی کو دیکھ کر جوش مارے گی...... لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اولاد کی حقیقت آشکارا ہونے کے باوجود واثق علی کے سرد جذبات میں کوئی تلاطم برپا نہیں ہوا تھا وہاں تو سدا کا گویا گلیشیئر جما ہوا تھا۔

❁❁❁

داد و کو پر اسرار طور پر گم شدہ سسی کے بارے میں زمیندار اختیار علی سے پوچھ گچھ کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ اگلے ہی دن معصوم سسی اپنے باپ کے گھر خود بخود جا پہنچی تھی۔ اگرچہ گوٹھ کے لوگوں کو اس کے یوں اچانک نمودار ہونے پر اچنبھا تو ہوا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ یہ بات بھولتے چلے گئے۔ بے چاری سسی کی حیثیت ہی کیا تھی، ایک غریب کو ویسے بھی کون دیر تک یاد رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی دب گئی لیکن داد و اس کی پر اسرار ''برآمدگی'' پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ تاہم اسے خوشی تھی کہ معصوم سسی زندہ سلامت اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔ مگر داد و کو اس کی پر اسرار اور اچانک ''برآمدگی'' کے پیچھے کچھ اور ہی کہانی محسوس ہو رہی تھی...... ویسے داد و کو اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ ایک دن قبل جب وہ سسی کی گمشدگی کے سلسلے میں زمیندار اختیار کی اوطاق میں گیا تھا اور اس کے کمدار مولا بخش سے اس کی خاصی تو تڑاق ہوئی تھی اور داد و نے سسی کی بازیابی کے سلسلے میں جرگہ بٹھانے کی بھی دھمکی دی تھی...... لہٰذا ہو سکتا تھا کمدار نے بلاکم و کاست داد و کی دھمکی زمیندار اختیار علی تک پہنچا دی ہو۔ نتیجتاً زمیندار نے سسی کو ڈر کر چھوڑ دیا ہو۔ بہرطور داد و فی الفور سسی سے ملنے کا ارادہ کرتے ہوئے گھر سے نکلا اور سیدھا اس کے گھر پہنچا، اس کا باپ اس وقت گھر پر موجود نہ تھا، سورج نصف النہار پر پہنچا، آگ برسا رہا تھا، سسی اس وقت کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ داد و کو دیکھتے ہی وہ صحن میں آ گئی اور سر کی چادر درست کرتے ہوئے داد و کو سلام کیا۔

''سلام ادا سائیں!'' جواباً داد و نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور بغور سسی کا چہرہ دیکھنے لگا...... اس کی تیز نظروں نے سسی کے کومل چہرے پر عجیب سی مردنی دیکھی۔ ''کہاں تھی تو اتنے دن...... تیرا پیو تو پاگل ہو گیا تھا۔'' اس نے ہمدردی آمیز لہجے میں استفسار کیا تو سسی نے اچانک چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معصوم نگاہوں میں کئی ایسے سوالوں کے جواب موجود تھے، جن کا اظہار شاید اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔ داد و نے ایک لمحے میں وہ سب کچھ بھانپ لیا جو وہ اپنی زبان حال سے نہیں کہہ پا رہی تھی۔ داد و نے اس کی تھوڑی کو دھیرے سے اوپر اٹھایا تو ایک دم ٹھٹھک گیا۔ بے اختیار امڈنے والے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر کسی گہرے دکھ اور مظلومیت کا پتہ دیتے ہوئے گالوں پر ٹپک



رہے تھے۔

''ادی جیجل...... ! بتا کیا ہوا ہے تیرے ساتھ اس رات؟ یہ کتا اختیار تجھے کہاں لے گیا تھا اپنے ساتھ بول......'' داد و نے قدرے بپھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں ادا! اللہ واسطے اس بات کو پی جا، نا کھول اسے...... میں تو بدبخت پیدا ہی ایسے دکھوں اور آزاروں کے لئے ہوئی ہوں تو کیوں اپڑیں حیاتی کو آزار میں ڈالتا ہے۔'' داد و اس کی بات سن کر مشتعل سا ہو گیا بولا۔ ''نہیں سسی! تجھے بتانا پڑے گا، تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟ میں نے تجھے ایک بھائی کی آنکھ سے صرف دیکھا ہی نہیں سمجھا بھی ہے...... جس بات کو تو مجھے پینے کو بول رہی ہے وہ میرے لئے زہر ہے، تو کیا چاہتی ہے میں یہ زہر پی کر مر جاؤں۔''

''اللہ نہ کرے...... میڈا ادا سائیں...... ایسا کیوں بولتا ہے۔''

اس نے تڑپ کر کہا اور چپ ہو رہی لیکن اس کی کیفیات سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ شدید ذہنی ہیجان سے گزر رہی ہو۔ اسے خاموش پا کر داد و بالآخر فیصلہ کن لہجے میں سسی سے مخاطب ہوا۔ ''چنگا پھر...... تو مجھے نہیں بتا میں خود ہی اس وقت زمیندار اختیار علی کی اوطاق جا کر اور کلہاڑی اس کی گردن پر رکھ کر اس سے پوچھ لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے داد و جانے کے لئے پلٹا اس کے قطعیت بھرے لہجے نے سسی کو سرتاپا لرزا دیا۔

اس نے لپک کر داد و کو پکارا۔ ''ادا سائیں! رک جاؤ...... میں بتاتی ہوں۔'' داد و کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، پھر وہ سسی کی جانب چلا اور اس کے قریب آ کر اس کی جانب تکنے لگا۔

''ادا سائیں...... زمیندار اختیار علی مجھے اس رات گھر کی بجائے اپنی اوطاق میں لے گیا تھا، جہاں اس کے وہی دونوں کمینے کارندوں نے میرے ساتھ......'' اتنا بتا کر وہ خود پر قابو نہ پا سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ داد و کو اپنے سفاک اور بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔ پھر وہ وہاں ذرا بھی نہ رکا اور غصے میں پھنکتا ہوا باہر نکلا۔ پیچھے سسی اسے پکارتی رہ گئی۔ داد و تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا زمیندار اختیار علی کی اوطاق میں پہنچا، اتفاق سے اختیار علی اپنے کمدار مولا بخش کے ساتھ گڑگڑی جمانے میں مصروف تھا۔ داد و کو غیض و غضب کے عالم میں اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو

ٹھٹکا لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس کے اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ عود کر آیا۔

"کیا ہے ڑے چھورا میرے تھاک پر مجھے ہی آنکھیں دکھاتا ہے تو..... کہاں تھا اتنے دن.....؟"

"اختیار علی.....! تجھے معلوم ہے کہ سسی میری بہن ہے..... تو نے اس کے ساتھ اپنے کتوں سمیت جو سلوک کیا ہے تجھے پہلے اس کا حساب دینا ہوگا۔" دادو نے اختیار علی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اختیار علی نے دادو کی آنکھوں میں غیض آلود چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس کیں اور تب اسے مخدوش صورتحال کا اندازہ ہوا۔

وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور دادو کو پرتپش نظروں سے گھورنے لگا۔ کمدار مولا بخش گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا، اسے شاید ایک غریب اور قرضے میں جکڑے ہوئے ہاری کے بیٹے سے اس بات کی قطعاً توقع نہ تھی کہ وہ اس طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زمیندار سے مخاطب ہوسکتا ہے۔ زمیندار اختیار علی دادو کے چہرے کی طرف خشمناک نظروں سے گھورتا ہوا ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ "اڑے چھوکرا..... تیری یہ مجال کہ تو میری ہی اوطاق میں مجھ سے ایسی باتیں کرے اڑے..... بابا، مولو....." اس نے آخر میں قریب کھڑے کمدار مولا بخش کو مخاطب کیا۔ "حاضر سائیں....." مولا بخش مستعدی سے بولا۔

"اڑے بابا! جلدی کر اس دو ٹکے کے چھوکرے کا دناغ تو درست کر، منہ کو آنے لگا ہے یہ....." زمیندار نے غضب آلود لہجے میں کمدار سے کہا، مگر اپنی برساتی ہوئی نظریں دادو کے چہرے پر ہی مرکوز رہنے دیں۔

کمدار مولا بخش ایک ٹھنڈے مزاج کا اور معاملہ فہم شخص تھا، معاملے کی نزاکت کا اسے پہلے ہی سے ادراک ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس دن ہی جب دادو اوطاق میں آ کر اسے دھمکا کر گیا تھا..... زمیندار اختیار علی تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ دادو سسی کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو چکا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ سسی کو حویلی کی قید سے آزاد کر کے واپس گھر جانے دیا جائے تاکہ معاملہ دب جائے۔ پھر زمیندار نے مولا بخش کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سسی کو چھوڑ دیا لیکن اب دونوں کو بھی اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ معاملہ بجائے دبنے کے مزید شدت کے ساتھ ابھر گیا۔



لیکن مولا بخش زیرک وزیر کی طرح یہ بات جان چکا تھا کہ بے شک دادو کی حیثیت زمیندار اختیار علی کے سامنے ایک حقیر چیونٹی سے بڑھ کر نہیں..... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دادو اسے اس وقت ایسی حقیر چیونٹی دکھائی دے رہا تھا جو کیم شحیم ہاتھی کی سونڈ میں گھس کر اسے ناکارہ بنا دیتی ہے لہٰذا اس نے غیر محسوس طور پر زمیندار کے کان میں سرگوشی کے ذریعے یہ گرانقدر قول منتقل کیا اور اسے قریب ہی رکھے مونڈھے پر آرام سے بٹھا دیا..... پھر دادو کے ذرا قریب جا کر معتدل لہجے میں بولا۔

"دیکھ چھوکرا! تیرے سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں، کچھ چھوٹے بڑے کا خیال رکھ..... اچھا سن تو جا..... جا کر فارم سنبھال ہم ادھر ہی آ کر آرام کے ساتھ تیرے سے بات کریں گے..... ابھی تو کاوڑ (غصے) میں ہے جا شاباش....." مولا بخش نے جیسے اسے پچکارا لیکن دادو کے سر پر خون سوار تھا وہ مولا بخش کی لیت ولعل کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا..... لہٰذا وہ اسے بھی خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"اڑے معلوم ہے مجھے تو کیا چاہتا ہے..... یہ فیصلہ آج اور اسی وقت ہوگا۔ میں بھی سارے گوٹھ والوں کو گوٹھ کے چوہدے میں اکٹھا کر کے اپڑیں بہن سسی کا فیصلہ کراؤں گا اور تم دونوں کو اس کا جواب دینا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے دادو غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اوطاق سے نکل گیا۔

کمدار مولا بخش اسے روکتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ زمیندار اختیار علی دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش ہویدا تھی۔ "اڑے بابا مولو! اب کیا ہوگا، یہ چھوکرا تو مجھے گوٹھ میں بے عزت کر کے رکھ دے گا۔"

"سائیں! میں نے تو آپ کو کتنا سمجھایا تھا کہ ہمارا جرم ظاہر ہو چکا ہے، اس لئے اس چھوکرے کو گرمی دکھانے کی کیا ضرورت تھی، میں اس چھوکرے کو خود ہی دم دلاسہ دے کر ٹھنڈا کر دیتا لیکن اب....." مولا بخش نے کہا تو زمیندار فوراً بولا۔ "اڑے بابا! اب سوچ اب کیا کریں وہ چھوکرا....."

"نہیں سائیں! آپ بس چپ رہیں۔ ورنہ اس دو ٹکے کے ہاری کے بچے کا دماغ خراب ہوگا۔ میں سنبھال لوں گا۔" اس نے زمیندار کو کھوکھلی سی تسلی دی۔ پھر کچھ دیر تک

پرسوچ انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ زمیندار ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکے جا رہا تھا۔ پھر اسی لہجے میں بولا۔ ''کیا سوچ رہا ہے مجھے بھی کچھ بتا بابا۔''

''بس سائیں! میں نے سوچ لیا...... آپ کو گڑتی (فکری) کرنے کی ضرورت نہیں۔'' مولا بخش نے پر خیال لہجے میں کہا۔ ''میں آج ہی اپنے کچھ آدمیوں کے ذریعے گوٹھ میں سسی اور دادو کے خفیہ معاشقے کی کہانی پھیلا دوں گا، بس آپ دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔'' پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ''سائیں آپ پہلا کام یہ کریں کہ اس وقت آپ گوٹھ سے چند دنوں کے لئے کہیں اور نکل جائیں...... میں تب تک کچھ کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اوطاق سے باہر نکل گیا اور زمیندار اختیار علی حیران و پریشان کھڑا رہ گیا۔

❁❁❁

''تم نے خود کو اپنے باپ کے سامنے ظاہر کر کے کچھ اچھا نہیں کیا سعدیہ!'' وکیل کمال نے پیپر ویٹ کو میز کی سطح پر چکر دیتے ہوئے خاصے پر خیال لہجے میں سامنے بیٹھی وکیل سعدیہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''یہ بات تو آخر ایک نہ ایک دن ظاہر ہونا ہی تھی اور یہ بہتر موقع تھا، ضرور واثق علی کو ذہنی شاک پہنچا ہو گا اس طرح......'' سعدیہ نے کہا تو کمال جو اپنے ڈیڈی رانا الطاف علی کے چیمبر میں ان کی ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو اس طرح تمہارے ابا حضور تم سے خوف زدہ ہو گئے ہوں گے، اگر یہی بات ہے تو مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہے کہ تم عجیب نفسیاتی کیفیت میں کھو کر اپنے مقصد سے ہٹنے لگی ہو۔'' اس کے مربیانہ طرز تخاطب پر سعدیہ کو تھوڑی سی حیرت تو ہوئی...... لیکن وہ اسے صرف نظر کرتی ہوئی کمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کمال! تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اپنے باپ کا اس طرح مجھے اپنی ماں کا سامنا کراتے ہوئے کتنا لطف آیا تھا۔ کتنی تسکین ہوئی تھی مجھے......'' وہ جیسے آپ ہی آپ بولتی چلی جا رہی تھی۔ جواباً کمال نے اپنے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل کرتے ہوئے کندھے اچکا کر کہا۔ ''پتہ نہیں تمہاری کون سی جبلت کو اس طرح تسکین ملی تھی...... بجز اس کے کہ تمہاری والدہ کے ماضی کے زخم ہرے ہو گئے



ہوں۔ واثق علی سے زیادہ تمہاری ماں کو اسے دیکھ کر شدید قسم کا ذہنی شاک پہنچا ہو گا اور وہ بے چاری اب تک اس ''شاک'' سے نہیں نکل پائی ہوں گی۔'' کمال کی گفتگو نے سعدیہ کو جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اسے لگا وہ غلط نہیں کہہ رہا۔ اس قسم کا ذہنی شاک تو کسی صاحب دل کو ہلا سکتا ہے، بھلا پتھر دل پر اس کی اثر پذیری کیونکر ہونے لگی اور واثق علی تو پتھر دل تھا، کس ڈھٹائی کے ساتھ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی معاندانہ رویے کے ساتھ ان کے گھر سے رخصت ہوا تھا۔ یہ سوچ کر سعدیہ کی سرمئی آنکھوں میں بے اختیار آنسو جھلملا گئے اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ کمال نے یہ دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا...... وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا، سعدیہ کی کرسی کے قریب آیا اور ملائمت سے بولا۔

''سعدیہ! ٹیک اٹ ایزی...... جو ہوا اسے اگنور کر دو، ویسے خدا کیلئے اپنے آپ کو انتقام میں اتنا مغلوب نہ کرو کہ خود کو ہی گھائل کرنا شروع کر دو۔''

سعدیہ خاموش رہی اور اپنے پرس سے ٹشو پیپر نکال کر آنکھیں پونچھنے لگی۔ اسے شاید اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے واقعی اپنے باپ واثق علی کو اپنی ماں کے روبرو لا کر غلط کیا تھا اور کمال کی اس بات میں بھی صداقت تھی کہ اس طرح کا ''سامنا'' واثق علی کے بجائے اس کی ماں کے لئے ضرور تکلیف کا باعث بنا ہو گا۔ اثنائے راہ میز پر رکھے فون کی بیل گنگنائی۔ کمال نے واپس ریوالونگ چیئر پر براجمان ہوتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو!'' دوسری جانب سے غالباً کسی کی شناسا آواز سنتے ہی دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! سنائیے، کیسے مزاج ہیں آپ...... کے جی...... جی اچھا...... او آئی سی، لگتا ہے کوئی بڑی خبر ہے۔ جی...... جی...... وہ بھی ادھر ہی ہیں موجود......'' اس نے سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے پھر تشریف لے آئیں ہم آپ کے بے چینی سے منتظر ہیں...... خدا حافظ۔''

کمال نے فون رکھا۔ پھر اپنی جانب مستفسرانہ نظروں سے تکتی ہوئی سعدیہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے انسپکٹر ثناء اللہ کا فون تھا...... کہہ رہا تھا بڑی اہم خبر ہے اس کے پاس، جسے وہ خود ہی یہاں پہنچ رہا ہے سنانے کے لئے۔'' سعدیہ کمال کی بات پر چونکی، لیکن کچھ بولی نہیں، غالباً کچھ دیر پہلے کی چھائی ہوئی کدورت سے ذہن ہنوز بوجھل تھا، پھر ذرا دیر بعد وہ فریش ہونے کے لئے ٹوائلٹ چلی گئی۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے

چہرے پر مارے، پھر چہرے کو تولیے سے صاف کرنے کے بعد ہلکا سا میک اپ کیا اور باہر آ گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد انسپکٹر ثناء اللہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی دیرینہ کامیابی کی خواہش کی تکمیل کا جوش پھوٹ رہا تھا۔ پھر وہ قریب بیٹھی وکیل سعدیہ سے گویا ہوا۔ ”مس سعدیہ! آپ کو یقیناً یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ آپ کو وکالت کی بجائے پولیس کی خفیہ اسپیشل برانچ میں ہونا چاہئے تھا۔“ اس کے لہجے میں ستائش تھی لیکن اس وقت سعدیہ کو اس کے لہجے پر غور کرنے کے بجائے وہ اہم بات یا خبر سننے میں زیادہ دلچسپی تھی جو وہ خود ان کے روبرو سنانے آیا تھا۔

”ملزم پرویز کا مزید سات دنوں کا ریمانڈ لینے کے بعد میں بالآخر اس سے یہ اگلوانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ مقتول خورشید احمد کا قتل اس نے اپنے باس واثق علی کے ایماء پر کیا تھا اور نہ صرف یہ کہ ”عثمان ٹریڈرز“ کچھ غلط قسم کے غیر قانونی دھندوں میں بھی ملوث ہے جس کا گوڈاؤن کیپر خورشید احمد کو پتہ چل گیا۔ وہ ایک وفادار اور ایماندار شخص تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ یہ کام نیچے کی کچھ کالی بھیڑوں کا ہے جن کے کرتوتوں سے فرم کا مالک واثق علی لاعلم ہے لہٰذا اس نے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مالک واثق علی کو اس کی خبر دے دی۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ جسے غیر قانونی دھندے کی خبر دے رہا ہے وہ درپردہ خود ہی ان کا بگ باس ہے۔ قصہ کوتاہ تب واثق علی نے فوراً اپنے ایک ایماندار کارکن کو اس کی ”فرض شناسی“ کا صلہ دیتے ہوئے پرویز کے ذریعے اسے قتل کروا ڈالا۔“ انسپکٹر ثناء اللہ اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔ سعدیہ اس کی صراحت بھری گفتگو سن کر کچھ اس انداز میں چونک کر اپنا سر دھیرے دھیرے ہلانے لگی جیسے اسے ایسی ہی سنسنی خیز انکشافات کی توقع تھی۔ کمال بھی انسپکٹر ثناء اللہ کی بات پر بھونچکا سا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر تک کمرے میں گمبھیر سکوت چھایا رہا...... ہر کوئی اپنے اپنے طور پر ان باتوں کے تناظر میں دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا تھا مگر سب کا مطمع نظر یہی تھا کہ اصل مجرم کو بہر حال قانون کی گرفت میں آنا چاہئے۔

”انسپکٹر صاحب! اب آپ کا آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہے؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے



بعد بالآخر سعدیہ نے ہی مہر سکوت توڑا تو انسپکٹر ثناء اللہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پر سوچ لہجے میں بولا۔ دل تو میرا یہی چاہ رہا ہے کہ ابھی اور اسی وقت ”عثمان ٹریڈرز“ کے گوداموں پر چھاپہ مار دوں اور واثق علی کو بھی گرفتار کر لوں مگر اس طرح کا فاسٹ ایکشن بعض مرتبہ بااثر مجرم کو صاف بچا لیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں دو ایک دن واثق علی کے گرد ایسا جال بنتا چلا جاؤں کہ اسے گرفتار ہونے کے بعد ذرا بھی مفر کی راہ نہ ملے۔“ اس نے بتایا اور کمال اور سعدیہ کے سر دھیرے دھیرے تفہیمی انداز میں جنبش کرنے لگے ان دونوں کو انسپکٹر ثناء اللہ کی قابلیت پر پورا بھروسہ تھا۔

اپنے سابقہ شوہر واثق علی کا یوں اچانک سامنا کرنے کے بعد آمنہ بیگم کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے عرصے سے خوابیدہ آتش فشاں نے لاوا اگلنا شروع کر دیا ہو...... زندگی کی پرسکوت جھیل پر کسی نے پتھر اچھال کر اسے تلاطم خیز کر دیا ہو۔ یوں تو وہ ہر لمحہ کرب آگہی کے ایک عذاب سے گزر رہی تھی۔ لیکن یہ کرب اسے سکون بھی بخشتا تھا۔

فیروزی رنگ کی یہ ڈائری ایک ایسا اعتراف نامہ تھی جس کا وہ جتنا مطالعہ کرتیں، اتنا ہی انہیں اپنے سینے کا بوجھ کم ہوتا محسوس ہوتا۔ اعتراف کی ایک نئی لذت سے وہ ایک عجیب طرح کا حظ اٹھا رہی تھیں۔ لیکن یہ ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ماضی کا ایک تلخ اور جیتا جاگتا کردار ایک دن یوں ان کے سامنے آ جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ آج گھر کے سارے کاموں سے فراغت پانے کے باوجود ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی ماضی کی کتاب کھولتیں آج انہیں کہیں زیادہ ہی بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے میں ابھی کافی وقت تھا۔ بالآخر وہ دل کی کدورت مٹانے کی غرض سے ڈائری سنبھال کر آ بیٹھیں اور اپنے ماضی میں کھو گئیں۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک تاریک کمرے میں پایا۔ بلکہ کمرہ کیا تھا؟ کوئی سیلن زدہ سی کوٹھڑی ہی تھی۔ جہاں نجانے کس روزن سے روشنی کی ہلکی کرن اندر آ رہی تھی جس سے مقدور بھر کوٹھڑی کے حدود اربع کا اندازہ ہوتا تھا میں خود کو موجودہ حالات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔ میں جان گئی تھی کہ کس نے مجھے بے ہوش کر کے اغواء کر لیا تھا۔ اس تصور سے ہی میں لرز کر رہ گئی تھی۔ دل و دماغ میں اندیشوں اور خدشات سے کوڑیالے ناگ کلبلا رہے تھے۔ ”مجھے کون یہاں لایا ہے کون اغواء کر سکتا ہے مجھے......؟“ میں نے خود سے پوچھا۔ پھر خود ہی میرے ذہن میں ایک نام ابھرا۔ ”بھورل“...... ہاں یہ حرکت اسی کمینے کی ہو سکتی تھی۔



میرے ذہن میں ذرا دیر پہلے چھائی ہوئی غنودگی رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی تختے والے پلنگ پر موجود ہوں میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پلنگ سے اترتے ہی میرا سر چکرایا اور میں دوبارہ پلنگ پر ڈھے سی گئی۔ پھر بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ چند لمحے یونہی بیٹھی ستاتی رہی...... اس کے بعد پھر آہستگی کے ساتھ اٹھی اور اندازے سے دیوار اور دروازے کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے لگی...... معاً میرے دائیں جانب ایک لمبی اور متوازی روشن لکیر ابھری جو چوڑی ہوتے ہوتے پورے دروازے کی چوکھٹ میں بدل گئی۔ اس کھلی چوکھٹ پر مجھے کسی کا ہیولا نظر آیا۔ ایک لمحے کو میں انجانے خدشے سے دہل سی گئی۔ پھر اپنی ہمت مجتمع کر کے زوردار لہجے میں بولی۔

”کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“

سناٹے میں میری آواز کی گونج تھمی تو اس کا ایک ہاتھ حرکت کرتا ہوا محسوس ہوا جس کے نتیجے میں اچانک پرسکوت ماحول میں ”چٹ“ کی ہلکی آواز ابھرتے ہی سوواٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ روشنی ہوتے ہی میری نگاہ نے ایک انتہائی نفرت انگیز منظر دیکھا۔ میرے سامنے خصلت ابلیس بھورل خان موجود تھا۔ پھر یوں ہوا دل میں موجزن وہ نفرت کا جذبہ، یکایک خوف میں تبدیل ہونے لگا اور خوف کی اسی لہر نے میرے رگ و پے میں کپکپی سی دوڑا دی، مجھے احساس تھا کہ اس وقت میں اپنی بستی کی کسی گلی میں موجود نہیں ہوں کہ بھورل کے ساتھ جوش نفرت میں بری طرح پیش آؤں...... میں تو اس کے قبضے میں تھی۔ یہ کمرہ یہ جگہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں لیکن اس تلخ حقیقت کا بہر حال مجھے ادراک تھا کہ میں جہاں بھی ہوں کم از کم محفوظ نہیں ہوں۔ ہم دونوں کی نظریں کچھ عجیب طرح ایک دوسرے سے ملیں...... میری آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں تھی تو بھورل کی نظروں میں شکاریوں ایسی چمک...... جس میں بوالہوسی بھی محو رقصاں تھی...... معاً ہیبت ناک اور اندیشوں بھرے سناٹے میں بھورل کی استہزائیہ آواز گونجی۔ ”کیوں استانی جی...... خادم کا غریب خانہ پسند نہیں آیا۔“

”شٹ اپ!“ میرے اندر جیسے کوئی نئی انجانی سی قوت بیدار ہوئی اور میں نے تلخ لہجے میں اسے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”بھورل خان! ایک عورت کو اغواء کرنے کا

مطلب سمجھتے ہو...... تمہیں پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے اسے ڈرایا کیونکہ انہی دنوں اغواء اور زنا بالجبر کے ملزم کو ترنت پھانسی پر چڑھانے کا آرڈیننس پاس ہوا تھا۔ بہر طور میری دھمکی اس نے اپنے مکروہ دھانے سے اگلنے والے قہقہے میں اڑا دی اور پھر مجھے گھورتا ہوا میری جانب چند قدم بڑھا اور گمبھیر آواز میں بولا۔ ''استانی جی! شیر کی کچھار میں رہ کر تم شیر کو نہیں ڈرا سکتی...... سمجھیں۔ میری بات غور سے سنو میں ٹیڑھی انگلی سے بھی گھی نکال لیتا ہوں اور اس پر تمہی نے مجھے مجبور کیا ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اسی وقت......''

''بکواس بند کرو اپنی...... بھورل خان!'' میں نے طیش میں آ کر اس کا پورا نام لیتے ہوئے چلا کر کہا۔ میں خود حیران تھی کہ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے عود کر آئی تھی۔

''تمہارا یہ ناپاک مقصد میں کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے مجھے اپنی جان سے ہی ہاتھ دھونا کیوں نہ پڑیں۔'' میری آنکھوں میں قطعیت اور نفرت کی چنگاریاں بھورل نے محسوس کر لی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو الجھن سی تیر گئی تھی۔ لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس کے سیاہ رو چہرے پر کرختگی کے تاثرات نمایاں ہوتے گئے اور وہ پھر میرے ایک دم اتنے قریب آ گیا کہ مجھے اس کے گندے اور قابل نفرت وجود سے ناگوار بدبو کے بھبھکے محسوس ہونے لگے۔ ....

میں بے اختیار ذرا ڈر کر چند قدم پیچھے سرک گئی وہ اتنے ہی قدم بڑھتا ہوا پھر میرے نزدیک آ گیا، اس کے انداز و اطوار مجھے جارحانہ سے محسوس ہونے لگے۔ مجھ میں پھر پیچھے ہٹنے کی تاب نہ رہی اور میں وہیں جمی قدرے سراسیمگی کے عالم میں بھورل کی طرف تکنے لگی۔

''تمہیں مجھ سے ہر حال میں شادی کرنی پڑے گی...... مت بھولو یہ بات کہ تم ایک پیاری سی گول مٹول سی بچی کی ماں بھی ہو...... کیا کہتی ہو پھر استانی جی! اٹھا لاؤں یہیں اسے بھی۔''

یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں اس کی بات پر سرتاپا لرز گئی۔ اپنی پھول سی معصوم بچی کے بارے میں اس شیطان کے عزائم جان کر میں نے چلاتے ہوئے کہا۔



''نہیں...... نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' شدت جوش اور قدرے ڈر سے آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ پھر شیطانی قہقہہ مار کر بولا۔ ''تو استانی جی! پھر راضی ہو نا...... اپنے خادم سے سنجوگ کرنے میں۔''

میرے اندر ایک بار پھر نفرت و غصے کی لہر ابھرنے لگی...... لیکن میں نے اسے دبائے رکھا۔ جانتی تھی میرے منہ سے نکلنے والے کسی ایسے ویسے جملے پر یہ خبیث غصے ہو کر کہیں میری پھول سی نازک بچی کو ہی نہ یہاں اٹھا لائے۔ بہر طور اس کی اس دھمکی نے مجھے اپنی جگہ سن کر کے رکھ دیا تھا...... پھر وہ جاتے ہوئے اپنی دھمکی دہرانے اور مجھے سوچنے کا آخری موقع دینے کی تنبیہہ کرتا کمرے سے چلا گیا۔

اس خبیث کے کمرے سے نکلتے ہی میں تختے والے پلنگ پر گر سی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ تڑپ کر سوچنے لگی کہ زندگی نے کبھی مجھے سکھی نہیں رہنے دیا۔ شوہر نے دھتکارا تو بھورل جیسا شیطان خبیث آن ٹکرایا۔ گویا زندگی کو کسی طور حالات دگرگوں سے مفر نہیں مل رہی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس کھینچی کثیف خیالات کی یلغار کو پریشان کن ذہن سے جھٹکا اور موجودہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے بے چین سی ہو گئی۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی مجھے کمرے کی ایک دیوار سے کھڑکی بھی دکھائی دے گئی تھی، جو بند تھی۔ کمرے میں گھٹن اور گرمی کا احساس مجھے اب بتدریج بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یہاں تک کہ مجھے وقت کا بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا لیکن جب میں نے لپک کر کھڑکی کے کواڑ کھولے تو ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا کا جھونکا میرے ستے ہوئے چہرے سے ٹکرایا اور صبح کی پرنور روشنی مجھے دکھائی دے گئی۔

کھڑکی کھول کر مجھے ذرا سکون ملا اور کوٹھڑی کی محدود گھٹن آمیز فضا بھی کچھ کم ہونے لگی۔ میں دوبارہ بستر پر آ کر بیٹھ گئی مجھے اب باری باری سب یاد آنے لگے۔ منی سعدیہ کے بارے میں تو سوچ سوچ کر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا...... وہ بے چاری ننھی سی جان مجھے اپنے قریب نہ پا کر کتنی پریشان اور ہراساں ہوئی ہو گی۔ بابا بے چارے الگ میری فکر کر رہے ہوں گے...... بیگم شمشاد تو آج مجھے اسکول سے غیر حاضر دیکھ کر فوراً میری خیر خبر لینے اپنے شوہر انکل اسماعیل کے ساتھ میرے گھر بھی پہنچی ہوں گی۔

غرض مجھے اپنے پیاروں کو یاد کر کے جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہاں اب میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ کم از کم موجودہ صورتحال سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ بدذات بھورل کسی بھی وقت میری عزت پر حملہ کر سکتا تھا اور میں بھی اس کے اس ناپاک منصوبے کو پورا کرنے کی بجائے موت کو گلے لگانے کے بارے میں آخری فیصلہ کر چکی تھی...... کیونکہ بہرحال یہاں میری عزت محفوظ نہیں تھی اور ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ابھی وہ شیطان آدھمکے گا اور اس سے آگے کا تصور بھی میرے لئے محال تھا۔

پھر بے اختیار میری آنکھوں میں بے بسی و بے چارگی کے آنسو امڈ آئے۔ ننھی سعدیہ کی معصوم اور ہر لحظے "امی! امی!" پکارتی ہوئی شبیہہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی اور فرط غم سے مجھے اپنا دل بیٹھتا سا محسوس ہونے لگا اور پھر شاید میں غم و اندوہ سے چور ہو کر بستر پر ہی ڈھے گئی۔

اچانک جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں بری طرح سرتاپا لرز گئی۔ مجھے کوئی جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہا تھا...... یہ ناہنجار بھورل خان تھا...... اسے اپنے اتنے قریب پا کر دہشت زدہ ہو کر سمٹ گئی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اس کے کریہہ چہرے پر بڑی حیوانہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ کمینہ شخص میرے لئے ایک ٹرے میں کھانا لایا تھا۔ ذرا دیر کھڑا پھر وہی بیہودہ گوئی کرتا رہا پھر مجھے دھمکاتا اور اوباشانہ انداز میں ہنستا ہوا چلا گیا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے سکھ کا سانس لیا...... کھانا بھلا میں نے کیا کھانا تھا میں اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی پھر اچانک جیسے میرے اندر جینے کی امنگ پیدا ہوئی۔ جو کسی مضبوط رشتے کے سہارے مہمیز ہو کر اچانک ہی بیدار ہوئی تھی اور وہ رشتہ ایک ماں اور بیٹی کا تھا...... ہاں مجھے زندہ رہنا تھا...... منی سعدیہ کے لئے...... اسے میں "آمنہ بیگم" نہیں بنانا چاہتی تھی جو ساری عمر ہی ادھر اُدھر بھٹکتی رہے۔

میں اپنی تکلیف دہ زندگی کی چھاپ اس معصوم پر لگنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ میں پہلی بار اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے ہوئے یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں غور کرنے لگی۔ اس کے بعد میں نے بغور کمرے کا جائزہ لیا سب سے پہلے اٹھ کر دروازے تک آئی اسے ہولے ہولے دھکیل کر کھولنے کی سعی کی لیکن وہ نہ کھلا...... واپس پلٹی اور



کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی طرف آئی اس کے چوکھٹے پر آہنی سلاخیں نصب تھیں اور کم از کم میرے اندر اتنی طاقت نہ تھی کہ میں اسے اکھیڑ سکتی......

میں نے وہیں کھلی کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے باہر کی طرف کا ذرا تفصیلی جائزہ لیا میرا ذہن تیزی سے مختلف عوامل اور خطوط پر کام کر رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر کا منظر مجھے ایک بوسیدہ سا شکستہ صحن کی صورت میں نظر آیا جدھر ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کے قریب ایک سوکھا درخت استادہ نظر آیا فرار ہونے کے سلسلے میں سب سے پہلے جو میرے اندر خیال ابھرا تھا اس ضمن میں میں نے سوچا کہ اگر میں یہاں کھڑی ہو کر زور زور سے مدد کے لئے چلانا شروع کر دوں گی تو یقیناً آس پاس کے لوگ یا راہگیر میری جانب متوجہ ہو سکتے تھے...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات کا بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ آیا میں آبادی کے اندر ہی کسی اکیلے مکان میں ہوں یا یہ جگہ آبادی سے ہی دور تھی...... مگر فراٹے بھرتی ہوئی تیز ہوائیں اور آس پاس کی خاموش فضا میرے اس آبادی والے خیال کی تردید کر رہے تھے۔

چلا کر مدد کے لئے پکارنے پر بدبخت بھورل خان بھی مشتعل ہو سکتا تھا...... وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ مجھے اس کھلی کھڑکی والے کمرے میں بند کر کے چلا جاتا یقیناً یہ علاقہ آبادی سے دور تھا...... تیز دھوپ نکل چلی تھی...... مجھے پیاس کے ساتھ اب بھوک بھی محسوس ہونے لگی...... کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ بھوک بھی انسان کو سولی پر محسوس ہو سکتی ہے اور یہی حال اس وقت میرا ہو رہا تھا...... بہرطور میں نے جیسے تیسے کھانا زہر مار کیا...... جو سوکھی روٹی اور یخ بستہ سالن پر مشتمل تھا...... پانی پیا اور اس کے بعد پھر بستر پر آ گئی اور سوچ میں غلطاں ہو گئی!

دن ڈھلا شام بھی تمام ہوئی اور تیز فراٹے بھرتی ہوائیں جب کھڑکی سے پرے شکستہ سے صحن میں ایستادہ خزاں رسیدہ درخت کی سوکھی شاخوں سے سیٹیاں بجاتی گزرتیں تو یوں لگتا، جیسے لاتعداد ارواح خبیثہ چلا رہی ہوں...... بجز زناٹے دار ہواؤں کے چہار اطراف خاموشی تھی دور کہیں آوارہ کتوں اور گیدڑوں کے چیخنے اور رونے کی منحوس آوازوں سے اب تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی تامل نہ تھا کہ یہ ویران مکان کسی نواحی اور میدانی علاقے میں واقع تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی مجھے ایک بار پھر

شدید قسم کے خوف نے آن لیا اور دل بے اختیار اللہ کو یاد کرنے لگا...... کافی دیر تک اللہ سے دست بہ دعا ہونے کے بعد خود کو روحانی سکون نصیب ہوا...... میں اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئی۔

باہر رات کی مہیب تاریکی میں آسمان سے ٹمٹماتے تاروں کی روشنی میں بوسیدہ صحن میں استادہ خزاں رسیدہ درخت کسی پر ہیبت ہیولے کی طرح محسوس ہو رہا تھا چاند کی آخیر کی تاریخوں کا تھا...... دل کی حالت پتہ کھڑکے اور دل دھڑکے جیسی ہو رہی تھی...... معاً پھر میرا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا...... نجانے کس طرح اور کہاں سے خونخوار کتوں اور بھوکے گیدڑوں کا غول آپس میں ڈراؤنے انداز میں لڑتا چیختا چلاتا ہوا صحن میں آ دھمکا۔ ان کی آوازیں اتنی منحوس تھیں کہ میرا دل و دماغ ماؤف ہونے لگا۔ بھورل سے کہیں زیادہ تو مجھے اس ماحول سے خوف محسوس ہونے لگا تھا...... پھر معاً آپس میں گتھم گتھا ان جنگلی کتے اور گیدڑوں کو جیسے انسان کی بو محسوس ہو گئی اور انہوں نے اپنی اپنی خونخوار و خوفناک تھوتھنیاں اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر اپنی لڑائی بھول کر بیک وقت کھڑکی کی جانب بھونکتے اور چیختے ہوئے لپکے......

میرے منہ سے مارے دہشت کے چیخ نکل گئی اور بے اختیار کھڑکی سے چند قدم پیچھے ہٹ گئی وہ سب غراتے ہوئے کھڑکی کی سلاخوں پر چٹ کر اپنی سرخ سرخ زبانیں لپلپاتے ہوئے میری طرف خونخوار نظروں سے تکنے لگے۔ دہشت کے مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ان کی آنکھوں میں درندگی کی چمک نمایاں طور پر مجھے محسوس ہو رہی تھی مجھے اس ہولناک حقیقت کا پورا اندازہ تھا کہ اگر کھڑکی کے بیچ یہ آہنی سلاخیں نصب نہ ہوتیں تو یقیناً یہ درندے میری تکا بوٹی کر کے رکھ دیتے۔ مجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ میں آگے بڑھ کر اندر سے کھڑکی کے دونوں چوبی کواڑ بند کر دوں...... ان کی صورتوں سے ہی مجھے خوف آ رہا تھا...... بہر طور آخر میں نے ہمت کی اور ان کے غرانے کی پروا کئے بغیر آگے بڑھی اور زور سے کھڑکی کے کواڑ بند کر کے اندر سے بلی اٹکا دی...... کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں اب کسی قدر کم ہو گئی تھیں......

کافی دیر گزر گئی...... میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ کھڑکی کھولی تو صحن خالی تھا...... غالباً کتے اور گیدڑ دیواریں پھلانگ کر واپس جا چکے تھے...... میں کھڑکی کھول کر دوبارہ



اپنے بستر پر آ گئی...... میری پریشانی فزوں تر ہوتی جا رہی تھی...... دل ہر لحظہ کسی انجانے اور متوقع تشویشناک واقع سے خوف زدہ ہو کر بیٹھا جا رہا تھا...... رات دبے پاؤں گزر رہی تھی...... نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی......

تب اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ موٹر گاڑیاں آس پاس چل رہی ہوں...... پھر ان کے رکنے اور چند لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لہجہ انتہائی کرخت دار تھا۔ اس کے بعد متعدد بھاری قدموں کی آوازیں بھی ابھریں۔ جو قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں کسی اچانک غیبی امداد کے خیال کا دل میں آتے ہی میرا رواں رواں مسرت سے جھوم اٹھا اور پھر اچانک مکان کے بیرونی دروازے کے کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی بہت سے لوگوں کے دوڑتے قدموں کی آوازیں اب میرے کمرے کے قریب آنے لگیں۔

میں اپنے کمرے کے دروازے کی جانب آ کر متوقع غیبی امداد کی منتظر کھڑی ہو گئی پھر کمرے کا دروازہ کسی نے باہر سے کھولا۔ مجھے تالے میں چابی گھمانے کی آواز صاف سنائی دی تھی، اس کے بعد اگلے ہی لمحے کمرے کا دروازہ پورا کھل گیا اور سامنے نگاہ پڑتے ہی میرے حلق سے مارے دہشت کے چیخ نکل گئی اور کسی غیبی امداد کے پہنچنے کی خوش فہمی دھواں ہوتی چلی گئی۔

❁❁❁

”نا...... پٹ! نا...... ان وڈے بھوتاروں سے بیر مت لے، یہ تو وہی بات ہوئی کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر......“ ماما وسایا نے دہکتے ہوئے کوئلے کو چمٹے سے پکڑ کر حقے کی چلم پر دھرتے ہوئے سامنے فرش پر بیٹھے دادو سے مربیانہ لہجے میں کہا اور حقے کی نے کو اپنے پوپلے منہ سے لگاتے ہوئے جلدی جلدی سانس لے کر اسے سلگانے لگا۔ دادو اسے سسی اور وڈیرے اختیار علی کے بارے میں نیز اس ضمن میں زمیندار اختیار علی کے خلاف اپنے آئندہ کے عزائم بھی ماما اللہ وسایا سے گوش گزار کر چکا تھا اور جس کے جواب میں ماما وسایا نے اس سے یہ بات کہی تھی...... جس سے دادو قطعی متفق نہ تھا...... وہ تو تیار بیٹھا تھا کہ گوٹھ والوں کی اکٹھ کچہری بٹھا کر مظلوم سسی اور ظالم زمیندار اختیار علی کا فیصلہ ہو...... لیکن اپنے ماما وسایا کی بات پر اسے سخت مایوسی ہوئی تھی

بلکہ وہ اب پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ ہی ماما سے اس بات کا ذکر کیا۔

پھر رات دبے پاؤں گزر رہی تھی...... باہر دریائے سندھ سے آتی ہوئی تیز ہوا کی پراسرار گونج ابھر رہی تھی...... اُکھڑے ہوئے سیلن زدہ سے فرش والے صحن پر دو جھلنگا سی رلی بچھی چارپائیوں پر دادو کے بوڑھے ماں باپ...... حضور اور مائی گجگل بے سدھ لیٹے خراٹے لے رہے تھے، وہ دونوں میاں بیوی جلدی سونے کے عادی تھے اور صبح دم ہی اٹھتے تھے...... جبکہ ماما وسایا اور دادو دیر تک ایک کونے میں پرانی سی خستہ گودڑی بچھائے باتوں میں مشغول تھے......ایک طرف پھونس کے چھپر تلے بانس کے ساتھ جھولتی لالٹین کی زرد مدھم سی روشنی میں دونوں کے دم بہ خود سے سائے کچی شکستہ دیوار پر یوں لرزہ براندام تھے۔ جیسے میت پر آئے ہوں۔

دادو کافی دیر بعد ماما وسایا کی بات پر جواباً اٹل لہجے میں بولا......"ماما! سسی ایک معصوم مظلوم لڑکی ہے...... اس نے مجھے ادا کہا ہے...... کیا اس کی عزت خوار کرنے والے کو ایک غیرت مند بھائی زندہ چھوڑ سکتا ہے......؟ تُو بتا ماما میکوں...... یہ تو شکر کر کہ میں خود اپنے ہاتھوں میں کلہاڑی اٹھانے کی بجائے کچہری بلوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"یہ تو چنگا کر رہا ہے میں مانتا ہوں...... پر پٹ......" ماما وسایا نے کہا اور خود ہی نجانے کیا سوچ کر اپنی ہی بات ادھوری چھوڑ دی۔ جب کچھ کہہ نہ سکا تو پرسوچ انداز میں حقہ گڑگڑایا گم صم انداز میں دھواں فضا میں اگلا پھر ایک نظر بوسیدہ سے کچے صحن کے وسط میں استادہ بید مشک کے پیڑ کی طرف یوں تکنے لگا، جیسے وہ کوئی پراسرار مخلوق ہو، جس کی شاخیں تیز ہوا میں عجیب انداز سے ہل ہل کر شور مچا رہی تھیں۔ چھپر تلے لالٹین کی پیلی لو بھی پھڑپھڑا رہی تھی پھر جیسے اچانک ماما وسایا کو کچھ سوجھا اور دادو سے نئے سرے سے بات کرتے ہوئے کہنا شروع ہوا۔

"دیکھ میڈا پٹ! جو ہونا تھا سو ہو گیا تو اب اس بات کو پی جا اور زمیندار اختیار علی کو گوٹھ کی کچہری میں بدنام مت ہونے دے، لیکن زمیندار کو اس طرح دھمکاتا بھی آ...... پھر دیکھ زمیندار نہ صرف ہمارا قرضہ معاف کر دے گا بلکہ ہمیں نوازتا بھی رہے گا، ہمارے دن بھی پھر جائیں گے۔" ماما نے اپنی بات ختم کی تو دادو عجیب ناگوار سی نظروں سے ماما کی طرف دیکھنے لگا۔ ماما کی بات اسے انتہائی بری محسوس ہوئی تھی تاہم وہ



خاموش رہا...... یہی نہیں وہ خاموشی سے وہیں اجرک اوڑھے گودڑ پر لیٹ گیا۔ رات کے سناٹے میں ماما کے حقے کی گڑگڑاہٹ عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھی۔

اگلے دن دادو صبح دم ہی بیدار ہو گیا۔ اس کا ذہن کثیف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا وہ چائے پاپے کا ناشتہ کر کے گھر سے باہر آ گیا۔ چائے پینے اور پاپہ ڈبو کر کھانے کے دوران وہ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر چکا تھا، لہٰذا سسی کو انصاف دلانے کے معاملے کے سلسلے میں کچہری بٹھانے کے واسطے سب سے پہلے اس نے حاجی اللہ ڈنو کے گھر کا رخ کیا اگرچہ وہ ایک چھوٹی سطح کا زمیندار تھا لیکن اپنے علم وفضیلت اور اثر ورسوخ کے سلسلے میں پورے گوٹھ کے چند معتزز افراد میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یہی نہیں چودھرہ کی سطح کی کچہری کا بھی وہ نیا رکن تھا، ایسے معتبر شخص سے ملنے کے لئے جاتے ہوئے دادو کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح یہ سب کچھ اسے سمجھائے گا۔ کیا وہ میری بات کا یقین بھی کرے گا؟ یا مجھے سسی کو اپنے ہمراہ لے کر آنا چاہئے تھا۔ انہی خیالوں میں الجھا وہ بالآخر حاجی اللہ ڈنو کے پختہ اینٹوں والے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دادو نے دروازے پر دستک دی۔ جواباً ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے دروازہ کھولا۔

"سائیں حاجی صاحب گھر پر موجود ہیں؟" دادو نے لڑکے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ شاید حاجی صاحب کا بیٹا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ سر پر اس نے سفید ٹوپی پہن رکھی تھی اور ململ کے سفید شلوار کرتے میں ملبوس تھا، اس نے بتایا...... بیو (ابو) مسجد سے ابھی آنے والے ہیں۔ آپ کو ضروری کام ہے تو اوطاق کھول دیتا ہوں آپ انتظار کر لیں۔" دادو اس بچے کے احترام آمیز رویے سے بڑا متاثر ہوا اور جواباً ہولے سے مسکرا کر اثبات میں اپنا سر ہلایا...... اس کے بعد وہ لڑکا اندر چلا گیا اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر دادو کو اندر بٹھا دیا۔

دادو کو ابھی وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ حاجی صاحب وہاں آ پہنچے۔ ان کے ہمراہ ایک شخص کو دیکھ کر دادو بری طرح چونک گیا...... وہ کمدار مولا بخش تھا، جس نے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح اور سر پر سفید ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ وہ بھی دادو کو وہاں موجود پا کر ٹھٹھکا تھا۔ دادو پر نظر پڑتے ہی اس نے فوراً دادو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں حاجی صاحب یہی وہ چھوکرا ہے جس کے بارے میں میں آپ کو بتا رہا تھا کہ......"

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی...... حاجی صاحب نے ایک لمبی اور تائیدی قسم کی "ہوں" کی اور دادو کی طرف ایک نظر ناگوار سے دیکھنے لگے...... وہ ایک دبلے پتلے اور باریش شخص تھے۔ قد ذرا نکلتا ہوا تھا۔ داڑھی اور سر کے بال مہندی رنگ کے تھے۔ چہرے پر نورانی کیفیت رچی ہوئی تھی۔ سفید براق کرتے اور شلوار میں ملبوس تھے۔ سر پر سفید ٹوپی اور ہاتھ میں ایک تسبیح تھی۔ دادو بے چارہ ہونق سا ہو گیا مگر پھر جلدی ہی آگے بڑھ کر حاجی صاحب کو سلام کیا...... حاجی صاحب نے بڑی رکھائی سے اس کے سلام کا جواب دیا تو دادو نے ادب سے کہا۔ "حاجی صاحب! میں آپ کے پاس ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا تھا۔"

دادو کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی کرخت نگاہوں سے دادو کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم کس کام سے آئے ہو چھوکرے۔" ان کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی بولے۔ "اپنے گناہوں کا بوجھ دوسرے کے سر ڈالنا چاہتے ہو، یہی کام تھا ناں تمہیں مجھ سے۔" حاجی صاحب دادو کو بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے جبکہ دادو کے لئے ان کا یکطرفہ رویہ ورطۂ حیرت میں مبتلا کرنے والا اور تاسف آمیز تھا۔ اس نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ کمدار مولا بخش اپنی چال پہلے ہی سے چل چکا ہے اور حاجی صاحب کو پیشگی اس کے خلاف ورغلا چکا ہے مگر دادو کو دکھ اس بات کا ہو رہا تھا کہ حاجی صاحب جیسے معتبر شخص بھی مکار مولا بخش کی باتوں میں آ گئے تھے اور مزید افسوس یہ ہو رہا تھا کہ سراسر جانبداری سے کام لے رہے تھے۔ لہٰذا دادو نے اس بار تمام احترام و آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حاجی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا...... "حاجی صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ گوٹھ ہی کی نہیں بلکہ چوحدہ کی بڑی کچہری کے بھی ایک معتبر رکن ہیں...... لیکن آپ کچہری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ آپ کو مجھ پر الزام لگانے کی بجائے مجھے بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دینا چاہئے تھا۔ کچہری میں تو ایک قاتل کو بھی اپنی صفائی میں بولنے کا حق ہوتا ہے اور میں تو پھر



بھی ایک مظلوم اور معصوم بچی کی فریاد لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔" دادو اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن فرط جوش سے اس کا پورا وجود ایک ارتعاش میں مبتلا تھا۔

حاجی صاحب بڑی کھا جانے والی نظروں سے دادو کی طرف گھورنے لگے۔ پھر دادو وہاں ایک لمحے کو بھی نہ رکا اور حاجی صاحب کے جانبدارانہ رویے پر افسوس کرتا رہا...... اسے شدید ذہنی دکھ پہنچا تھا کہ حاجی صاحب جیسی ہستی جو گوٹھ کی بڑی معزز شخصیت سمجھی جاتی ہے، یوں مکار اور چالاک کمدار مولا بخش کی باتوں میں آ گئی تھی۔ مولا بخش اپنے وڈے سائیں...... اختیار علی کو بچانے کی خاطر پوری طرح سے اپنی گماشتہ گیری میں مصروف تھا، جس کی چند اور مثالیں بھی دادو کے کانوں میں پڑیں اور وہ پوری جان سے سلگ اٹھا تھا۔ گوٹھ میں اب دادو اور سسی کے گٹھ جوڑ کے بارے میں طرح طرح کی الٹی سیدھی لغو باتیں مشہور ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ دادو نے لوگوں کو یہاں تک کہتے سنا تھا کہ دادو اور سسی کا پہلے ہی سے خفیہ گٹھ جوڑ رہ چکا ہے اور اب وہ اپنا جرم چھپانے کے لئے سسی کا گناہ زمیندار اختیار علی کے سر تھوپنا چاہ رہا ہے۔ دادو جانتا تھا کہ ان باتوں میں ذرا بھی صداقت نہ تھی۔ لیکن وہ کس کس کا منہ بند کرتا۔ کون تھا جو اس کی بات پر یقین کرتا کہ معصوم سسی پر اس نے نہیں زمیندار اختیار علی نے ظلم کیا ہے۔ اس افواہ طرازی سے بے چاری سسی بھی بدنام ہو رہی تھی۔ پھر ایک دن سسی نے دھماکہ کر دیا...... اس نے اپنے ہی گھر کے کمرے میں رسی چھت سے باندھ کر خودکشی کر لی۔ یہ خبر پورے گوٹھ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی اور یہی نہیں سسی نے اپنی موت کے بعد ایک اور دھماکہ کیا تھا...... اس کی خودکشی کے بعد لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا تھا کہ مرتے وقت وہ امید سے تھی۔ دادو ان پے در پے صدمات کے بعد زمین میں ہی گڑ گیا تھا۔

❁❁❁

انسپکٹر ثناء اللہ عباس ان کی توقعات سے بہت اونچا جا رہا تھا۔ اس کی زبردست کارکردگی کو محسوس کرتے ہوئے کمال اور سعدیہ کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ خورشید احمد قتل کیس کے اصل مجرم تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ نیز سعدیہ تو کچھ زیادہ ہی اپنے دیرینہ مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں پرامید ہونے لگی تھی۔ دراصل انسپکٹر ثناء اللہ عباسی نے

جیسے ہی خورشید احمد قتل کیس میں ملوث پرویز کو وعدہ معاف گواہ بنا کر اسے عام معافی کا لالچ دیتے ہوئے یہ حقیقت اگلوائی کہ اصل میں مقتول خورشید احمد جو "عثمان ٹریڈرز" میں گوڈاؤن کیپر تھا، کو واثق علی نے ہی اس کے ذریعے قتل کروایا تھا تو انسپکٹر ثناء اللہ نے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر پرویز کا بیان تحریری طور پر پولیس میں ریکارڈ کروانے کے بعد فوراً "عثمان ٹریڈرز" کے گوداموں پر چھاپہ مارا بلکہ ساتھ ہی واثق علی کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس دن سعدیہ بڑی خوش تھی وہ واثق علی، جو اس کی ماں آمنہ بیگم کا مقروض تھا...... کی گرفتاری پر اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے یہ "خوشخبری" ماں کو سنانے کے لئے وقت سے پہلے ہی گھر آ دھمکی۔

"امی جان! آپ کا مجرم اب کٹہرے میں آنے والا ہے...... ہاں امی جان! اسے اب تمہارا ایک قرض لوٹانا ہوگا۔"

آمنہ بیگم اپنی بیٹی سعدیہ کی بات پر ذرا چونکیں تاہم جواباً خاموش رہیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس موضوع سے ہی احتراز برت رہی تھیں۔

"امی میں اس شخص کی بات کر رہی ہوں جس نے آپ کی زندگی کی خوشیاں چھین کر بدلے میں آپ کو دکھ ہی دکھ دیئے تھے...... لیکن آپ تو خوش ہی نہیں ہوئیں۔ میں واثق علی کی بات کر رہی ہوں امی جان!" ماں کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر سعدیہ نے دوبارہ پر زور لہجے میں کہا تو آمنہ بیگم نے تادیبی انداز میں سعدیہ سے کہا۔

"بیٹی! اپنے ابو کا تمیز سے نام لو وہ میرے شوہر نہیں رہے...... لیکن تمہارے باپ اب بھی ہیں وہ......" سعدیہ ماں کی بات پر گنگ رہ گئی اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنی ماں کی جانب دیکھنے لگی...... اسے حیرت تھی کہ اس کی ماں کے لئے اب بھی وہ شخص لائق احترام تھا جس نے اس کی زندگی میں انگارے بھر دیئے تھے...... وہ غم آمیز حیرت سے بولی۔ "امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میں ایسے شخص کو باپ کس طرح مانوں جس نے مجھے ماں سمیت بے خانماں کر دیا تھا اور یہی نہیں، اس دن گھر آنے پر آپ کو اور مجھے پہچان جانے کے باوجود اس شخص نے کتنی بے رخی برتی تھی۔ آپ بھول گئیں...... نہیں امی...... وہ شخص میرے لئے تا عمر باعث ندامت اور لائق نفرت رہے گا۔" سعدیہ کے لفظ لفظ میں باپ کے لئے نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا۔ اسے آج ماں کے



رویے نے بڑا مایوس کیا تھا اور وہ اس کا اظہار اپنی ماں سے کئے بنا نہیں رہ سکی اور لمحہ بھر توقف کے بعد ماں کی طرف غمگین نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا شکوہ کناں ہوئی۔ "امی جان! آپ بھی عجیب باتیں کرتی ہیں جس مقصد کے لئے آپ کی محنتوں اور اپنی کوششوں کے بعد میں آج اس مقام تک پہنچی ہوں کہ آپ کے شوہر سے آپ کو حق اور انصاف دلا سکوں اور اب جبکہ ہماری فتح قریب ہے تو آپ مجھے کچھ اور ہی درس دے رہی ہیں...... نہیں امی، میں یہ محنت ضائع نہیں ہونے دوں گی۔"

وہ چپ ہوئی تو اس کی ماں سمجھاتے ہوئے ملائمت سے بولیں۔ "بیٹی! خدا گواہ ہے میں نے کبھی تمہارے دل میں باپ کی نفرت ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن تم سے ماضی کے حالات میں چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔ بس مجھ سے اتنا ہوا کہ میں نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔"

آمنہ بیگم اتنا کہہ کر چپ ہو رہیں۔ وہ فرط جذبات سے آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ ماں کی بات پر سعدیہ دکھی مسکراہٹ کے ساتھ ہنس کر بولی۔ "امی جان! آپ بھی عجب وفا کی پتلی ہیں کتنی صفائی سے آپ نے بات بنانے کی کوشش کی ہے...... بے فکر رہیئے...... آپ کبھی بھی اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ نہیں ہوں گی۔ مجھے اس بات کا پورا اعتراف ہے کہ آپ نے کبھی میرے دل میں باپ کی نفرت اجاگر نہیں ہونے دی اور معاف کیجئے گا امی جان! کہ آپ نے کبھی اپنے اوپر بیتنے والے دکھوں کا رونا میرے سامنے نہیں رویا...... وہ...... وہ تو میرے ہاتھ ایک دن آپ کی ڈائری لگ گئی تھی جس میں آپ نے شروع سے آخر تک اپنے سنگدل اور بے حس شوہر واثق علی کی ظلم و ناانصافی اور فریب کی داستان رقم کر رکھی تھی اور تب سے امی جان میں نے قسم کھا لی تھی کہ آپ کو آپ کا حق ایک نہ ایک دن دلا کر رہوں گی...... اس شخص کو اب کٹہرے میں آ کر نہ صرف آپ پر کئے گئے ظلم کی معافی مانگنی پڑے گی بلکہ آپ کا حق بھی واپس لوٹانا ہوگا۔"

سعدیہ غم و غصے کی شدت سے کانپنے لگی تھی...... آمنہ بیگم اپنی بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی بیٹی کا یہ روپ دیکھ کر لرز اٹھیں۔ اس سیدھی سادی اور نرم و نازک لڑکی کے اندر اتنا بڑا نفرت کا الاؤ دہک رہا تھا...... اس کا آمنہ بیگم کو صحیح معنوں میں آج اندازہ ہوا تھا۔ تاہم وہ ایک بار پھر بڑے رسان سے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی! تم

سمجھتی ہو کہ قانون کا لباس پہن لینے سے ہی انسان کو اپنا حق اور انصاف مل سکتا ہے.....تو یہ طریقہ ہی غلط ہے..... ایک بڑے منصف کی ذات ابھی میرے سر پر سایہ فگن ہے میں نے اپنا کیس اسی کی عدالت میں دے دیا ہے اور مجھے اس ذات باری تعالیٰ پر پورا یقین ہے کہ وہ میرے حق میں ایک نہ ایک دن فیصلہ سنائے گا۔"

"لیکن امی جان! یہ بھی تو درست ہے..... اللہ تعالیٰ بھی اس کا ذریعہ اپنے بندوں کو ہی بناتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی اب پوری طاقت بخش دی ہے کہ آپ کو اب عدالت سے انصاف دلا کر رہوں۔" وکیل سعدیہ نے مدلل لہجے میں قطعیت سے کہا.....اور اس کی ماں نے چپ سادھ لی۔

⊛⊛⊛

انسپکٹر ثناء اللہ عباسی نے "عثمان ٹریڈرز" کے کرتا دھرتا واثق علی کے خلاف بڑا مضبوط چالان بنایا تھا اور اس کی مشکل اور بظاہر ناقابل یقین گرفتاری کو اتنا یقینی بنایا تھا کہ واثق علی کی حوالات سے خود کو چھڑانے کی ساری تدبیریں اور کوششیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں..... دراصل اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انسپکٹر ثناء اللہ عباسی نے واثق علی کے گوداموں پر جو چھاپہ مارا تھا وہ سو فیصد کامیاب ثابت ہوا تھا ان گوداموں میں کافی تعداد میں اسمگلنگ کا وہ مال بھی تھا جن میں منشیات کافی تعداد میں موجود تھی۔ بہر طور واثق علی پر مقدمہ چلا ادھر پرویز نے بھی وعدہ معاف گواہ بنتے ہوئے اس بات کا عدالت میں اقرار کیا کہ مقتول خورشید احمد کو اس نے واثق علی کے ایماء پر قتل کیا تھا.....

چونکہ خورشید احمد ایک ایماندار اور شریف النفس انسان تھا، اس نے گوداموں میں کسی قسم کی گڑبڑ محسوس کرتے ہوئے فوراً واثق علی کو خبر کرنی چاہی..... اب بھلا اس معصوم خورشید احمد کو کیا معلوم تھا کہ درحقیقت اس کالے دھندے میں اس کا اپنا مالک ہی دھنسا ہوا ہے۔ لہٰذا پہلے پہل تو خورشید احمد کو بھی واثق علی نے اپنے خاص گماشتے پرویز کے ذریعے لالچ دیتے ہوئے خاموش رہنے کی تاکید کی لیکن خورشید احمد نہ مانا اور اس نے باقاعدہ نوکری سے استعفیٰ دے دیا..... اب ظاہر ہے خورشید احمد کا گوڈاؤن چھوڑنا خود ان کے لئے موت کے مترادف تھا..... لہٰذا پھر خاموشی کے ساتھ خورشید احمد کا قصہ پاک کر دیا گیا۔ واثق علی نے اپنی صفائی کے لئے شہر کے ایک بڑے وکیل کو مقرر کیا تھا



جبکہ کیس کے استغاثے کی پیروی خود وکیل سعدیہ سعید کر رہی تھی اس کا جوش دیدنی تھا اور تو اور وہ اپنی ماں آمنہ بیگم کو بھی کمرۂ عدالت کے حاضرین میں شامل کر چکی تھی۔ جو ایک جانب حیران پریشان سی بیٹھی تھیں۔

وکیل سعدیہ سعید کے چہرے سے اپنے کسی دیرینہ مقصد کے پورا ہونے کی مسرت آمیز تسکین ہویدا تھی، جس میں ایک جوشِ حلاوت بھی محسوس ہو رہا تھا، سامنے کٹہرے میں اس کا باپ واثق علی موجود تھا..... جبکہ دوسرے کٹہرے میں پرویز بھی کھڑا تھا.....

دوران سماعت واثق علی نے عدالت میں اب حسب توقع یہ موقف اختیار کیا تھا کہ پرویز نامی اس کے ادنیٰ ملازم نے اس کے بارے میں جو بھی بیان دیا ہے وہ سراسر بدنیتی اور سازش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ، یعنی واثق علی "عثمان ٹریڈرز" کے نام گزشتہ کئی دہائیوں سے امپورٹ ایکسپورٹ جیسا صاف ستھرا کاروبار کر رہا ہے اور اعلیٰ کاروباری حلقے میں اس کی فرم کی ساکھ معتبر اور شفاف مانی جاتی ہے..... رہی بات کہ "عثمان ٹریڈرز" کے گوداموں سے جو قابل اعتراض مال برآمد ہوا ہے اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک سازش ہے جو پرویز نامی شخص نے کسی میرے کاروباری حریف کے ساتھ مل کر کی ہے اور اس کا میرے خلاف خورشید احمد کو قتل کرنے کا بیان محض لغو اور بوگس ہے، اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں..... حقیقت یہ ہے کہ خورشید احمد میرا واقعی ایک وفادار اور فرض شناس ملازم تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ وہ ضرور ملزم پرویز کی خفیہ اور غیر قانونی سرگرمیوں سے آگاہ ہو چکا ہوگا، لیکن بھانڈا پھوٹنے کے ڈر سے ملزم پرویز نے بے گناہ خورشید احمد کا خون کر ڈالا اور اب خود کو وعدہ معاف گواہ بناتے ہوئے اپنا جرم میرے سر تھوپ کر بری ہونا چاہتا ہے۔"

بلاشبہ واثق علی کو اس کے ذہین وکیل صفائی نے بڑا اچھا اور مدلل سبق رٹا دیا تھا..... ایک لمحے کو تو سیاہ گاؤن میں ملبوس وکیل سعدیہ سعید بھی خود کو واثق علی کے اس موقف کے آگے بے بس سی محسوس کرنے لگی لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس نے اندر ہی اندر خود کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔ انکل رانا الطاف ایڈووکیٹ کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجنے لگے۔ "ایسا ہوتا ہے بیٹی! بعض مرتبہ مخالف کا موقف اتنا مدلل اور ٹھوس ہوتا ہے کہ اس میں دراڑ ڈالنے کی بہ ظاہر کوئی راہ ہی سجھائی نہیں دیتی..... لیکن اگر خود کو اس بات کا

یقین ہو کہ مد مقابل کا موقف سراسر جھوٹ پر مبنی ہے تو بآسانی حریف کے جھوٹے موقف سے ہی کسی کمزور شق کو ہتھیار بنا کر اپنے مد مقابل کو پچھاڑا جا سکتا ہے....." اور زیرک وکیل سعدیہ سعید کے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا پھر ذرا دیر بعد ہی اس کے دلکش لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی جیسے اس نے واثق علی کے بیان میں کسی کمزور نکتے کو پکڑ لیا ہو اور اب وہ اسے اس کے خلاف ہی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہو۔ اس نے ایک گہری اور طمانیت بھری سانس خارج کی..... سامنے ذرا فاصلے پر کھڑے واثق علی کا وکیل صفائی جانے کیوں وکیل سعدیہ سعید کا چہرہ پڑھتے ہوئے بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔

❁❁❁



عدالت کی کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ بلاشبہ وکیل سعدیہ کے لئے یہ ایک عجیب نوعیت کا کیس تھا جس میں اسے ایک قرار واقعی سزا پانے والے ملزم پرویز کے حق میں بیک وقت صفائی اور استغاثے کا فرض ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہر طور دوسرے ملزم، واثق علی کا رٹا رٹایا موقف سن کر وہ اپنی نشست سے اٹھی اور جج صاحب کی اجازت کے بعد واثق علی سے جرح کا آغاز کیا۔ حاضرین عدالت میں بجز چند ایک کے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کٹہرے میں کھڑے ملزم اور اس سے جرح کرنے والی خاتون وکیل سعدیہ سعید کے مابین باپ بیٹی کا رشتہ ہے۔ وکیل سعدیہ سعید نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور اپنے باپ واثق علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہلا سوال پوچھا۔

"واثق علی صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ نے یہ بات اپنے بیان میں کس بنیاد پر کہی..... ہو سکتا ہے مقتول خورشید احمد کی مشکوک یا غیر قانونی سرگرمیوں سے ملزم پرویز آگاہ ہو گیا ہو اور بھانڈا پھوٹنے کے ڈر سے اس نے خورشید احمد کا قتل کر دیا۔" وکیل سعدیہ کے سوال پر ملزم واثق علی ایک لمحے کو ہونق سا ہو گیا۔ سننے والوں کے لئے سعدیہ کا سوال بہ ظاہر عام سا تھا...... لیکن زیرک وکیل صفائی جس کا نام ایڈووکیٹ راحیل خان تھا ایک دم اپنے موکل واثق علی کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آبجیکشن یور آنر! فاضل وکیل میرے موکل واثق علی سے اس قسم کا فضول سوال کر کے معزز عدالت کا وقت برباد کر رہی ہیں۔"

"یور آنر! میرا سوال بالکل فضول نہیں ہے یاد رہے کہ پولیس ریکارڈ میں یہ بات درج ہے کہ ملزم واثق علی کے گوداموں سے قابل اعتراض اور غیر قانونی مال برآمد ہوا ہے..... جس کا تعلق میرے اس "فضول سوال" سے بنتا ہے جو میں آگے ثابت کر کے دکھاؤں گی۔"

وکیل سعدیہ نے فوراً کہا...... جس کے جواب میں جج نے وکیل صفائی راحیل خاں کا اعتراض مسترد کرتے ہوئے وکیل سعدیہ کو اپنی بات جاری رکھنے کو کہا اور ساتھ ہی ملزم واثق علی کو جواب دینے کا پابند کیا۔

واثق علی نے اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کیا بولا۔ ''بس...... سیدھی سی بات ہے اس نے ضرور اپنی آنکھوں سے مقتول خورشید احمد کی گوداموں میں ہیر پھیر محسوس کر لی ہوگی اور بعد میں اپنے جرم کو چھپانے کے لئے اس نے اس کا قتل کر دیا۔''

اس کی بات پر وکیل سعدیہ کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے وہ اس سے یہی اگلوانا چاہ رہی ہو...... اس نے ایک اور حملہ کیا۔ ''اچھا تو آپ کو اس بات کا احساس مقتول خورشید احمد کے قتل کے بعد ہوا کہ آپ کے گوداموں میں پرویز نے مشکوک مال کی ہیرا پھیری کی۔''

''بالکل......'' واثق علی نے بلا جھجک کہا اور جب سعدیہ نے یہ پوچھا کہ ''واثق علی صاحب! جب آپ کو پرویز کے بارے میں ان سب باتوں کا علم ہو گیا تھا تو پھر آپ نے اپنے گوداموں کو چیک کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی؟'' تو اس کے اس سوال پر واثق علی کو اپنے پہلے اثباتی جواب پر غلطی کا احساس ہوا...... لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سعدیہ اس سے جو کچھ اگلوانا چاہتی تھی اگلوا چکی تھی، تاہم وہ بولا۔ ''م...... مجھے وقت نہیں مل سکا...... ان دنوں میں کاروباری دوروں پر بیرون ملک تھا۔'' اس نے جلدی سے بات بنائی پھر اس کے بعد سعدیہ نے مزید تند و تیز جرح کرتے ہوئے اپنے باپ کو گھیرتی رہی اور اس دوران ملزم واثق علی کا وکیل صفائی بار بار درمیان میں ٹوکتا رہا اور کبھی اس کا اعتراض مسترد ہو جاتا تو کبھی ''سٹینڈ'' ہو جاتا پھر اس کے بعد جب وکیل صفائی ایڈووکیٹ راحیل خاں کی باری آئی تو سعدیہ کو محسوس ہوا کہ اس کا مد مقابل بھی کسی طرح کم نہیں ہے، لیکن اس نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ بہر طور تھوڑی دیر بعد عدالت کا وقت ختم ہو گیا اور باقی کی سماعت اگلی پیشی پر ٹھہری۔

اس دوران ایڈووکیٹ رانا الطاف برابر سعدیہ کو مذکورہ کیس سے متعلق زور و شور سے تیاری کرانے لگے اور آئندہ کی متوقع فیصلہ کن پیشی سے متعلق گائیڈ لائن دیتے رہے۔



''دیکھو بیٹی! تمہارا مد مقابل کوئی معمولی وکیل نہیں ہے۔'' انہوں نے سعدیہ کو بتایا۔

''لیکن گھبرانے کی بات نہیں، بس دوران سماعت اس کے جملوں کو ذہن نشین رکھو اور اگلی پیشی پر وہی جملے اس پر الٹنے کی کوشش کرو۔''

اگلی سماعت ٹھیک نو دن بعد عمل میں آئی۔ دونوں طرف خوب تند و تیز دلائل اور جرح کا سلسلہ چلتا رہا اور بالآخر ایک افسوس ناک فیصلہ عمل میں آیا۔ جج نے بڑے غور سے دلائل وغیرہ سننے کے بعد ملزم پرویز پر مقتول خورشید احمد کے قتل عمد کی فرد جرم ثابت ہوتے ہی اسے موت کی سزا سنا دی اور واثق علی کو باعزت بری کرنے کے احکامات جاری کر دیئے...... فیصلہ سنتے ہی سعدیہ سناٹے میں آ گئی۔ بھری عدالت کو جیسے سانپ سونگھ گیا، ایڈووکیٹ راحیل خاں نے ایک فتح آمیز طنزیہ نگاہوں سے سعدیہ کی طرف دیکھا اور کچھ یہی سلوک کٹہرے سے نکل کر اپنے وکیل راحیل خاں سے گلے ملتے ہوئے واثق علی نے بھی کیا۔

جج اپنا آخری فیصلہ سنانے اور قلم کی نب توڑنے کے بعد اپنے چیمبر میں تشریف لے جا چکے تھے۔ کمال سعدیہ کی حالت دیکھ کر اسے تشفی دینے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

ادھر جب سعدیہ مایوس قدموں سے کورٹ کے برآمدے تک پہنچی تو اچانک ایک عورت ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی سعدیہ پر جھپٹی اور اس کا چہرہ نوچتے ہوئے بولی۔

''تت...... تم نے میرے شوہر میرے پرویز کو پھنسایا...... اسے موت کی سزا ہو گئی میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' سعدیہ بے چاری اس افتاد ناگہانی سے بوکھلا سی گئی اور حملہ آور عورت کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے چہرے کو اس کے تیز نوکیلے ناخنوں سے بچانے لگی۔ کمال بھی ایک لمحے کو بوکھلا سا گیا اور اس عورت کو سعدیہ سے علیحدہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

''تت...... تم بھی اس کے ساتھ تھے...... میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم دونوں کی سازش سے میرے پرویز کو پھانسی کی سزا ملی۔'' وہ عورت سعدیہ کو چھوڑ کر اب کمال کی طرف لپکی، لیکن اس اثناء میں عدالت کے کھلے برآمدے میں موجود چند لوگوں نے مشتعل فریدہ کو پکڑ لیا۔ اس کا ہذیان پھر بھی جاری رہا۔ سعدیہ خود کو اس کا مجرم تصور

کرنے لگی۔ اس کا دل دکھ کے شدید احساس سے بھر آیا۔ وہ چاہتی تھی کہ فریدہ کے پاس جائے...... لیکن ساتھ کھڑے کمال نے اسے فریدہ کے قریب جانے سے روک دیا اور اسے لئے باہر اپنی کار میں آبیٹھا سعدیہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"ٹیک اِٹ ایزی...... ہوتا ہے یہ...... دل پر نہ لو اتنا......" کمال گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سعدیہ سے ازراہ تشفی بولا۔

"نہیں کمال! یہ سب نہیں ہونا چاہئے تھا، یہ میری زندگی موت کا سوال تھا...... واثق کو کسی صورت بھی بری نہیں ہونا چاہئے تھا۔" سعدیہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ اس نے اپنا سیاہ گاؤن اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل کار کی پچھلی سیٹ پر پھینک دی تھی۔ کمال خاموش رہا...... مقدمہ ہارنے کا اسے بہت دکھ تھا۔ وہ اس مقدم کی نوعیت سے بہ خوبی آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ یہ مقدمہ بالخصوص سعدیہ کے ماضی کے حوالے سے کتنا اہم تھا۔ بلاشبہ اس کیس کا جیتنا خود سعدیہ کے لئے اپنے دیرینہ مشن کی تکمیل کے لئے پہلی سیڑھی کی حیثیت رکھتا تھا...... جس کی خاطر اس نے قانون اور انصاف کا لبادہ اوڑھا تھا...... مگر بدقسمتی سے وہ پہلی سیڑھی سے ہی دھڑام سے آگری تھی۔ کمال بھی اس کے ساتھ پورا پورا شریک عزم تھا اسی لئے اسے بھی اس کیس کے ہارنے کا اتنا ہی ملال تھا، جتنا کہ سعدیہ کو، وہ دونوں اس قدر رنجیدہ خاطر اور بددل ہوئے تھے کہ وہاں ایک پل بھی کھڑے رہنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ وہ ایک طرف متفکر اور نادم سے کھڑے انسپکٹر ثناء اللہ عباسی سے بھی نہ مل پائے اور سیدھا اپنے چیمبر میں آ گئے۔

❁❁❁

دور ساحل سمندر کی طرف گہرے پانیوں کی اٹھلاتی ہوئی موجیں پورے چاند کو چومنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھیں۔ رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور سحر انگیز چاندنی میں متلاطم سمندر سے آنے والی مست خرام ہوا ساحلی مرطوب فضا کو خوشگوار بنا رہی تھی، ریتیلے ساحل پر چند جوڑے دنیا کی نفسا نفسی کو اپنے تھکے ماندے ذہنوں سے آزاد کرنے اور سرور آگیں لمحات کشید کرنے کی خاطر چہل قدمی میں مصروف تھے...... لیکن اس سے وہاں آنے والے کچھ ایسے بھی افراد تھے جو اس سحر انگیز دل کش نظارے سے بجائے لطف اندوز ہونے کے اپنے اندر کے کرب اور غم دروں کو مزید گہرا کر کے ایک



عجیب سا لذت درد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سعدیہ بھی ایک جانب ساحلی پتھروں پر سوگوار سی بیٹھی انہی افراد کی تفسیر پیش کر رہی تھی...... بہ ظاہر اس کی نمناک آنکھیں سمندر کے آخری متلاطم سرے کے سحر انگیز منظر پر مرکوز تھیں لیکن درحقیقت اس کی توجہ اپنے اندر کے درونہاں پر مرکوز تھیں۔ خوشگوار ساحلی ہواؤں کے نرم جھونکے اس کے شانوں پر بکھرے گیسوؤں کو بڑے والہانہ انداز میں اپنے دوش پر اُڑا رہے تھے۔ گہری کبیدگی اور اداس سے معمور اس کا ملیح چہرہ دلکش اور سوگوار حسن کا عجب امتزاج پیش کر رہا تھا، قانون، عدالت کٹہرا اور انصاف کے ترازو کے دونوں پلڑے ایک بہت بڑی قوت و حیثیت کے حامل ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنی ماں کو انصاف دلانے کی خاطر انہی قوتوں کا سہارا لینا چاہا اور دن رات ایک کر کے خود کو اس مضبوط ستون کی آڑ میں امید بہار کی صورت چھپائے رکھا، مگر آج اعتماد و آورش کا وہ ستون ڈھے گیا تھا اور وہ خود کو اس کے کھنڈر تلے دبا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ مقدمہ ہارنے کے بعد اس پر اس تلخ حقیقت کا بھی انکشاف ہوا تھا کہ اصل طاقت پیسے ہی کو حاصل ہے، جس کے بل بوتے پر سب کچھ خریدا جا سکتا تھا، قانون کو بھی۔

"تو کیا میری ساری محنت آکارت اور مسافت رائیگاں گئی۔" اس نے کبیدہ خاطر ہو کر سوچا۔ "کیا میں نے ایک سراب کے پیچھے دوڑتے ہوئے اپنی آدھی عمر بِتا دی؟ میری محنت، میری ماں کی امیدیں، میری حصول علم کے لئے کی گئیں ان تھک کاوشوں کا محض یہی ثمر ملا مجھے۔" ابھی وہ انہی تلخ سوچوں کی گردان کر رہی تھی کہ معاً اسے یوں لگا جیسے کسی نے آہستگی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہو...... وہ اپنے خیالات سے یکدم چونکی اور سر اٹھا کر جیسے اپنے عقب میں اوپر کی سمت دیکھا تو ٹھٹھک گئی۔ رانا الطاف ایڈووکیٹ بڑی شفیق نظروں سے سعدیہ کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر پر شفقت مسکراہٹ تھی۔ گرے کلر کے سفاری سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح پُروقار دکھائی دے رہے تھے۔ سعدیہ کے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں اچانک اس کے پاس انکل رانا سے اس طرح ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ سعدیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹی مجھے بہت دکھ ہوا۔" سعدیہ کے کھڑے ہوتے ہی رانا الطاف اسے مخاطب کر کے بولے۔ سعدیہ نے جواباً پہلے ادب سے سلام کیا اور سر جھکا کر خاموش ہو رہی۔ رانا

الطاف نے اپنی بات جاری رکھی اور دوبارہ مدھم لہجے میں بولے۔ ''لیکن مجھے تمہارے کیس ہارنے کا قطعاً دکھ نہیں یہ تو ایک میدان ہے...... ہار جیت کا...... افسوس مجھے تمہاری حالت دیکھ کر ہو رہا ہے...... اس طرح بھی بھلا دل ہارتے ہیں۔ میں تو تمہیں بڑا حوصلہ مند اور باہمت سمجھا کرتا تھا...... لیکن تم......'' وہ لمحہ بھر رک کے سعدیہ کی جانب دیکھا وہ آب دیدہ ہوئی جا رہی تھی۔ تب انہوں نے اس کے سر پر ازراہ شفقت ہاتھ رکھا اور ملائمت سے بولے۔ ''اچھا چھوڑو! آؤ ذرا آگے چلتے ہیں آج اپنی بنی کے ساتھ ساحل سمندر پر گھومتے ہیں۔'' پھر انہوں نے سعدیہ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لئے ساحلی ریت پر آ گئے۔ جدھر بے کراں سمندر سے آتی ہوئی موجیں ساحلی ریت کو چوم کر واپس جا رہی تھیں۔ سعدیہ نے رانا الطاف کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے مہربان چہرے پر اس کو ایک پر شفیق باپ کے چہرے کا عکس محسوس ہوا۔ ایسے میں سعدیہ کو اپنا کرب کچھ کم ہوتا محسوس ہونے لگا۔

''بیٹی میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کرنے آیا...... کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں نصیحت کی ضرورت نہیں۔ تم خود سمجھدار ہو چلو آؤ واپس چلتے ہیں...... وہاں کار میں وہ نالائق بھی موجود ہے تمہارا منتظر......'' رانا الطاف نے آخر میں بڑی بردباری سے کہا اور سعدیہ نے پھر اپنے آپ کو ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ وہ ساحلی پتھروں سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے...... یہاں رانا الطاف کی اپنی سیاہ رنگ کی ہنڈا کار موجود تھی۔ کمال بھی سینے پر ہاتھ باندھے کار سے ٹکا کھڑا، انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ خفا خفا سا نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا سعدیہ جیسے ہی رانا الطاف کے ساتھ چلتی ہوئی قریب پہنچی، وہ اپنی خفگی پر قابو نہ پا سکا اور ناراضگی سے قدرے سخت لہجے میں مخاطب ہوا...... ''کیوں محترمہ! اتنی رات گئے اور وہ بھی تن تنہا کسی کو بتائے بغیر یہاں آنے کا مطلب...... پتہ ہے کتنا ڈھونڈا ہے...... ہم نے تمہیں......'' وہ رکا سعدیہ نے بدستور خاموشی سے اپنا سر جھکایا ہوا تھا۔ ''کیا خودکشی کرنے آئی تھیں آپ یہاں......'' کمال مزید لتے لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ڈیڈی رانا الطاف نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ سعدیہ کو کمال کی ڈانٹ اور لہجے کی سختی میں نفرت نہیں بلکہ ایک قسم کی اپنائیت اور انس محسوس ہوا۔ کمال نے سعدیہ کا بدستور خاموش اور اداس چہرہ دیکھتے ہوئے موضوع بدلا اور اس بار قدرے



م لہجے میں بولا۔ ''حیرت ہے سعدیہ! تم جیسی با حوصلہ اور ہمت والی لڑکی اتنی سی بات و دل پر بھی لے سکتی ہے مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔''

''او کم آن بیٹا! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے عزم میں برابر کے شریک ہی اس پہلی ناکامی کو اپنے دیرینہ اور اہم مشن کی طرف بڑھتا ہوا پہلا اور کامیاب قدم بھو۔ ابھی سے تم نے ہمت ہار دی تو آگے کس طرح حالات کا مقابلہ کرو گی۔'' رانا طاف نے پیار سے سعدیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ سعدیہ کو احساس ہونے لگا کہ اس نے اقعی ایک ذرا سی ناکامی پر خود کو خواہ مخواہ ہی پریشان کر لیا تھا۔ ایسی پینترے بازیاں تو لتی ہی ہیں۔ اس پیشے میں قانون واقعی اندھا ہوتا ہے۔ جو دیکھتا نہیں صرف سنتا ہے ہر جو سنتا ہے اس کے تحت اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا کرتا ہے۔ اس میں پیسے کا اتنا کھیل ہیں جتنا دلائل و ثبوت اور کامیاب جرح کا کمال ہے...... اسے انہی تینوں اہم نکات کو ئندہ زیادہ سے زیادہ مد نگاہ رکھنا ہوگا...... اسے خود پر شک بھی محسوس ہونے لگا کہ مال جیسا سچا دوست اور رانا الطاف جیسے مہربان اور پدرانہ شفقت رکھنے والے لوگ سے میسر تھے۔ تب وہ ہمت کر کے اور اپنی رقت پر قابو پاتے ہوئے ایک نظر تشکر کی التے ہوئے دھیرے سے ازراہ ندامت بولی۔ ''سوری انکل! میں خوش قسمت ہوں کہ جھے آپ سب کا ساتھ حاصل ہے۔ واقعی میں نے ایک ذرا سی بات کو بلاوجہ ہی اپنے ہن پر سوار کر لیا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا میں نئے سرے سے محنت کروں گی اور کامیابی حاصل کر کے رہوں گی۔''

''دیٹس آ نائس گرل...... یہ ہوئی نا بات...... شاباش بیٹا! مجھے تم پر یہی امید تھی۔'' رانا لطاف سعدیہ کی بات پر خوش ہوتے ہوئے بولے اور پھر سعدیہ کے شانے کو ہولے سے تھپک کر کہا۔ ''دیکھو بیٹی! تمہاری محنت کے ساتھ میری بھی محنت شامل ہے۔ بھلا یں کس طرح یہ چاہوں گا کہ میری محنت بھی ضائع جائے...... میں اب تمہیں اس کیس کو دوبارہ لڑنے کے لئے پوری طرح تیار کراؤں گا۔'' رانا الطاف نے کہا اور پھر وہ سب لوگ مسکراتے ہوئے کار میں سوار ہو گئے۔

❁❁❁

وکیل سعدیہ سعید کو اب اپنے کیس کے ہارنے کا اتنا دکھ نہ تھا جتنا اس بات کا اسے

صدمہ ہو رہا تھا کہ پرویز کو پھانسی کی سزا ہو گئی تھی۔ بلاشبہ وہ سزا کا مستحق تھا اور اس نے خورشید احمد کا بے گناہ قتل کیا تھا۔ مگر بہر طور سعدیہ جانتی تھی کہ اس سے یہ قتل کروایا گیا تھا اور اصل مجرم واثق علی ہی تھا...... پرویز کی بہر حال موت جیسی کڑی سزا کے حق میں نہ تھی...... اس کی نظروں کے سامنے بار بار پرویز کی بیوی فریدہ اور تینوں چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ اس کی بوڑھی ماں کے غم ناک چہرے رقصاں ہو رہے تھے۔

تاہم اس نے دل میں تہیہ کیا کہ کچھ بھی ہو، پرویز کی سزا میں تخفیف کروانے کی کوشش ضرور کرے گی اور موت کی سزا کو عمر قید میں بدلنے کی سعی کرے گی اور واثق علی کے خلاف نئے سرے سے جال بُنے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے اس نے پرویز کی طرف سے اس کی بیوی فریدہ کو راضی اور تیار کیا کہ وہ فوری طور پر ہائیکورٹ میں اپنے شوہر پرویز کی سزائے موت کے خلاف اپیل دائر کرے اور ساتھ ہی معافی کی درخواست بھی۔ یہ ایک مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا اول تو سعدیہ کے لئے شروع شروع میں اس سلسلے میں فریدہ سے ملنا ہی خاصا دشوار لگا تھا کیونکہ فریدہ تو اس کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی......

جب سعدیہ فریدہ کو سمجھانے اس کے گھر گئی تو اس کے ہمراہ کمال بھی تھا...... دونوں نے بالآخر فریدہ کو اچھی طرح سمجھایا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ہم اس کے شوہر پرویز کی سزا میں تخفیف کے سلسلے میں اس کی پوری پوری مدد کریں گے اور آخری وقت تک کیس لڑیں گے...... انہوں نے ثناء اللہ کی خواہش دیرینہ کے مطابق اسے بھی اپنی "جنگ" میں شامل کرتے ہوئے باقاعدہ ایک گروپ تشکیل دیا۔ جس کا نام انہوں نے فائٹ فار فریڈم رکھا۔ جس کا مقصد نہ صرف پرویز کی سزا میں تخفیف تھا بلکہ اصل قاتل واثق علی کو قرار واقعی سزا دلانے کا عزم بھی تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے اگر اصل مجرم واثق علی پر قتل کا جرم ثابت ہو جائے تو نہ صرف پرویز کی سزائے موت بدل کر عمر قید میں تبدیل ہو جائے گی بلکہ مزید اس کی سزا میں تخفیف بھی ممکن ہو جائے گی۔" انسپکٹر ثناء اللہ نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا وہ سب لوگ اس وقت چیمبر کے آراستہ آفس میں موجود تھے، جہاں کمال اور سعدیہ کے علاوہ ایڈووکیٹ رانا الطاف بھی اپنی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر براجمان تھے۔ انہوں نے انسپکٹر ثناء اللہ کی بات سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا جبکہ کمال نے



یا کہا۔ "لیکن اس سے پہلے ہمارا ہدف یہی ہونا چاہئے کہ پرویز کی سزائے موت عمر د میں تبدیل ہو۔"

پھر وہ قدرے ملتجی لہجے میں اپنے ڈیڈی رانا الطاف سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ڈیڈی راخیال ہے کہ پرویز کی اپیل کے سلسلے میں آپ بھی ہائی کورٹ میں اس کا مقدمہ یں اور اس کی اپیل منظور کروائیں۔"

کمال کی بات پر وکیل سعدیہ نے بھی پر زور لہجے میں رانا الطاف سے کہا۔ "انکل! مال بالکل درست کہہ رہا ہے۔ میری بھی آپ سے یہی درخواست ہے کہ پہلے کم از کم ویز کی سزا میں فوری طور پر تخفیف ہو تا کہ بعد میں ہم اطمینان سے باقی معاملات نمٹا لیں...... کیونکہ یہ نہ صرف اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے بلکہ وہ اپنے چھوٹے ندان کا بھی واحد کفیل ہے ورنہ میں ساری عمر خود کو مجرم سمجھتی رہوں گی۔"

ایڈووکیٹ رانا الطاف نے بہ غور ان کی باتیں سنیں۔ پھر لمحہ بھر کے بعد دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "ٹھیک ہے پھر تم لوگ اس کی بیوی سے وکالت نامہ اور ر کاغذات پر سائن کروالو میں کچھ کوشش کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی بات پر مال اور سعدیہ کے چہرے کھل اٹھے اور انسپکٹر ثناء اللہ بھی مطمئن سا نظر آنے لگا۔

❁❁❁

آمنہ بیگم حسب معمول اپنی ڈائری سنبھالے ماضی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"میرے سامنے تقریباً پانچ چھ افراد کھڑے میری جانب خونخوار نظروں سے گھور ہے تھے۔ ان میں بدذات بھورل بھی شامل تھا۔ باقی سب اس کے ساتھی معلوم ہو ہے تھے۔ وہ سب اپنے بشروں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ میں ان ب لوگوں کو یوں اچانک آمنے سامنے دیکھ کر دہشت زدہ سی ہو گئی۔

تنے میں بھورل مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا میری جانب بڑھا اور غراتے ے بولا۔

"چل لڑکی...... ہمارے ساتھ...... نکل یہاں سے۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" میں دہشت زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

ل خاصا عجلت میں دکھائی دے رہا تھا بلکہ وہ تھوڑا زخمی سا بھی نظر آ رہا تھا۔ میرے

انکار پر اس نے شعلہ بار نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور ایک دم آگے بڑھ کر مجھے انتہائی بے دردی کے ساتھ کسی بوری کی طرح کندھے پر لاد لیا اور باہر نکل گیا۔ میں غصے اور شرم کے مارے گھٹ کر رہ گئی اور اس پر مکے چلانے لگی اور ساتھ ہی شور بھی مچا دیا۔ مگر وہ اس کی پرواہ کئے بغیر اپنے غنڈوں سمیت اس ویران شکستہ مکان سے باہر نکل آیا۔ سامنے مدھم سی روشنی میں ایک جیپ موجود تھی۔ چہار اطراف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے مجھے جیپ کی پچھلی سیٹ پر پھینکا تو فوراً اس کے ساتھیوں نے مجھے قابو کر کے اپنی جگہ پر قید سا کر دیا۔ مجھے پریشانی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر یوں عجلت میں مجھے کدھر لے جایا جا رہا ہے۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں اکیلی بھلا کب تک مزاحم ہو سکتی تھی اس لئے چپ ہو کر خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ ادھر جیسے ہی جیپ نے ذرا رفتار پکڑی تو بھورل کے ساتھیوں نے جو بار بار جیپ کے عقب میں گھبرائی ہوئی نظریں ڈال رہے تھے چلا کر بھورل سے بولے۔

''استاد! گاڑی کی رفتار بڑھا دو اور لائٹ بھی بجھا دو...... لگتا ہے پولیس ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آ پہنچی ہے۔''

جیپ بھورل ہی چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھی کے منہ سے پولیس کا سن کر میرے دل کو طمانیت سی ہوئی۔ میں خوش تھی کہ پولیس ہمارے تعاقب میں تھی۔ ساتھ ہی مجھے مسرت آمیز حیرت بھی ہوئی کہ پولیس کو بھلا کس طرح اس جگہ کا علم ہو گیا تھا...... کیا وہ مجھے ہی تلاش کرتی ہوئی اس ویرانے تک آ پہنچی تھی۔

پھر اچانک میرے ذہن میں یہ خوش آفریں خیال در آیا کہ ہو سکتا ہے میری پراسرار گمشدگی کے مدنظر آنٹی شمشاد اور ان کے مہربان شوہر محمد اسماعیل میری تلاش کے سلسلے میں مصروف جستجو ہو گئے ہوں اور کوئی بعید نہیں کہ انہی کے ایماء پر پولیس بھی حرکت میں آ گئی ہو۔ میرا خیال چند لمحوں بعد ہی درست ثابت ہوا جب بھورل جیپ چلانے کے دوران آنٹی شمشاد وغیرہ کے لئے نازیبا الفاظ اختیار کرتے ہوئے غصے سے بڑبڑایا۔

''یہ سارا کیا کرایا اس بڑی استانی کا ہے...... اسے بھی دیکھ لوں گا اچھی طرح میں۔''

''استاد! گاڑی تیز چلاؤ ابھی تو پہلے اس مصیبت سے چھٹکارا پاؤ۔'' جواباً اسے ایک



ساتھی نے گھبرائی ہوئی آواز میں ٹوکا۔

میں نے دیکھا وہ سب لوگ خاصے بوکھلائے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پولیس سر پر پہنچنے والی تھی اور میرا یہ خیال درست تھا کیونکہ پولیس کے سائرنوں حتیٰ کہ ان کی تیز رفتار گاڑیوں کی بھی آوازیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔

جانے کیوں اب میرا دل بجائے خوش ہونے کے گھبرانے لگا تھا۔ مجھے کسی ممکنہ بڑے پولیس مقابلے نے بے چین کر دیا تھا...... کیونکہ یہ کمبخت لوگ مجھے گن پوائنٹ پر بھی رکھ سکتے تھے۔ پھر معاً عقب سے فائرنگ کی آواز گونجی ...... جیپ کی رفتار مزید تیز ہو گئی اور بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ جیپ کی لائٹیں گل تھیں اور غالباً کسی چٹیل میدان پر دوڑی جا رہی تھی۔ پولیس کی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی اب ہم پر پڑنے لگی تھیں۔ بھورل اور اس کے ساتھی بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے...... پھر ایک مقام پر اچانک جیپ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ اچھلی اور میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود ہوا میں اڑ گیا ہو...... اس کے بعد بھربھری سی زمین پر دور تک قلابازی کھاتی چلی گئی ہو اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو خود کو ایک نرم بستر پر پایا۔ میرے اوپر آنٹی شمشاد جھکی ہوئی تھیں۔ وہ خاصی پریشان متفکر نظر آ رہی تھیں مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں اور پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں میرا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا اور میں ہلنے سے بھی قاصر تھی۔ یہی نہیں مجھے اپنے سر اور ہاتھوں پیروں پر بینڈج بھی بندھی ہوئی محسوس ہوئی میں نے بولنے کے لئے لب کھولے اور پانی مانگنا چاہا، لیکن جیسے میرے حلق میں تھوہر اگ آیا تھا...... شدید چبھن سی محسوس ہو رہی تھی اور نقاہت اس پر سوا تھی۔ لیکن پھر شاید آنٹی شمشاد نے میرا مزاج جان لیا تھا اور فوراً قریب بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے کانچ کے جگ سے پانی کا گلاس بھر کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پھر آنٹی نے شفیق لہجے میں ملائمت سے کہا۔ ''بیٹی آمنہ! ٹھیک تو ہو نا...... ڈاکٹر صاحب تمہیں دیکھ کر گئے ہیں خدا کا شکر ہے تمہیں کوئی خاص چوٹیں نہیں آئیں تم اب بالکل محفوظ ہو یہاں۔'' اس کے بعد آنٹی نے مجھے دھیرے دھیرے سب کچھ بتا دیا کہ میرے اچانک غائب ہوتے ہی بابا کو میرے اغواء کا شک ہوا اور وہ دوڑتے ہوئے آنٹی شمشاد اور انکل محمد اسماعیل کے

پاس آئے اور تب ان سب نے پولیس کو میرے اغواء کی خبر دیتے ہوئے بھورل خان پر یقینی شک کا اظہار کیا۔ متعلقہ تھانے کا پولیس انسپکٹر آنٹی کا جاننے والا تھا، جس کی بچی ان کے اسکول میں پڑھتی تھی اور ہر سال فرسٹ آتی تھی۔ بہر طور قصہ کوتاہ مذکورہ انسپکٹر صاحب نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھورل کو جا لیا اور یوں اس کا تعاقب کرتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے۔ جیپ الٹنے کی وجہ سے وہ خود اور اس کا ساتھی خاصے زخمی ہو گئے تھے اور سب کے سب ہی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان اور شکر تھا کہ میں جیپ الٹنے سے قبل ہی گر چکی تھی اور مجھے کوئی خاص چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ اتنے میں انکل اسماعیل اور بابا بھی کمرے میں آ گئے اور اب میں تھوڑا تھوڑا بات کرنے کے قابل بھی ہو گئی تھی۔ میری بچی سعدیہ مجھ سے لپٹ کر باقاعدہ ہچکیاں لے کر رو پڑی۔ میری آنکھیں بے اختیار اس معصوم کو روتا دیکھ کر پرنم ہو گئیں۔
قصہ کوتاہ اب میں آنٹی کے پاس ہی رہنے لگی اور بابا باقاعدگی سے روزانہ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ مجھے ان کی فکر رہنے لگی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس طرح کھاتے پیتے ہوں گے کیونکہ سدھوری کا جانا اور میرے ادھر منتقل ہونے کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔
میں جب چند دنوں میں ذرا بھلی چنگی ہو گئی تو اسکول بھی سنبھالنے لگی، لہٰذا انہی دنوں میں نے آنٹی شمشاد سے بابا کی تنہائی کا عذر پیش کرتے ہوئے واپس گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ قدرے حیرت زدہ ہو کر بولیں۔

"ارے بیٹی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہارے سر پر اتنی بڑی قیامت گزرتے گزرتے رہ گئی اور اب بھی تم واپس اسی گھر جانا چاہتی ہو جہاں تم بالکل غیر محفوظ ہو۔"

ان کی بات درست تھی لیکن میں نے کہا۔ "مگر آنٹی! بھورل تو اب گرفتار ہو چکا ہے، اب بھلا کس بات کا ڈر۔"

"بیٹی! یہ دنیا بھورل جیسے لوگوں سے خالی نہیں۔"

"لیکن بابا؟" میں نے ان کی بات پر کہنا چاہا تو وہ فوراً بولیں۔ "تم ان کی فکر نہ کرو تمہارے انکل انہیں سمجھا دیں گے اور وہ بھی یہیں تمہارے پاس رہیں گے۔"

"نہیں آنٹی! آپ پر بوجھ......"

انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "بس بس...... بہت تراش لئے تم نے بہانے یہ



کوئی بات نہیں انہیں ہم چوکیداری پر رکھ لیں گے اور تم خود اسکول سنبھالو گی...... میں تمہارا عہدہ بڑھا دوں گی اور تم بچوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ اسکول کا نظام بھی سنبھال لو گی۔ میں اب تھک گئی ہوں۔" پھر آخر میں وہ محبت سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے قدرے رسان سے بولیں۔ "کیا تم میرا بوجھ اس طرح کم نہیں کرو گی......" اور میں نے جواباً اپنا سر جھکا لیا جو میری رضامندی کو ظاہر کر رہا تھا اور آنٹی شمشاد نے خوش ہو کر مجھے اپنے گلے لگا لیا۔

ادھر میری "ہاں" کرنے کی دیر تھی کہ فوراً میرا کمرہ سیٹ کرا دیا گیا اس کے بعد ان کے شوہر نے بھی حیرت انگیز طور پر نجانے کس طرح بابا کو منا لیا۔ انہوں نے نہ صرف اسکول میں چوکیداری سنبھالی۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہی رہنے لگے۔ یوں وہ صبح میں پانی کا ٹینکر بھی چلاتے اور سکول کی چوکیداری سنبھالتے۔ انہیں نیچے ہی رہنے کے لئے کمرہ دے دیا گیا تھا وہ اب آنٹی کے گھر میں بھی پانی ڈالا کرتے تھے۔ بذات خود میں اب یہ چاہتی تھی کہ بابا اب پانی کا ٹینکر چلانا چھوڑ دیں، کیونکہ اب ان کی عمر اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ پانی کا بھاری بھرکم ٹینکر چلائیں۔

آنٹی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بابا سے یہ بات کہہ کر ان سے مستقل طور پر ٹینکر چھڑوا کر اسکول کے بچوں کی وین کا ڈرائیور بنا دیں گی۔ بہر طور وقت اب بغیر کسی ڈر اور خوف کے گزرنے لگا۔ پھر انہی دنوں میں محسوس کرنے لگی آنٹی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر پھر اچانک چپ سی ہو جاتی تھیں۔ تاہم ان کے اشاروں کنایوں کو میں محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ میری توجہ بار بار باتوں ہی باتوں میں کسی اہم بات پر دلانا چاہ رہی تھیں...... بالآخر ایک دن انہوں نے جیسے ہمت کر کے وہ "اہم بات" کر ہی ڈالی۔ رات کا وقت تھا...... میں سعدیہ کو ہوم ورک کروانے کے بعد خود ہی سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ آنٹی میرے لئے چائے بنا کر لے آئیں۔ اگلے دن اتوار تھا اور اسکول کی چھٹی تھی۔

"بیٹی آمنہ! کیا تم ہفتے کو بھی جلدی لیٹ جاتی ہو۔" انہوں نے چائے کا کپ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ میں ان کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی اور "تھینک یو" کہتے ہوئے انہیں مسکرا کر بیٹھنے کو کہا۔ پھر تھوڑی دیر تک وہ سکول کے انتظام کے بارے میں گفتگو

کرتے کرتے اچانک میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے عجیب انداز سے بولیں۔
''آمنہ! میں تم سے ایک بات کہوں تم برا تو نہیں مانو گی؟''

میں ان کی بات پر ذرا چونک سی گئی پھر مسکرا کر ان سے کہا۔ ''نہیں آنٹی! میں بھلا آپ کی بات کا کیوں برا مانوں گی۔ آپ میری ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ضرور اس بات میں میری کوئی بھلائی ہی آپ نے دیکھی ہو گی۔''

''شاباش بیٹا! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔'' وہ یک دم خوش ہو کر اور چند ثانیے کے بعد دوبارہ بولیں۔ ''بیٹی! مجھے تمہاری بات پر واقعی دلی طور پر خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے ماں جیسا مان دیا اور جو حقیقت بھی ہے کہ میری اپنی تو کوئی اولاد نہیں لہٰذا میں تمہیں ہی اپنی اولاد سمجھتی ہوں اور میں نہیں چاہوں گی کہ تم اس پہاڑ جیسی زندگی کا صحرا تنہا پار کرو۔ تمہیں بہر حال ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ آمنہ بیٹی! تمہاری عمر ہی کیا ہے ایک ننھی منی بچی کی ماں ہی تو ہو میں چاہتی ہوں تم اپنا گھر بسا لو۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں اور میرا چہرہ تکنے لگیں۔

ان کی بات سن کر میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی اور میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا اور اپنے اندر کڑواہٹ سی گھلتی ہوئی محسوس ہوئی اس کی وجہ آنٹی کی وہ بات تھی جس نے میرے اندر میرے تلخ ماضی کی سوئی ہوئی ان کٹھور یادوں کو ایک دم بیدار کر ڈالا تھا جنہیں میں فراموش کر چکی تھی۔ مجھے خاموش پا کر آنٹی ملائمت سے بولیں۔ ''بیٹی! میری بات بری لگی۔''

''نن...... نہیں...... لیکن آنٹی! میں ایک تلخ تجربے کے بعد دوبارہ غم کھانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ میں نے اب اپنی زندگی اپنی بچی کے لئے وقف کر دی ہے۔'' میں نے فوراً کہا تو آنٹی جیسے مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹی! سب لوگ ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ میرے شوہر یعنی تمہارے انکل اسماعیل کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ ہماری شادی کو اتنا طویل عرصہ بیت جانے کے بعد بھی جب ہمارے گلشن میں پھول نہیں کھلا تو میں نے آخر ایک دن برملا اس بات کا اظہار کر ڈالا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں، ہو سکتا ہے دوسری بیوی سے انہیں اولاد جیسی خوشی نصیب ہو جائے...... مگر نہ صرف انہوں نے انکار کر دیا بلکہ مجھے بھی آئندہ کبھی ایسی بات نہ کہنے کی تنبیہ کر ڈالی۔ حالانکہ وہ



ایک پرائیویٹ فرم میں اچھے عہدے پر فائز تھے...... جبکہ میں ایک مکمل طور پر گھریلو عورت تھی۔ یہ اسکول تو میں نے اسماعیل ہی کے مشورے پر خود کو مصروف کرنے کے لئے کھولا تھا میری بات سمجھ رہی ہو نا بیٹی آمنہ۔'' انہوں نے آخر میں کہا اور مجھ پر نگاہیں جما دیں۔ میں ان کی بات سمجھ سکتی تھی لہٰذا خاموش رہی۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے تو اپنے دل و دماغ سے دوبارہ گھر بسانے کا خیال ہی اکھاڑ پھینکا تھا۔ تاہم ان کے اصرار پر میں نے کہا۔

''آنٹی درحقیقت میں نے اپنے دل سے اس قسم کی سوچ کو ہی نکال پھینکا ہے۔ اب دوبارہ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''تمہیں اب سوچنا چاہئے۔ اپنے لئے نہیں تو اپنی بچی سعدیہ کے لئے۔'' آنٹی بولیں اور اضافہ کیا۔ ''ابھی تمہاری بچی چھوٹی ہے اگر تم نے اپنا خیال نہیں بدلا تو آگے چل کر تمہاری بچی کے لئے نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں...... ذرا سوچو، اس بے چاری کا ننھا اور معصوم ذہن تو اب بھی یہ محسوس کرتا ہو گا۔ جب وہ اپنی ہم جماعتوں کو ان کے باپ کی انگلیاں پکڑ کر اسکول جاتے دیکھا کرتی ہو گی...... تو کیا اس کے ننھے ذہن میں یہ سوال نہیں ابھرتا ہو گا کہ اس کا باپ کہاں ہے......؟ اس لئے کہتی ہوں آمنہ کہ اس معصوم کے ایسے سوال کرنے سے قبل اسے ایک باپ کی شفقت کا سایہ فراہم کر دو۔ ابھی اس کا کچا ذہن ہے، وہ بآسانی اپنے باپ کا خلاء پر کر لے گی۔''

میں نے ان کی صراحت بھری گفتگو اس بار ذرا غور سے سنی اور تب اپنے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی...... ''آنٹی! یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ شخص اسے حقیقی باپ کا پیار دے سکے۔''

''یہ بات مجھے تمہاری اچھی لگی۔ کم از کم تم نے اس طرف کچھ غور تو کیا...... دیکھو ہم تمہیں بھلا کسی ایسے ویسے شخص کے ساتھ تھوڑا ہی بیاہ دیں گے۔'' آنٹی نے کہا پھر مزید بولیں۔ ''وہ لڑکا!...... بلکہ لڑکا کیا تمہارے انکل اسماعیل سے چند سال ہی تو چھوٹا ہے۔ اپنے ہی خاندان کا ہے۔ سب سے بڑی بات کہ میری مرحومہ بہن کا بیٹا ہے۔ احمد سعید نام ہے اس کا...... مجھے یقین ہے تم اس کے ساتھ بہت سکھی اور خوش رہو گی۔''

آنٹی نے اپنی بات ختم کی اور میں کسی عجیب سوچ میں گم ہو گئی۔

⁂

معصوم سسی پر ظلم...... پھر اس کی خودکشی، اس کے بعد اس سے متعلق طرح طرح کی باتیں چوحدہ کی سب سے بڑی کچہری (جرگہ) کا اہم رکن اور گوٹھ کی معزز شخصیت حاجی صاحب کے جانبدارانہ اور کٹھور رویے نے بے چارے دادو کو اس قدر بددل کر دیا تھا کہ اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی گوٹھ میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ماما وسایا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ وہ اس کے ماں باپ کو بتا دے۔

دادو کا اب ارادہ یہی تھا کہ وہ اب کراچی شہر جائے۔ ڈاکٹر یوسف کے پاس...... اس کلینک میں مستقل نوکری کرے اور صبح کے لئے بھی جلد سے جلد کوئی ڈھنگ کی نوکری دیکھ کر فی الفور ایک چھوٹا سا کرائے پر مکان لینے کے بعد وہ واپس آ کر گوٹھ ماما وسایا سمیت اپنے بوڑھے والدین کو بھی یہاں سے ہمیشہ کے لئے لے جائے۔ دادو، ماما وسایا کو اپنا عندیہ دینے کے بعد وہاں ذرا بھی نہ رکا اور فوری شہر کا قصد کیا۔ جب کراچی شہر جانے والی ایک عام سی مسافر بس میں سوار ہوا تو اس کا دل بہت بجھا بجھا سا اور اداس تھا۔ اسے بہر حال اس بات کا دکھ تھا کہ معصوم سسی ایک روایتی جبر تلے پس چکی تھی۔ اس کا خون ناحق رائیگاں ہی چلا گیا تھا۔

لاری شور مچاتی، کھڑکھڑاتی ہوئی جامشورو پھاٹک کو کراس کرتی ہوئی خاصی رفتار سے اب سپر ہائی وے پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ دادو کی سیٹ کھڑکی کے پاس تھی۔ باہر کے مناظر پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سورج کوئی دم کو نصف النہار پر پہنچنے ہی والا تھا، ایسے میں غمگین سے بیٹھے دادو کو یوں لگا جیسے لاری سے باہر سسی ساتھ ساتھ دوڑی چلی آ رہی ہو۔

دادو کو یوں لگا جیسے سسی کا سوگوار چہرہ کھڑکی کے قریب آ گیا ہو اور تب وہ اسے معصومانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتی محسوس ہوئی۔

"ادا! کیا تو اس کتے زمیندار سے میرا بدلہ نہیں لے گا۔ اپڑی بہن کا بے گناہ خون یونہی جانے دے گا...... بتا...... ہیں...... تیکوں تو میں نے اپڑاں ادا سائیں کہا تھا۔ کیا تو اپڑی بہن کے بے گناہ خون کا سردھان (بدلہ) بھی نہیں لے سکتا۔ بول ادا دادو! کیا میرا سردھان تجھ پر واجب نہیں۔"



پھر اچانک جیسے سسی کا ستا ہوا چہرہ کھڑکی سے غائب ہو گیا۔ مگر دادو کو ایک دم اپنے اندر آندھیاں چلتی محسوس ہونے لگیں اور پورا وجود مثل آتش فشاں دہکنے لگا، پھر ناگاہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور چلا کر بس روکنے کو کہا۔

دادو نے اب شہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا...... بس کے رکتے ہی وہ نیچے اتر آیا...... بس کھڑکھڑاتی شور مچاتی ہوئی آگے روانہ ہو گئی اور دادو...... دور تک ویران سڑک کے کنارے واپسی کی بس کا انتظار کرنے لگا...... اس کے اطراف حد نگاہ تک بنجر ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

⁂

باہر تاریکی میں گرمیوں کے جاتے موسموں کی ہوائیں سسکیاں لے رہی تھیں۔ گوٹھ کے آوارہ کتوں اور گیدڑوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بڑی بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔ اس جھونپڑی نما کچے مکان کے بوسیدہ فرش پر پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ گارے مٹی کی دیوار سے لگے بید مشک کا درخت پر زور ہوا سے جھوم رہا تھا۔ قریب ہی دو جھلنگا سی چارپائیوں پر دادو کے ماں باپ خراٹے لے رہے تھے جبکہ اندر کوٹھڑی نما کمرے میں خستہ سے فرش پر بیٹھا ماما وسایا حسب معمول گڑگڑی جما رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دادو چپ چپ سا بیٹھا ہوا تھا۔ لالٹین کی مدھم سی روشنی میں دونوں کے مبہوت سائے دیوار پر لرزاں بڑے پر اسرار معلوم ہو رہے تھے۔

"دادو! تو نے اچھا کیا جو واپس آ گیا۔" ماما نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے ہولے سے کھانس کر قریب گم صم بیٹھے دادو کو مخاطب کیا۔ دادو نے سر اٹھا کر ماما وسائے کی طرف دیکھا۔ پھر سناٹے دار لہجے میں بولا۔ "ہاں! شاید میں نے اچھا کیا جو شہر جانے کی بجائے واپس گوٹھ لوٹ آیا۔ آخر کو زمیندار اختیار علی کا بھی تو حساب چکتا کرنا ہے ناں۔"

ماما وسایا دادو کے آخری جملوں کے معنی سمجھے بغیر بولا۔ "یہ تو نے صحیح فیصلہ کیا۔ آخر کب تک ہم اس کے قرضے تلے دبے رہیں گے۔ کبھی تو وہ لوٹانے پڑیں گے ہی ناں بھلے سے بیگار ہی کیوں نا کاٹنی پڑے۔ ویسے مجھے یقین ہے زمیندار سائیں تجھے معاف کر دے گا اور دوبارہ نوکری پر بھی رکھ لے گا۔"

اس کی بات سن کر دادو کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی جیسے اس نے ماما وسایا کی کم فہمی کی ہنسی اڑائی ہو...... لیکن پھر اس کا چہرہ درشت سا ہو گیا اور اندر کی تپش یک دم اس کے لہجے میں در آئی۔ "ماما! زمیندار تو اب میرا قرضائی ہو گیا ہے۔



اسے کسی کے خون کا حساب دینا ہوگا۔" دادو نے کہا اور ماما وسایا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سا ارتعاش ابھرا اور چند ثانیے بعد اسی لہجے میں بولا۔

"اڑے چھوکرا تجھے آخر ہوا کیا ہے، اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود تیرے سر پر ابھی تک زمیندار سے جھگڑنے کا بھوت نہیں اترا۔ دیکھ لیا تھا نا...... اس کے آگے آنے کا انجام سارا گوٹھ تیرا بیری ہو گیا تھا۔ بول کسی نے ساتھ دیا تھا تیرا۔" ماما وسایا کہتے کہتے سرخ ہو گیا اور پھر اسے کھانسی نے آلیا...... دادو خجالت سی محسوس کرنے لگا...... حقے کی چلم میں حدت ختم ہونے لگی تھی۔

اگلے دن دادو علی الصباح جاگ گیا۔ چائے اور کھارے بسکٹ کا "ناشتہ" کرنے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر تازہ ہوا کے جھونکوں نے گوٹھ کی کھلی فضا میں خاصی تازگی بکھیری ہوئی تھی۔ دادو ابھی ٹیڑھی میڑھی گلی سے گزر ہی رہا تھا کہ اچانک اسے چند آدمی رائفلوں سمیت اجرک اوڑھے نظر آئے...... ان میں مولا بخش بھی تھا۔

"اڑے چھورا ہمارے ساتھ چلو وڈیرے سائیں نے بلایا ہے تمہیں۔" مولا بخش اپنے ساتھیوں سمیت اس کے قریب آ کر خشمناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ دادو اس کی بات پر ٹھٹھک گیا۔ تاہم اس کی تیز نظریں ان سب کا جائزہ لینے لگیں۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بالآخر ساتھ چلنے کی حامی بھر لی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ زمیندار اختیار علی کی اوطاق میں اس کے سامنے موجود تھا۔ زمیندار موڑھے پر بڑے تمکنت کے ساتھ بیٹھا اسے گھورے جا رہا تھا...... پھر تیز لہجے میں بولا۔

"اڑے چھوکرا! تو نے ہمارے خلاف بہت کچھ کر لیا۔ اب ذرا ہمارے قرضے کی بات کر ڈیڑھ لاکھ کی رقم دے رہا ہے یا......" اس نے دانستہ اپنی بات کی سنسنی خیزی بڑھاتے ہوئے ادھوری چھوڑی تو دادو اس کی معاندانہ گفتگو کا مطلب سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ٹھیک ہے سائیں! پھر ہماری زمین کی قیمت بھی چکا دو، جس پر آپ نے اپنے گھوڑے باندھ رکھے ہیں۔"

دادو کی بات سن کر زمیندار ایک دم چراغ پا ہو گیا اور دھاڑ کر بولا۔ "اڑے کیا

بکواس کرتا ہے کس زمین کی بات کر رہا ہے تُو...... ہیں؟"

"اتنے انجان نہ بنو سائیں۔" دادو نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر مزید بولا۔ "وہ زمین آپ نے میرے پیو (باپ) سے قرضے کے بدلے ہی تو لی تھی۔ جس کی میں بات کر رہا ہوں۔"

"اڑے چھورا! زبان سنبھال کر بات کر ہمارے بھوتار سائیں سے...... کیا سمجھتا ہے تو خود کو......" قریب کھڑے زمیندار کے ایک حواری نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو زمیندار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔

"موگو! تو چپ رہ میں بات کرتا ہوں اس سے۔"

پھر وہ اپنے سرکنڈوں کے جوڑے پشتے والے مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دادو کی طرف غیض آلود نظروں سے گھور کر بولا۔ "وہ زمین تو تیرے پیو نے ہمیں قرضے کے سود کے عوض دی تھی۔ جا پوچھ لے جا کر اس سے۔"

دادو اس کی بات سن کر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "واہ سائیں! آپ نے ہماری تین جریب (ڈیڑھ ایکڑ) زمین سود پر کس طرح رکھ لی؟ بابا نے تو صرف پچیس ہزار روپے کا قرض لیا تھا اور اس وقت آپ کا سود صرف دو ہزار سے بھی کم کا چڑھا تھا...... جبکہ اس زمین کی قیمت اسی نوے ہزار سے بھی زیادہ کی بنتی ہے۔ اس حساب سے تو ہمارے پیسے آپ پر نکلتے ہیں الٹا......" دادو کی صراحت بھری گفتگو پر زمیندار پہلے تو چند لمحے اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک قہقہہ لگا کر بولا...... "لگتا ہے شہر میں تو نے خاصے سیانے لوگوں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے، لیکن یاد رکھ سیانے کوے کے پر کاٹنا بھی ہم جانتے ہیں۔ کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ تیرے پیو نے ہمیں کوئی زمین بھی دی تھی...... بول کون سے کاغذوں میں اس کی لکھت پڑھت ہوئی تھی۔"

"سارا گوٹھ جانتا ہے کہ وہ زمین میرے بابا کی تھی۔ وہ سب گواہی دیں گے اس بات کی......" دادو نے ترنت سے کہا تو زمیندار استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے اس کی ٹھوڑی کو اپنی ایک انگلی سے اوپر اٹھا کر مکاری سے بولا۔

"تو جا پھر چھورا! لے آ ادھر سارے گوٹھ کو گواہی کے واسطے...... وہ تو پہلے ہی تجھ پر تھوتھو کر رہے ہیں......" اس کی بات پر دادو ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا اور تب اسے اپنی



موجودہ "پوزیشن" کا احساس ہوا...... مگر سپر ڈالنے والا وہ بھی نہ تھا بولا "سائیں! تو آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میرے پیو نے آپ سے قرضہ لیا ہے۔"

"اڑے بابا! ہمارے پاس دستاویزی ثبوت ہے...... پورا کھاتہ ہے، رجسٹر ہے جس پر تیرے پیو کا انگوٹھا لگا ہوا ہے۔"

"ان خود ساختہ کھاتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔" دادو نے کہا لیکن اسے اپنی بات کا پھیکا پن صاف محسوس ہوا۔

"اہمیت تو تجھے تب پتہ چلے گی جب تجھے پولیس گرفتار کرنے آئے گی اور ساتھ ہی سسی کا کیس بھی تجھ پر تھوپ دے گی...... بلکہ میں نے تو سنا ہے کہ موگو (سسی کا باپ) تیرے خلاف پولیس میں رپورٹ کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے...... پر شکر کر کہ میں نے اسے چالاکی سے روک رکھا ہے۔" زمیندار نے کہا اور دادو نے برق رفتاری سے کچھ سوچتے ہوئے ایک منصوبہ بنایا اور فوراً کینچلی بدل کر اپنے چہرے پر مسکینیت سی سجالی اور خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنے سر پر خالی ہاتھ پھیرنے لگا۔

زمیندار تیز مکارانہ نظروں سے دادو کی کیفیت سے کافی محظوظ ہوتا رہا، پھر قدرے نرم لہجے میں دادو کے کاندھے پر ہاتھ دھر کر بولا۔ "دیکھ ڑے چھورا! پھر بھی تجھ پر ترس آتا ہے...... تُو گریب کا بال ہے...... پولیس کے ڈِچے میں پڑ گیا تو ادھ موا ہو جائے گا۔ میں اب بھی تجھے اپڑیں چاکری میں رکھنے پر تیار ہوں...... بول کیا کہتا ہے۔"

زمیندار کے اتنا کہنے کی تھی کہ دادو نے فوراً اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور لجاجت آمیز لہجے میں زمیندار سے بولا۔ "سائیں بھوتار! آپ تو واقعی ہم گریبوں کے محسن اور خیر خواہ ہو۔ یہ میری ہی غلطی تھی جو اپنی اوقات اور حیثیت بھلا بیٹھا تھا۔ مجھے معاف کر دو اور اپنے پیروں میں جگہ دے دو۔"

دادو کا یہ ڈرامہ کامیاب گیا۔ زمیندار نے فوراً اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسے اپنے سامنے چارپائی پر بٹھایا۔ ایک ملازم کو دادو کے لئے ٹھنڈے پانی کا گلاس لانے کے لئے کہا اور جب تک دادو گلاس سے پانی کے گھونٹ بھرتا رہا...... زمیندار اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیتا رہا، پھر جب دادو پانی پی چکا تو زمیندار معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اڑے چھوکرا! ہماری چاکری کرنا چاہتا ہے تو پہلے ہمارے سامنے اپنی وفاداری کا کوئی

نمونہ پیش کرو۔"

"سائیں بھوتار! آپ حکم کرو۔ اپنا سر کاٹ کر اس اوطاق کی دیوار پر لگا دوں۔" داود کی بات سے پھکو پن عیاں تھا۔ لیکن زمیندار اس کی بات سن کر بولا۔ "ٹھیک ہے پھر آج رات کو اوطاق میں آ جانا تجھے آزمائش کے طور پر میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ اگر تو نے میرا کام کر دیا تو نہ صرف تجھے اپنا چاکر خاص بنا لوں گا بلکہ تیرا قرضہ بھی معاف کر دوں گا۔ بولو منظور ہے۔"

"ہا سائیں! برابر...... مجھے منظور ہے تو پھر میں رات کو ادھر حاضر ہو جاؤں گا۔" داود نے کہتے ہوئے جیسے اجازت چاہی۔ زمیندار نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

داود کے جاتے ہی کمدار مولا بخش چہرے پر عجیب تاثرات لئے زمیندار سے بولا۔ "سائیں! آپ اس چھوکرے کو منہ مت لگاؤ۔ آپ بھول گئے اس نے سانپ کی طرح آپ کو ڈسنا چاہا تھا۔" کمدار مولا بخش کی بات میں تشویش نمایاں تھی۔ وہ واقعی خوش نہ تھا کہ اس کا سائیں وڈا ایسے لڑکے کو ایک بار پھر اپنی چاکری میں رکھنا چاہ رہا تھا جو ان کا زبردست مخالف رہ چکا تھا۔ اس کی بات پر زمیندار کی مونچھوں تلے لبوں پر سفاک مسکراہٹ کھیل گئی اور وہ اپنے چہیتے مولا بخش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ارے میرے وفادار مولا بخش! سانپ کو مارنے کے لئے سانپ بھی پالنے پڑ جاتے ہیں کبھی، میں اس کا قصہ پاک کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ میرے بہت رازوں سے واقف ہے۔ میں اسے ایک دوسرے سانپ سے لڑاؤں گا۔ ذرا اسے رات کو یہاں آنے تو دے۔"

زمیندار اپنی بات کہہ کر چپ ہو رہا۔ اس کے چہرے پر سفاکی کا ارتعاش متحرک تھا۔

ادھر داود ہزاروں اندیشے اور وسوسے لئے اوطاق سے واپس لوٹا تو اس کا دوبارہ اپنے گھر جانے کو جی نہیں چاہا۔ اس کے دل میں پوری طرح سے اب زمیندار اختیار علی سے معصوم سسی کی بے کسی کی موت کا بدلہ جاگزیں ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے اس بات کی بھی بو محسوس کر لی تھی کہ اختیار علی اس کا پتہ صاف کرنے والا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ زمیندار اختیار علی کی اوطاق پر رات کو جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ ادھر اسے شائلہ کا بھی خیال آ رہا تھا۔ اس کی من موہنی صورت کو یاد کر کے وہ ہمیشہ کی طرح اس



سے ملنے کے لئے بے چین سا ہو جایا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی شدت سے منتظر تھی مگر داود چاہتا تھا کہ پہلے موذی اختیار علی کا قضیہ نمٹا دے اور پھر ہمیشہ کے لئے شائلہ کو اپنا کر مستقل طور پر اس گوٹھ کو خیر باد کہہ کر شہر منتقل ہو جائے...... کیونکہ وہ ایسے گوٹھ میں نہیں رہنا چاہتا تھا جہاں کے لوگ ظلم کی چکی میں پسنے کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ پھر بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے تھے اور پھر ہر سے ظالم کے آگے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ یہی نہیں وہ یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ گوٹھ کے لوگ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے...... بلکہ بعضوں کی آنکھوں میں تو اس نے اپنے لئے نفرت کی پرچھائیاں رقصاں دیکھی تھیں۔ بہر طور جیسے تیسے بے مقصد ادھر اُدھر آوارہ گردی کرنے کے بعد بالآخر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زمیندار اختیار علی کی اوطاق میں پہنچا تو وہ اس کا ہی منتظر تھا۔

❁❁❁

آنٹی شمشاد نے اپنی مرحومہ بہن کے اکلوتے بیٹے احمد سعید کا جب پروپوزل دیا تو کچھ عرصے تو میں اس بات کو ٹالتی رہی لیکن پھر ایک دن اچانک انہوں نے کسی بہانے احمد سعید کو بلا لیا۔ اپنے ہاں۔ وہ ملیریا ہی کے کسی سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی، دیکھنے میں بھی خاصا بھلا مانس اور شریف نظر آ رہا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ بہر طور چہرے مہرے سے بھی مجھے وہ ٹھیک ہی نظر آ رہا تھا۔ اس سے زیادہ میں نے کسی اور بات پر غور نہیں کرنا چاہا۔ آنٹی نے انہیں اتوار کے روز دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا اور ہم سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا تھا۔ بہر طور یہ ایک معمولی سا...... مجھے اور احمد سعید کو آمنے سامنے لانے کا بہانہ تھا جو بالآخر شام کی چائے کے بعد موقوف ہو گیا اور پھر اس رات آنٹی چپکے سے اپنے بھانجے کے بارے میں میرا عندیہ لینے کمرے میں آ پہنچی تھیں۔

"آمنہ! تمہیں میرا بھانجا کیسا لگا۔"

میں نے ان کی بات پر مختصراً کہا۔ "جی اچھے تھے۔"

"اچھے تھے نہیں بیٹی! وہ واقعی اچھا ہے اور تمہاری جوڑی بھی خوب رہے گی۔"

آنٹی نے کہا تاہم میں چپ ہی رہی۔

"بیٹی! مجھے تمہارا جواب چاہئے اور کتنا سوچنا چاہتی ہو تم۔" مجھے بدستور خاموش پا کر بالآخر وہ ملائمت سے بولیں۔ "بیٹی یقین جانو اللہ گواہ ہے اس رشتے میں میرا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہاری خوشیاں عزیز ہیں اور ننھی سعدیہ کے مستقبل کی خاطر احمد سعید اور تم دونوں کے بیچ بہتر ہم آہنگی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا دنیا میں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔ یقین جانو وہ بے چارہ تو ہمارے مشورے کے بنا کچھ بھی نہیں کرتا۔ بہرحال میں تم پر دباؤ ڈالنا نہیں چاہتی...... لیکن ہو سکے تو مجھے ہاں یا ناں میں سوچ سمجھ کر جلد جواب دے دو تو بہتر ہے۔" پھر جب میرے کمرے سے جانے لگیں تو ایک بار مڑ کر واپس میرے قریب آئیں اور شفقت سے میرے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولیں۔

"بیٹی! اتنا یاد رکھنا مجھے تمہاری ناں بھی اتنی ہی عزیز ہو گی جتنی کہ ہاں...... کہنے کا مقصد میرا یہ ہے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اگر تم میرے بھانجے سے شادی سے انکار کر دو گی تو خدانخواستہ میرا رویہ تم سے بدل جائے گا۔ تم انشاء اللہ اس کے باوجود بھی مجھے پہلے سے زیادہ اپنا پاؤ گی...... شب بخیر۔"

ان کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی۔ نیند آنکھوں سے اب کوسوں دور ہو چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے رات گئے تک آنٹی کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ بلاشبہ ان کی باتوں سے سچی ہمدردی اور بے لوث خلوص کی خوشبو صاف محسوس ہوئی تھی۔ میں نے پہلی دفعہ حقیقت کی نگاہ سے ان کی بات پر غور کیا...... تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ درست ہی کہہ رہی تھیں۔ بھلا ان کے بھانجے احمد سعید کو رشتوں کی کیا کمی تھی؟ وہ برسرروزگار تھا اچھا کھاتا پیتا تھا جبکہ میرا نہ کوئی آگا تھا نہ پیچھا...... اوپر سے مطلقہ اور ایک بچی کی ماں بھی۔

بہرطور میں نے فی الحال پھر کچھ عرصے کے لئے بات ٹال ہی دی لیکن میں جانتی تھی کہ اس بار مجھے آنٹی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا ہی پڑے گا۔ بالآخر کافی روز کے غور و خوض کے بعد میں نے آنٹی شمشاد کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا جو ان کے بھانجے احمد سعید کے حق میں تھا۔ آنٹی بے چاری جیسے میری ہاں کی منتظر تھیں۔ وہ ایک دم بچوں کی



طرح خوشی سے کھل اٹھیں اور بڑھ کر مجھے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ سچی مسرت کی جھلک ان کی آنکھوں سے عیاں ہو گئی تھی۔ مارے خوشی کے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں...... ان کی مسرت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہ تھا کہ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو انہیں بھی اس قدر ہی خوشی ہوتی۔ بہرطور انہوں نے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دیں لیکن اسی دوران ایک ناخوشگوار واقعے نے ہم سب کو یکدم غمزدہ سا کر کے رکھ دیا۔

ہوا یوں تھا کہ ایک دن بابا نے مجھے اطلاع دی کہ سدھوری اپنے بچوں اور شوہر سمیت گوٹھ میں آئی ہے...... جہاں پہلے ہم لوگ سب رہا کرتے تھے۔ میں فوراً بابا کے ساتھ اسکول کی وین میں سوار ہو کر چل دی۔ ننھی سعدیہ بھی میرے ساتھ تھی۔ جب میں اس بستی کے اپنے پرانے گھر میں داخل ہوئی تو سدھوری مجھے دیکھتے ہی فرط جذبات سے لپٹ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کی صحت بھی پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر بچل بھی نسبتاً بہتر حالت میں موجود تھا۔

اس کی سلجھی ہوئی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب واقعی کوئی ڈھنگ کا کام کرنے لگا تھا۔ اس نے سرخ شیشے کے کام والی سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی کہ اجلے سفید شلوار کرتے پر اجرک اوڑھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا...... میں نے غور کیا سدھوری مجھے بڑے انہماک سے تکے جا رہی تھی۔ یوں جیسے اسے کوئی خوشی ملنے والی تھی۔ پھر وہ جوش مسرت سے مجھے اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی اندر کمرے میں لے گئی اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ادی! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ اگر بابا نے سچ بتایا ہے مجھے تو یقین کر ادی میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہولے سے مسکرا دی اور دھیرے سے اثبات میں اس کی بات کی تصدیق کر دی...... تب سدھوری نے ایک بار پھر بے اختیار مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولی۔ "تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ادی! پتہ ہے مجھے اور بابا کو بھی اکثر تمہاری فکر رہا کرتی تھی کہ تم اتنی پہاڑ جیسی حیاتی ایک ننھی بچی کے ساتھ کس طرح گزارو گی؟ وہ تو خیر اللہ سائیں خود ہی اپنے نیک بندوں کی مشکلیں حل کر دیتا ہے......

لیکن پھر بھی اس نے آخر دنیا میں کچھ بہتری کے وسیلے تو بنا رکھے ہیں۔ انسان کو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔" سدھوری نے کہا اور میں ازراہ تفنن اس کے گال پر ہلکا سا پیار سے طمانچہ مار کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"بڑی سیانی ہوگئی ہے تو بجل..... بھائی آخر کون سی چکی کا آٹا کھلاتا ہے بتا تو ذرا....."

ہم تھوڑی دیر تک آپس میں یونہی ہنستے مذاق کرتے رہے۔ بابا نے اسے میری ہونے والی شادی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں نے اپنی شادی کے سلسلے میں بابا کی مرضی اور فیصلے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا تھا۔ وہ تو خود بھی یہی چاہتے تھے۔ باہر صحن میں بابا اور بجل کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ساتھ ہی سدھوری کے تینوں بچے بھی وہیں کھیل رہے تھے۔ ننھی سعدیہ بھی ان کے ہمراہ کھیل رہی تھی..... ذرا دیر بعد سدھوری نے کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا یہ پیسے بھی میں آپ کو بروقت لوٹا رہی ہوں۔ آپ کے کام آ جائیں گے۔ اللہ کے فضل سے بجل کی سگریٹ پان کی دکان خوب چل نکلی ہے۔ یہ اس نے ہی دیئے ہیں اور ساتھ ہی تمہارا بہت بہت شکریہ ادا بھی کیا ہے۔

میں حیرانگی سے کپڑے کی پوٹلی کو دیکھنے لگی اور اسی لہجے میں بولی۔ "سدھوری! یہ کیا ہے کون سے پیسے لوٹا رہی ہو مجھے۔"

"ادی! کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔ آپ کو یہ پیسے لینے ہوں گے، جو میں نے آپ سے بطور قرض مانگے تھے۔ پورے پچیس ہزار ہیں۔" اس نے کہا۔

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ تاہم میں پیسے لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے بڑے رسان سے بولی۔ "دیکھ سدھوری! پھر تو نے غیروں والی بات شروع کر دی ناں..... تو میری بہن ہے چھوٹی۔ رکھ لے..... مجھے ان کی ضرورت نہیں، تیرے کام آ جائیں گے۔"

"نہیں ادی! یہ پیسے میں نے تم سے ادھار مانگے تھے اور تمہاری امانت ہیں، کیا اسے لے کر تم اپنی چھوٹی بہن کا بوجھ نہیں اتارو گی۔" پھر ذرا پس و پیش کے بعد مجھے مجبوراً وہ روپے رکھنے پڑ گئے۔ بہرطور بہت اچھا وقت کٹا آنٹی شمشاد نے مجھے دو تین



دنوں کی زبردستی چھٹی بھی دے ڈالی تھی..... کہ میں اپنی بہن کے ساتھ اچھی طرح باتیں وغیرہ کر سکوں۔ ادھر بابا اور بجل کے درمیان نجانے کیا طے پایا کہ بابا نے یہ گھر سدھوری کو دے دیا اور اسے مستقل یہاں رہنے کو کہا۔ بجل کا پان سگریٹ کا کیبن قائد آباد کے چوک پر تھا۔ اس کے لئے بھی آنا جانا کوئی خاص مسئلہ نہ تھا۔ لہٰذا اس نے بھی تھوڑی رد و قدح کے بعد مستقل وہاں رہنے کی حامی بھر لی تو اس کے بعد اس نے لانڈھی والا کرائے کا مکان چھوڑ دیا۔

سدھوری کے آنے سے اب میں بھی ذرا مطمئن ہوگئی تھی۔ کیونکہ بابا کی بھی اسی میں خوشی تھی جبکہ میں اور بابا آنٹی کے ہاں ہی قیام پذیر تھے۔ ادھر میری شادی کی تیاریاں بھی جاری تھیں۔ میں نے زیادہ دھوم دھڑکے سے احتراز ہی برتا تھا اور آنٹی وغیرہ کی بھی یہی خواہش تھی، پھر ایک سادہ سی تقریب کے بعد احمد سعید اور میں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ تب آنٹی شمشاد نے احمد سعید اور میرے سر پر ہاتھ دھر کر ہمیں درازی عمر اور ڈھیروں خوشیوں کی دعائیں دیتے ہوئے شفیق لہجے میں گویا ہوئیں۔

"بیٹی آمنہ! احمد سعید نا صرف میرا بھانجا بلکہ بیٹا بھی تھا۔ اب اس لحاظ سے تم میری بہو بن چکی ہو اور بلاشبہ بہو کا رشتہ میرے لئے بیٹیوں سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔"

آنٹی شمشاد کے جذبات میں جانے کیسی حلاوت تھی کہ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اشکوں کے ان آب گینوں میں ماضی کا وہ منظر بھی گھوم گیا جب کئی سال پہلے واثق علی کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی..... تو میرے ابو نے بھی دکھی دل سے مجھے رخصت کیا تھا۔ ہاں میں اسے دکھی دل ہی کہوں گی کیونکہ میری واثق علی کے ساتھ میری ضد پر شادی ہوئی تھی اور جس میں میرے ابو کی ذرا بھی مرضی شامل نہ تھی..... لیکن بعد میں میں نے اپنی اسی نادانی کا بڑا کڑا خمیازہ بھگتا تھا۔

بہرطور شادی کے بعد میں احمد سعید کے ساتھ اس کے ملیر والے مکان میں منتقل ہو گئی، جو دو کمروں والے خوبصورت گھر پر مشتمل تھا۔ بلاشبہ احمد سعید نا صرف اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے بلکہ فطرتاً وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ ننھی سعدیہ کو حقیقتاً اپنی بیٹی سمجھتے اور اس سے حقیقی باپ کی طرح شفقت سے پیش آتے تھے۔ یہی نہیں انہوں نے ننھی سعدیہ کو اپنا نام دیتے ہوئے اس کا پورا نام سعدیہ سعید رکھ دیا تھا۔ میں پچھلی سطور

میں جس ناخوشگوار اور ملول واقعے کا ذکر کر چکی تھی وہ میری شادی کے کچھ روز بعد ہی رونما ہو گیا۔ انہی دنوں پہلی بار جب بابا اور سدھوری میرے گھر ملنے آئے اور بہت سے پھل اور تحائف بھی لائے تھے تو یونہی بابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے عجیب سی طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔

''بیٹی آمنہ! سدھوری اور پھر تمہیں اپنے اپنے گھروں میں خوش دیکھ کر میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ہوں۔ اب مجھے موت بھی آ گئی تو میں بڑے سکون سے اپنی آنکھیں بند کر لوں گا۔'' بابا کے پر شفقت لہجے میں ایکا ایکی رقت سی اتر آئی تھی۔ میں اور سدھوری بابا کے سینے پر سر رکھے کافی دیر تک بچوں کی طرح روتے رہے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ان کا مہربان سایہ ہمارے سروں سے ہمیشہ کے لیے اٹھنے والا تھا اور پھر ایک دن انہوں نے واقعی بڑے سکون کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

بابا کی اچانک موت کے جانکاہ صدمے نے مجھے اور سدھوری کو نڈھال کر دیا تھا...... لیکن شکر تھا کہ ہم دونوں ہی الم نصیبوں کو اپنے پیاروں کا مضبوط سہارا میسر تھا۔ وقت بھی بڑی عجیب بساط بچھاتا ہے۔ خود ہی زخم بھی دیتا ہے تو اسی درد کی دوا بن جاتا ہے۔ وقت گزرنے لگا اور زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔ ادھر آنٹی شمشاد پھر اس بات پر مصر رہنے لگیں کہ میں اور احمد سعید ملیر والا مکان چھوڑ کر ان کے ہاں شفٹ ہو جائیں۔ بلکہ ایک دن تو انہوں نے باقاعدہ محاذ بنا کر احمد سعید کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے شکوہ کناں ہوئیں۔ ''سعید بیٹے تم نے تو ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔''

بے چارے سعید آنٹی کی بات پر پریشان سے ہو گئے بولے۔ ''آنٹی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ خدانخواستہ بھلا میں آپ سے کیوں زیادتی کرنے لگا۔''

''تو اور کیا...... اچھا بھلا بیٹی آمنہ ہمارے ساتھ رہ رہی تھیں اور تم اسے اپنے ساتھ ہی لے اڑے۔'' آنٹی نے کہا اور سعید نے ایک طمانیت بھری سانس اگل دی۔ وہ اب آنٹی کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھے تھے۔ میں بھی ان کے بھول پن پر مسکرا دی تھی۔

''دیکھو سعید بیٹے! کیا میں تمہارے لئے ماں کا درجہ نہیں رکھتی؟ اور بیٹے کو تو اپنے ماں



باپ کے پاس ہونا چاہئے ناں۔'' آنٹی شمشاد کی دلیل کے آگے ہم دونوں ہی لاجواب ہو گئے تھے۔ بہرطور اس وقت تو احمد سعید نے انہیں ٹال سا دیا لیکن میں جانتی تھی کہ آنٹی اپنی بات ایک دن منوا کر ہی چھوڑیں گی۔ دراصل یہ ان کی ہم سے بے غرض اور انتہائی محبت تھی کہ وہ ہم دونوں کو اپنی نگاہوں کے سائے میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ مجھے بھی اسکول ملیر سے خاصا دور پڑنے لگا تھا۔ اب آنٹی کے ساتھ میرا رشتہ بھی ایسا قائم ہو چکا تھا کہ میں یہ نوکری بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی...... لیکن بہرحال مجھے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت میسر تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک دن صبح جب میں اسکول پہنچی تو خلاف توقع میں نے آنٹی شمشاد کو اسکول کے آفس میں موجود پایا۔ ایک دوسری میری ساتھی ٹیچر مس نرگس نے بتایا کہ میڈم! آج نیچے نہیں آئیں گی۔ کیونکہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس کی بات سن کر مجھے ازحد تشویش ہوئی اور میں فوراً سعدیہ کو اس کی کلاس ٹیچر کے حوالے کر کے اوپر آئی۔ آنٹی شمشاد کو اپنے کمرے کے بیڈ پر پڑے پا کر دھک سی رہ گئی۔ وہ برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ انکل محمد اسماعیل بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے محسوس کیا ان دونوں کے چہروں پر گہری پریشانی مترشح تھی۔ میں بولائی بولائی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''امی جان! کیا ہوا آپ کو...... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آپ نے......''

میں ان کے سرہانے جا بیٹھی اور ان کی پیشانی پر ازراہ محبت ہاتھ پھیرا۔ انہیں حرارت نہیں تھی۔ اس کے برعکس ان کی پیشانی عرق آلودسی محسوس ہوئی۔ ان کا چہرہ بالکل ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھے خاموشی سے تکنے لگیں۔ میں پریشان سی ہو گئی اور قریب بیٹھے انکل اسماعیل سے تفکر آمیز لہجے میں بولی۔ ''انکل! آپ ہی بتائیے ناں کیا ہوا امی کو۔''

(شادی کے بعد میں اب انہیں باقاعدہ ''امی'' پکارنے لگی تھی)

''بیٹی تمہاری امی کو کچھ نہیں ہوا۔ بس ایک ذرا سی بات کو دل سے لگا بیٹھی ہیں۔'' انکل اسماعیل نے مجھ سے کہا تو پہلی بار آنٹی جواباً اپنی کمزور آواز میں انکل اسماعیل سے مخاطب ہوئیں۔

''اسماعیل! یہ ذرا سی بات نہیں ہے۔ ہمیں اب کسی بھی لمحے اس خبیث شیطان سے خطرہ ہو سکتا ہے۔'' وہ آپس میں کسی پر اسرار مکالمہ بازی میں مصروف تھے اور ادھر میں پریشان سی ہوئی جا رہی تھی اور بالآخر دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"خدارا! آخر مجھے بھی تو بتائیں کہ ہوا کیا ہے۔ امی آپ کس خبیث شیطان کی بات کر رہی ہیں۔"

میری بات سن کر بالآخر انکل چند ثانیے توقف کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹی! وہ بدذات بھورل خان جیل سے رہا ہو کر آ گیا ہے۔ اب اس نے تمہاری امی کو جانے کیا فون پر دھمکی دی ہے کہ یہ دل سے ہی لگا کر بیٹھ گئی ہیں۔"

میں ان کی بات سن کر دھک سے رہ گئی۔ "لیکن انکل! وہ اتنی جلدی جیل سے رہا کس طرح ہو گیا۔" میں نے متحیر آمیز پریشانی سے کہا تو جواباً انکل بھی اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرتشویش لہجے میں بولے۔

"یہی تو حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ وہ جیل سے چھوٹ کیسے گیا لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسے خاصی لمبی سزا ہوئی تھی اور ایک بڑا عرصہ اس نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار بھی لیا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اپنے بیرونی اثر و رسوخ وغیرہ کے بل بوتے پر اپنی سزا میں تخفیف کروائی ہو لیکن بیٹی اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اس سے اب خوف زدہ ہو جائیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل...... ہمیں بالکل اس موذی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ایک سزا یافتہ شخص ہے ہمیں تو فوری پولیس کو اس بات کی اطلاع کرنی چاہئے۔" میں نے ان کی بات کی تائید میں قدرے پرزور لہجے میں کہا۔ مقصد یہی تھا کہ آنٹی کو حوصلہ ہو۔ کیونکہ ان کے ستے ہوئے چہرے پر خوف کی ایسی گہری پرچھائیاں ثبت ہو کر رہ گئی تھیں جو صاف طور پر محسوس کی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ سچ تھا کہ اندر سے میں بھی ذرا ڈر گئی تھی اور میرا اندازہ یہی تھا کہ بدذات بھورل اب ہم سب کا جانی دشمن بن چکا تھا لیکن بہر حال اس سے خوف زدہ ہونے کا مطلب اس موذی کو مزید خود پر حاوی کرنا تھا۔

بہر طور میری پولیس والی بات پر انکل اسماعیل نے بھی پورا اتفاق کیا تھا۔ نا صرف یہ بلکہ وہ تو باقاعدہ پولیس کو مطلع کرنے کے علاوہ کورٹ میں بھی پٹیشن داخل کروانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ اگر ہمیں کسی قسم کا بھی کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچا تو اس کی پوری ذمہ داری بھورل نامی اس خطرناک اور سزا یافتہ شخص پر ہو گی جس نے کچھ عرصہ قبل مجھے



اغواء کرنے کا گھناؤنا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انکل اسماعیل نے اگلے دن یہ دھماکہ خیز انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ جب وہ متعلقہ پولیس تھانہ انچارج سے اس سلسلے میں ملے تو اس نے نا صرف یہ حیران کن مژدہ سنایا کہ بھورل نامی شخص تو ابھی تک ڈسٹرکٹ جیل میں اپنی طویل سزا کاٹ رہا ہے بلکہ اس بھلے مانس پولیس آفیسر نے انکل اسماعیل کی باقاعدہ اس سے ملاقات بھی کروا دی تھی۔

"تو پھر...... انکل امی کو فون پر دھمکی کس بھورل نامی شخص نے دی تھی۔" بالآخر میں نے اپنے لہجے کی حیرت کو دباتے ہوئے ان سے پوچھا۔

وہ شام کا وقت تھا اور ہم سب اس وقت ایک بڑے کمرے میں صوفوں پر براجمان شام کی چائے کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ سعید بھی میرے ہمراہ تھے۔

"یہی تو ذرا سوچنے کی بات ہے۔ بھورل کو تو میں اپنی آنکھوں سے جیل میں بامشقت سزا کاٹتے ہوئے دیکھ کر آ رہا ہوں۔" جواباً انکل نے کہا پھر ساتھ پریشان سی بیٹھی آنٹی سے بولے۔ "شمشاد! جس شخص نے فون پر تمہیں دھمکی دی تھی اس نے اپنا نام بھورل ہی بتایا تھا ناں...... کیا تم اس کی آواز پہچان رہی تھیں۔"

"آواز کا تو مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا...... کیونکہ کبھی میں نے اتنے قریب سے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔" انہوں نے کہا تو احمد سعید نے پہلی بار ہولے سے کھنکھارتے ہوئے لب کشائی کی اور آنٹی سے استفسار کیا۔ "آنٹی! اب ذرا مجھے اس دھمکی آمیز فون کی گفتگو دوبارہ بتائیں گی۔"

"ہاں بیٹے! اس وقت میں صبح سویرے بچے اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔"

انہوں نے بتانا شروع کیا۔ "اس وقت لگ بھگ آٹھ بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر اپنے کانوں سے لگایا تو ایک خونخوار سی آواز ابھری۔" کیا یہ محمد اسماعیل کا گھر ہے" اس کی بدتمیزی پر مجھے غصہ تو بہت آیا...... لیکن میں پی گئی اور جواباً میں نے بھی ذرا سخت لہجے میں مختصراً کہا۔ "ہاں"

"تم کون ہو؟"

"میں ان کی بیگم ہوں۔"

"تم دونوں استانی آمنہ کے ہی سرپرست ہوناں؟"

"ہاں۔" پھر ذرا توقف کے بعد دوسری طرف سے کسی نے لمبی سی ہلکاری بھری اور اس بار لفظ چبا چبا کر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "مجھے شاید نہیں پہچانا تم نے میں وہی ہوں جسے تم لوگوں نے گرفتار کروایا تھا۔ دیکھ لو پولیس بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اب میں جو تم سب لوگ حلیہ بگاڑنے والا ہوں۔ وہ تم لوگ سب اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔"

پھر فون بند کر دیا گیا۔ اس فون کے بعد میری اپنی طبیعت مضمحل سی ہو گئی کہ بستر پر گر گئی۔ وہ سعید کو تفصیل بتانے کے بعد خاموش ہو گئیں۔ سعید نے بہ غور ان کی بات سنی تھی اور چند ثانیے کے لئے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"ویسے یہ ضروری نہیں آنٹی کہ فون پر آپ کو دھمکی دینے والا شخص بھورل ہی ہو۔ اس کا کوئی ساتھی بھی یہ کام کر سکتا ہے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ بھورل کا گروہ ہے جسے وہ جیل کی چار دیواری کے اندر سے کنٹرول کر رہا ہے۔"

سعدیہ نے پرخیال لہجے میں کہا اور ماحول کا دبیز سناٹا ان کی بات کی تائید کرنے لگا۔ آنٹی اور انکل اسماعیل کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ کمینہ بھورل زخمی سانپ بنا جیل کے اندر سے اپنے گماشتوں کے ذریعے ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سعید کی بات سو فیصد درست تھی۔ بہر حال مجھے اس بات کا دکھ بھی تھا کہ میری وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا۔

❁❁❁

وکیل سعدیہ اور اس کے ساتھی وکیل کمال نے مل کر وکالت نامہ تیار کیا اور اس پر ملزم پرویز کی بیوی فریدہ کے دستخط کروانے کے بعد ایڈووکیٹ رانا الطاف کے حوالے کر دیا۔ پرویز کو موت کی سزا سنائے جانے کے بعد سے سعدیہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ جلد سے جلد اب واثق علی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئی تھی۔

اس دوران ایک دن اچانک ایک اخبار کے مطالعے کے دوران اس کی نگاہ ایک اشتہار پر جم سی گئی۔ وہ کسی ملازمت کے بارے میں تھا، لیکن سعدیہ کو جس چیز نے اس اشتہار کی جانب توجہ مبذول کروائی تھی، وہ اشتہار کے اختتام میں پرائیویٹ فرم "عثمان



ٹریڈرز" کے تحریر کردہ الفاظ تھے، اس نے دوبارہ اور سہ بارہ اشتہار کو بہ غور پڑھا۔ یہ اشتہار "عثمان ٹریڈرز" کے لئے پرائیویٹ سیکرٹری شپ کی ملازمت کے لئے جاری کیا گیا تھا، جس میں پُرکشش تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات کے بارے میں بھی درج تھا۔ سعدیہ کو ان تمام چیزوں کی ضرورت تو نہ تھی لیکن وہ اس ملازمت کی خواہاں ضرور تھی۔ کیونکہ وہ واثق علی کے خلاف جو عملی طور پر لائحہ عمل تیار کرنا چاہتی تھی اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے واثق علی کے خلاف اپنی بھرپور جنگ کا آغاز بآسانی کر سکے۔

اسے پورا یقین تھا کہ مذکورہ اشتہار واثق علی کی فرم "عثمان ٹریڈرز" کی طرف سے ہی جاری ہوا تھا اور جس میں انٹرویو کی تاریخ کے علاوہ اس کا پتہ بھی مفصل درج تھا، چونکہ سعدیہ ایک دو بار "عثمان ٹریڈرز" جا چکی تھی اس لئے اسے یہ ایڈریس معلوم تھا۔ وہ اس وقت تنہا ایڈووکیٹ رانا الطاف کے چیمبر میں موجود تھی۔ اس نے وہ اشتہار کاٹ کر اپنے پرس میں رکھ لیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی کہ آخر یہ ملازمت کس طرح حاصل کی جائے۔ آج اسے اپنی اس غلطی پر شدید پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے نا صرف واثق علی کے سامنے اپنی اور اپنی ماں آمنہ بیگم کی اصل حقیقت آشکارا کر دی تھی بلکہ بڑے دھڑلے کے ساتھ واثق علی پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہے، جس کی ماں کو دھوکا دیتے ہوئے اس کا سب کچھ ہتھیا کر اس نے اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کر دیا۔

لٰہذا سعدیہ کا اب اپنے باپ کی فرم "عثمان ٹریڈرز" میں ملازمت کے حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اس کی صورت بھی دیکھنے کا روادار نہ تھا بلکہ اس کا بس چلتا تو واثق علی اسے دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم صادر کر سکتا تھا۔

جس لالچی اور بے حس شخص نے دولت کی خاطر اپنی بیوی کو دھتکار دیا تھا اور بعد میں اپنی بیٹی کو بھی پہچاننے کے باوجود اس سے شدید نفرت کرنے لگا تھا تو ایسے سنگدل شخص سے ہر قسم کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

کافی دیر تک وہ اس ادھیڑ بن میں مبتلا رہی کہ آخر ایسی کون سی ترکیب لڑائی جائے کہ وہ واثق علی کے سامنے پہنچے اور وہ اسے پہچان بھی نہ پائے۔ کافی غور و خوض کے

بعد بالآخر اس نے ایک سیدھی سادی سی ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ تھا چہرے کا میک اپ...... جو اس کے خدوخال یکسر بدل کر رکھ دے کہ واثق علی اسے نہ پہچان پائے۔ انٹرویو کے بعد کا مرحلہ نوکری ملنے کا تھا۔ گویا اسے دو مرحلوں سے گزرنا تھا اور دونوں مراحل میں ہی اس نے ہر قیمت پر کامیابی حاصل کرنی تھی۔ ورنہ اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرارہ جانا تھا۔

بہرطور جب اس نے کمال کو اپنی اس نئی مہم کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ ذرا ہڑبڑایا لیکن پھر چند ثانیے بعد پرتشویش لہجے میں بولا۔ ''سعدیہ! جس ''انداز'' اور جس ''مقصد'' کے لئے تم ''عثمان ٹریڈرز'' میں انٹر ہو کر جاب کرو گی وہ بلاشبہ بھیڑیوں کے بھٹ میں گھسنے کے مترادف ہوگا۔''

اس بات پر سعدیہ کے ہونٹوں پر ایک لمحے کو پرعزم سی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ جس میں پختگی کے ساتھ ساتھ ''اعتماد'' کی بھی جھلک تھی۔

بہرطور اس نے کمال کی بات کے جواب میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کمال! زندگی میں کبھی کسی اہم مقصد کی خاطر بڑے سے بڑا رسک لینا پڑتا ہی ہے۔ ویسے میں نہیں سمجھتی کہ وہاں میرا کوئی بال بیکا کر سکے۔ بس تم میرا ایک کام کر دو۔ کسی طرح سے میرے لیے میک اپ کٹ کا بندوبست کر دو۔''

سعدیہ نے اپنی بات ختم کی کمال نے کندھے اچکا کر بالآخر حامی بھر لی۔ قصہ کوتاہ انٹرویو کی تاریخ کا وقت بھی آن پہنچا اور ادھر سعدیہ نے بھی اپنے چہرے کو تختۂ مشق بناتے ہوئے میک اپ کی ایسی لیپا پوتی کی کہ جب اس نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو ایک لمحے کو تو خود کو بھی نہیں پہچان پائی تھی۔ کمال بھی اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ حالانکہ اس لیپا پوتی میں اس نے بھی سعدیہ کی تھوڑی بہت مدد بھی کی تھی۔ یہ سارا ڈرامہ چیمبر کے آفس ہی کے ایک پرشکوہ کمرے میں ہو رہا تھا۔ سعدیہ نے اپنی آنکھیں بھی کانٹیکٹ لینس لگا کر تبدیل کر ڈالی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک الٹرا ماڈرن اور جاذب نظر خوبصورت لڑکی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا وہ تمہاری جیسی ایک فیشن ایبل لڑکی کو جاب دے۔'' آخر میں کمال نے اس کے حسین سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے تبصرہ کیا تو سعدیہ جواباً ایک معنی خیز ہنسی



کے ساتھ بولی۔ ''تمہارا خیال بالکل غلط ہے کمال! تم دیکھ لینا انہیں میری جیسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے۔ ایسی فرموں کے مالکان کو میرے جیسی ہی پرکشش لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ کمال نے اس کی بات پر مزید کوئی تبصرہ نہ کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سعدیہ کے اس ''اقدام'' سے مطمئن نہ ہو۔ بہرطور سعدیہ نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور اپنے ضروری ڈاکومینٹس کی فائل سنبھالی، پھر کمال کو متفکر سا چھوڑ کر اسے گڈ بائی کہتی ہوئی باہر ایک رکشے میں آ بیٹھی اور اسے شارع فیصل چلنے کو کہا۔ راستے میں وہ اپنے ذہن میں ان سارے متوقع سوالوں کو دہراتی رہی جس کے جوابات اس نے دوران انٹرویو دینے تھے......

پھر لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد رکشہ نے اسے شارع فیصل کی ایک سروس روڈ پر اتار دیا۔ یہ سارا کمرشل ایریا تھا۔ جدھر کئی کاروباری دفاتر کی کثیر المنزلہ بلڈنگیں بڑی تمکنت کے ساتھ استادہ تھیں۔ انہی میں ''عثمان ٹریڈرز'' کا دفتر بھی تھا۔

سعدیہ اپنی مطلوبہ عمارت کے اندر داخل ہو کر لفٹ کے ذریعے فورتھ فلور پر پہنچی۔ انٹرویو کا وقت نو بجے کا تھا جبکہ سعدیہ آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گئی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی یہاں کئی بار آ چکی تھی اس لئے اسے زیادہ جھجک کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سعدیہ کو ایک ایسے ہال کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا جدھر اور بھی بھانت بھانت کی لڑکیاں اور عورتیں بیٹھی تھیں۔

سعدیہ نے ایک طائرانہ نگاہ ان پر ڈالی اور صوفے پر جگہ خالی دیکھ کر بیٹھ گئی۔ دوسری لڑکیوں کے برعکس سعدیہ کے چہرے پر نوکری ملنے کی آس و یاس جیسی کیفیت نہ تھی۔ وہ بالکل پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اسی اثناء میں انٹرویو شروع ہو چکا۔

سعدیہ کو پتہ لگا کہ انٹرویو ایم ڈی واثق علی بذات خود اپنے کمرے میں لے رہا تھا۔ کسی انجانے احساس تلے سعدیہ کو ایک لمحے کے لئے تھوڑی سی گھبراہٹ محسوس ہوئی لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اس نے دانستہ انٹرویو کے لئے اپنا نمبر آخر میں رکھا تھا۔

اس دوران سعدیہ نے محسوس کیا کہ انٹرویو کے لئے جانے والی لڑکی ایم ڈی کے

کمرے سے جلد ہی لوٹا دی جا رہی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر سعدیہ نے اندازہ لگایا کہ فی امیدوار کو انٹرویو کے لئے کم از کم بیس سے پچیس منٹ کمرے میں مصروف ہونا چاہئے تھا...... جبکہ اتنی مدت میں کم و بیش چار امیدوار لڑکیاں گویا جیسے بھگتائی جا رہی تھیں۔

اس عجیب صورتحال پر سعدیہ کو ہی نہیں وہاں دیگر موجود لڑکیوں کو بھی حیرت ہوئی تھی اور جو انٹرویو دے کر لڑکیاں لوٹ رہی تھیں ان کی کیفیت تو مزید دیدنی تھی۔ ان سب کے چہروں سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک فارمیلٹی پوری کر کے جلد لوٹا دی جا رہی ہوں۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے سعدیہ پر مایوسی چھانے لگی تھی۔

❁❁❁



سعدیہ کی مایوسی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جو امیدوار لڑکیاں ایم ڈی صاحب کے کمرے سے انٹرویو دے کر جلد لوٹ کر آ رہی تھیں۔ انہوں نے دبے لہجے میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ مذکورہ نوکری کے لئے انٹرویو محض ایک ڈھونگ ہے "باس" پہلے ہی سے کسی سفارشی لڑکی کو اپائنٹ کر چکے ہیں۔ لہٰذا ان چہ میگوئیوں نے نہ صرف سعدیہ کو بلکہ وہاں موجود دیگر منتظر لڑکیوں کو بھی مایوس سا کر دیا تھا۔ سعدیہ اپنی جگہ بیٹھی سوچ میں مستغرق تھی کہ آخر ایسی کون سی صورت نکالے کہ وہ ہر صورت یہ جاب حاصل کر کے ہی رہے۔

ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ معاً ہال کمرے کا بیرونی شیشے کا دروازہ کھلا اور ہلکے سبزی مائل سفاری سوٹ میں ایک پختہ العمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی وضع قطع سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کمپنی میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں گرے کلر کا بریف کیس بھی تھا...... اس نے ایک لمحے رک کر پہلے طائرانہ اور پھر قدرے دلچسپ نظروں سے وہاں موجود لڑکیوں کی جانب دیکھا۔ پھر جب اس کی نگاہ سعدیہ کے دلکش چہرے پر پڑی تو سعدیہ نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی دلچسپی کی چمک مزید گہری ہو گئی تھی۔ سعدیہ کے بیدار مغز میں جانے کیا سمائی کہ جواباً وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے دلفریب انداز میں مسکرا دی۔ پھر اس شخص کے جانے کے ذرا ہی دیر بعد سعدیہ کو اپنے اس پرانے حربے کی اثر پذیری کا اندازہ ہوا۔

سامنے استقبالیے پر موجود لڑکی جو بیک وقت ٹیلی فون آپریٹر کے بھی فرائض انجام دے رہی تھی، اس کے قریب رکھے فون کی گھنٹی گنگنائی پھر اس نے ریسیور کانوں سے لگایا دوسری جانب سے کچھ سنتے ہی مؤدبانہ لہجے میں "جی بہتر سر" کہتی ہوئی ریسیور رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ پھر ہولے سے مسکراتی ہوئی سعدیہ کے قریب آ کر بولی۔ "آپ

ذرا میرے ساتھ آیئے۔"

سعدیہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے اپنا تیر ٹھیک نشانے پر لگتا محسوس ہوا وہ اس کے ساتھ چل دی۔ یہ ایک اور ہال تھا جہاں فرش پر دبیز سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ پوری فضا میں اے سی پلانٹ کی ٹھنڈک رچی ہوئی تھی وہ ریسپشنسٹ لڑکی نسبتاً ایک بڑے شیشے والے دروازے کے پاس آ کر رک گئی، پھر اس کا دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے سعدیہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ سعدیہ اندر داخل ہو گئی یہ ایک پیراستہ آفس نما کمرہ تھا اور سامنے ایک بڑی سی میز کے پیچھے وہی شخص بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر بڑی شاہانہ تمکنت کے ساتھ بیٹھا تھا جسے وہ کچھ دیر قبل بیرونی ہال نما نشست گاہ میں دیکھ چکی تھی۔ اندر آنے سے قبل سعدیہ نے اس کی نیم پلیٹ مع عہدہ کے پڑھ لی تھی۔ یہ کمپنی کا جنرل منیجر آفتاب احمد تھا۔

"آیئے محترمہ! تشریف رکھئے۔" اس نے ازراہ تہذیب قدرے آگے ہو کر سعدیہ کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سعدیہ "شکریہ" کہہ کر بیٹھ گئی۔

"میرا خیال ہے آپ انٹرویو کے لئے تشریف لائی تھیں۔" اس نے سعدیہ کے سراپے کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے قدرے شستہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں سر! آئی تو انٹرویو دینے ہی تھی...... جاب کے سلسلے میں...... لیکن لگتا ہے ایم ڈی صاحب پہلے ہی سے کسی کو اپائنٹ کر چکے ہیں۔" اس نے قدرے صاف گوئی سے کہا۔ اس کے وجدان نے آفتاب احمد کی بارعب شخصیت میں چھپی عاشق مزاجی کو محسوس کر لیا تھا۔

"گڈ کافی زود فہم ہیں آپ۔" اس نے عجیب معنی خیز مسکراہٹ سے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر مزید بولا۔ "آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا حقیقت بھی یہی ہے کہ واثق علی صاحب نے اپنے منظور نظر اکاؤنٹنٹ کی کسی رشتہ دار کو پہلے ہی سے بطور اپنی پرسنل سیکرٹری اپائنٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"حیرت کی بات ہے سر...... اتنی بڑی کمپنی میں کیا ایک اکاؤنٹنٹ ہی آپ کے باس کے منظور نظر ہیں۔ حالانکہ اس سے کہیں زیادہ اہم عہدے پر تو آپ فائز ہیں، جی ایم کوئی چھوٹا عہدہ تو نہیں ہوتا۔" سعدیہ نے مصنوعی حیرت سے کہا، مقصد اسے "شیز"



لرنا تھا اوز ہوا بھی یہی، سعدیہ کی بات پر وہ قدرے پھول سا گیا، پھر اس کی سرگیں نکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"ویسے میں اگر چاہوں تو اکاؤنٹنٹ کی اس رشتے دار خاتون کو رد کر کے آپ کو اس ل جگہ رکھ سکتا ہوں، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"بالکل آپ ایسا کر سکتے ہیں سر! لیکن میں بھی ہرگز ایسا نہیں چاہوں گی۔ ویسے سر ن آپ کی فائدے والی بات کچھ سمجھ نہیں سکی۔" اس نے استفہامیہ لہجے میں کہا تو فتاب احمد بھونڈے پن سے مسکرایا۔ وہ جتنا باہر سے سوبر نظر آ رہا تھا اتنا تھا نہیں...... حدیہ اس کا پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ آفتاب احمد جیسا دل پھینک شخص اس کے لئے ارآمد ہو سکتا تھا اور مزید یہ کہ ایک حد میں رہتے ہوئے اگر دور کے سہانے ڈھولوں کی واز پر خوش رکھا جا سکے تو وہ آئندہ بھی کام آتا رہے گا۔ سعدیہ کو حیرت تھی کہ ایک شخص تنے دھڑلے کے ساتھ ایک عام لڑکی کے سامنے بغیر کسی ڈر و خوف کے یہ بات کیوں اہر کر رہا تھا کہ ایم ڈی صاحب پہلے ہی سے کسی سفارشی لڑکی کو اپائنٹ کرنے کا فیصلہ ر چکے ہیں۔ بہر طور آفتاب احمد نے مسکراتے ہوئے جواباً مفصل کہا۔

"ایم ڈی صاحب کی سیکرٹری ان کی خشک مزاجی کے باعث زیادہ عرصے نہیں چل تی اور اگر کوئی بیچاری اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر اس نوکری پر ڈٹی رہے تو وہ نکل ادھ موئی ہو جاتی ہے۔ بس آپ یوں سمجھیں یہ بہت مشکل جاب ہے اور ظاہر ہے ن سب باتوں کے تناظر میں آپ خود سوچ رہی ہوں گی کہ بلکہ یہ چاہ رہی ہوں گی کہ وئی سہل سی مگر اچھی جاب آپ کو مل جائے۔"

"تھینک یو سر! میں واقعی ایسا ہی چاہتی ہوں کہ کوئی ایسی سہل سی جاب ملے جسے ے بآسانی کر بھی سکوں اور اسے جاری بھی رکھ سکوں۔"

سعدیہ نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر لگے کانٹیکٹ لینس کے مصنوعی ڈورے اس ا طرف اچھالتے ہوئے ازراہ تشکر کہا۔ "آف کورس! اب آتے ہیں اصل بات کی رف......" آفتاب احمد اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر پوری طرح سے جماتے ہوئے لا۔ "درحقیقت بات کیا ہے کہ باس کے مقابلے میں میں کافی نرم دل واقع ہوا ہوں۔ ے بڑا ترس آتا ہے یا یوں سمجھیں مجھے بہت دکھ محسوس ہوتا ہے جب آپ جیسی نرم د

نازک اور حسین اور پڑھی لکھی لڑکیاں نوکری کے لئے دھکے کھاتی پھرتی ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا...... اب یہی دیکھ لو ایک طرف جاب کے سلسلے میں اشتہار جاری کیا گیا اور دوسری طرف کسی سفارشی لڑکی کو اپائنٹ بھی کر لیا گیا، کتنا آپ لوگوں کا خرچ ہوا ہوگا۔" وہ ذرا خاموش ہوا، سعدیہ کو اب اکتاہٹ سی ہونے لگی تھی، مگر ایسے سنہری موقع سے متوقع فائدہ اٹھانے کے لئے اسے ابھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھانا تھے۔ لہٰذا آفتاب احمد کی بات پر اس نے مغموم اور ممنون نگاہوں کے ملے جلے تاثرات سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا چہرہ جھکا لیا اور اپنی سی پوری سعی کرنے لگی کہ ایک دو آنسو آنکھوں سے ٹپک جائیں۔ لیکن پھر بجائے آنسو کے کانٹیکٹ لینس کے "ٹپکنے" کا خدشہ دل میں ابھرا تو اس نے اپنا یہ ارادہ بدل ڈالا، لیکن اس کے انداز مغمومیت نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ نتیجتاً آفتاب احمد جیسے اس موقع کا منتظر تھا یک دم اپنی بھاری بھرکم چیئر سے اٹھا اور "ار......ر......رے" کرتا ہوا اتنی تیزی کے ساتھ سعدیہ کی طرف لپکا کہ سعدیہ تو ایک لمحے کو گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آفتاب احمد جو اسے سنبھالنے اور تسلی تشفی دینے کی آڑ میں اس کے قریب آنے کا یہ موقع جاتا دیکھ کر رک گیا اور پھر اس سے پہلے کہ سعدیہ کو اپنا رومال پیش کرتا سعدیہ اس عرصے میں اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹشو پیپر کو آنکھوں پر پھیرنے لگی۔

"آپ......بب......بیٹھیں......بیٹھیں اور بالکل فکر نہ کریں مس۔"

"سعدیہ" سعدیہ نے جواباً اپنا نام بتایا۔

"جی مس سعدیہ! آپ بے فکر ہو جائیں بالکل، آپ کی مشکل میں حل کر کے ہی رہوں گا۔" آفتاب احمد نے کہا اور مزید جیسے سعدیہ کو مژدہ جانفزا سناتے ہوئے بولا۔ "دیکھئے مس سعدیہ! میں آپ کے لئے فی الحال اسٹینو کی جاب کا بندوبست کر سکتا ہوں...... آپ ایک بار قدم جما لیں اپنے کام سے میرا دل جیت لیں تو یقیناً آپ آگے چل کر اہم عہدے پر بھی پہنچ سکتی ہیں۔"

اس کی بات سن کر سعدیہ کا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ بجائے ایم ڈی (واثق علی) کے سیکرٹری ہونے کے "اس کارآمد شخص" کے زیردست رہ کر "اپنی جگہ" بنا لے...... کیونکہ جس مقصد کے تحت وہ یہاں رہنا چاہتی تھی اس کے



لئے یہ ضروری نہ تھا کہ کوئی بڑی پوسٹ ہی ملے بلکہ اسے اسٹینو گرافر کی جاب زیادہ مفید اور اپنے مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے زیادہ بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ مزید یہ کہ کمپنی کا ایک اہم شخص جو یقیناً فطرتاً جھاڑ جھلا سا تھا، کو وہ الو بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی...... وہ جس طرح ابھی کمپنی سے متعلق چھوٹی موٹی سیکرٹ باتوں کو دھڑلے کے ساتھ عیاں کر رہا تھا وہ یقیناً آئندہ بھی کمپنی سے متعلق دیگر اہم اور خفیہ رازوں سے بھی آگاہی دے سکتا تھا۔ لہٰذا جب آفتاب احمد نے اسے یہ عندیہ دیا کہ وہ اسے اپنی اسٹینو کے طور پر اس کا تقرر کرنا چاہتا ہے...... تو سعدیہ اپنے دلکش چہرے پر تشکر و انبساط کے تاثرات سجائے ہوئے ممنون بھرے لہجے میں خوش ہو کر بولی۔ "بہت، بہت شکریہ سر آپ کا...... آپ واقعی ایک نرم دل اور شفیق انسان ہیں سر...... پھر میں کب تک امید رکھوں...... میرا مطلب ہے کہ پھر کب حاضر ہو جاؤں۔" آخر میں اس نے پوچھا تو آفتاب احمد نے چند ثانیے بعد کہا۔

"بس چند دنوں کی بات ہے ایک جگہ خالی ہونے والی ہے...... اس کا اشتہار میں جانے نہیں دوں گا اور ایم ڈی صاحب سے سیدھے سیدھے آپ کے لئے بات کر لوں گا اور انٹرویو بھی میں ہی لوں گا۔ بلکہ انٹرویو کیا لینا آپ کو کام وغیرہ میں ہی ذرا سمجھا دوں گا لیکن اس کے لئے آپ کو یہ ظاہر کرنا پڑے گا کہ آپ میری قریب کی کوئی رشتے دار ہیں۔"

"جی بہتر سر! میں...... مجھے منظور ہے...... میں آپ کی بھتیجی کے طور پر خود کو یہاں ظاہر کر دوں گی۔" سعدیہ نے جلدی سے کہا اور دانستہ "بھتیجی" والا رشتہ جوڑا۔ تاہم دل میں آفتاب کی ذہنی کوفت سے محظوظ ہوئی لیکن یہ سب بھی ضروری تھا وہ خود کو اس کے سامنے جس قدر معصوم اور انجان رکھنا چاہ رہی تھی اتنا ہی اس کے لئے یہ بات سودمند ثابت ہو سکتی تھی...... کیونکہ انجان رہ کر ہی سامنے والے کو کھلنے کا موقع دیا جا سکتا تھا اور سعدیہ آفتاب احمد کو زیادہ سے زیادہ کھلنے کا موقع فراہم کرنا چاہ رہی تھی۔ سعدیہ کی بات پر آفتاب احمد نے ناگواری سے منہ بنایا اور بولا۔

"او......نو...... اب اتنا قریبی رشتہ جوڑنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس یوں کہہ دینا بھی کافی ہوگا کہ تم میری دور پرے کی خالہ کی بیٹی ہو...... ویسے اس کی بھی کوئی

خاص ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں ایم ڈی صاحب کے سامنے جانے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے..... کیونکہ مجھے یہ اختیار ہے کہ میں اپنے ڈپارٹمنٹ میں چھوٹی موٹی تقرری اپنی صوابدید پر کرسکوں۔ اس کے لہجے میں غرور عود کر آیا تھا۔

"سر آپ کا ایک بار پھر بہت بہت شکریہ، مجھے پھر اجازت ہے سر؟" بالآخر سعدیہ نے اجازت چاہی تو آفتاب جیسے چونکا اور دونوں ہاتھ اپنے پھیلا کر بولا۔ "ارے مس سعدیہ! باتوں باتوں میں تو میں نے آپ کو کچھ کھانے پینے کا بھی نہیں پوچھا۔ ویسے کیا لینا پسند کریں گی آپ۔"

"جی کچھ نہیں...آپ نے مجھے نوکری کی امید دلا دی یہی میرے لئے کافی ہے سر... سر اب میں جاؤں..... گھر میں میرے چھوٹے بہن بھائی اور بوڑھی والدہ میری راہ تک رہی ہوں گی۔" سعدیہ نے جان چھڑانے کی غرض سے آخر میں مسکین صورت بناتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوگئی۔ آفتاب احمد بھی اس پر نگاہ ملتفت ڈالتا ہوا اسے رخصت کرنے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا پھر بڑے گھرے لہجے میں سعدیہ سے بولا۔

"جاؤ انہیں بھی اپنی نوکری ملنے کی خوشخبری سنا دو۔ مزید یہ بھی کہ ان کی مصیبتوں و آلام کے دن اب بیت چکے۔" وہ خواہ مخواہ ہی اپنے لہجے کو شاعرانہ بنانے پر تلا ہوا تھا سعدیہ نے جواباً مسکراتے ہوئے آخری بار ایک ادائے خاص سے آفتاب احمد کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

❖❖❖

آمنہ بیگم ظہر کی نماز سے فارغ ہوئیں دوپہر کا کھانا کھا چکی تھیں۔ سعدیہ کی واپسی شام ڈھلے ہی ہوتی تھی۔ وہ مصلے بچھے تخت پوش سے اٹھ کر قریب ہی بچھی چارپائی پر ذرا قیلولے کی غرض سے لیٹ گئیں اور آنکھیں موندے اپنی بیٹی سعدیہ کے بارے میں سوچنے لگیں۔ اسے اپنی اس وکیل بیٹی سعدیہ پر بے اندازہ فخر تھا، جو اپنی ماں کو اس کے فریبی شوہر سے اس کا حق دلانے کی خاطر دن رات ایک کئے ہوئے تھی۔ آمنہ بیگم کو اگرچہ اس بات کا قلق بھی تھا کہ سعدیہ نے اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے اوپر مضبوطی کا جو آہنی خول چڑھا رکھا ہے کہیں وہ اس کے نازک وجود کو گھائل نہ کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ آمنہ بیگم ہر نماز میں اس کی کامیابی اور درازئ عمر کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ تب کہیں



جا کر آمنہ بیگم کے دل بے قرار کو یک گونہ سکون سا ملتا تھا..... کوئی پون گھنٹہ قیلولہ کرنے کے بعد وہ آہستگی سے چارپائی پر سے اٹھیں اور اپنی فیروزی رنگ کی ڈائری سنبھال کر دوبارہ چارپائی پر رکھے بڑے سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں انہوں نے یونہی پہلے ڈائری کے اوراق کو پلٹا۔ ان کی عبرت اثر داستانِ ماضی کا آج آخری باب تھا..... جسے وہ آج ایک ہی نشست میں ختم کرنا چاہتی تھیں۔

بد ذات بھورل خاں یا اس کے ساتھی کا دھمکی آمیز فون اب باقاعدہ معمول کے ساتھ آنے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے آنٹی شمشاد کی پریشانی دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی، جس کے باعث ان کی صحت بھی متاثر ہو رہی تھی..... تھوڑے ہی دنوں میں وہ بستر سے لگ گئی تھیں..... ادھر احمد سعید اور انکل محمد اسماعیل نے دھمکی دینے والے فرد کی ٹیلی فون کالز بھی ٹریس کرنے کی کوششیں کیں..... آبزرویشن کا سہارا لیا لیکن مجرم بھی چالاک تھا وہ کسی ایک نمبر سے ڈائل نہیں کرتا تھا۔ بلکہ سرِ راہ بنے مختلف بوتھ سے فون کیا کرتا تھا اور اس کے لئے وہ ٹیلی کارڈ استعمال کرتا تھا۔

آنٹی شمشاد کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کچھ عرصے کے لئے مستقل طور پر ان کی دیکھ بھال کے لئے ان کے گھر آ چکی تھی..... ہم لوگ ہر طرح سے آنٹی کو تسلی دینے کی سعی کرتے کہ وہ دل پر ان گمنام دھمکیوں کو نہ لیں۔ لیکن ہمیں خود اپنی اس نصیحت کے کھوکھلے پن کا احساس ہو جاتا۔ انکل اسماعیل بھی اب خاصے پریشان رہنے لگے تھے۔ یہ لوگ بے چارے شریف اور امن پسند لوگ تھے..... کبھی ان کا ایسی صورت حال سے پالا نہیں پڑا تھا مجھے تو آج بھی یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب بدمعاش بھورل خاں مجھے اغواء کر کے لے گیا تھا تو انکل اسماعیل نے کس طرح محتاط انداز ے کی مدد سے بھورل خاں کے خلاف اغواء کی ایف آئی آر کٹوا کر پولیس کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا اور بالآخر مجھے بازیاب کروا کر ہی دم لیا تھا لیکن اب انہیں بھی اس قدر پریشان دیکھ کر مجھے دکھ سا ہونے لگا اور ساتھ ہی شرمندگی بھی..... کہ یہ سب میرے ہی کارن ہو رہا تھا یہ شکر تھا کہ میرے شوہر احمد سعید برابر آنٹی اور انکل کو حوصلہ دیتے ہوئے تھے..... نہ صرف یہ بلکہ وہ انہیں اس بات کی بھی تسلی دیتے کہ پولیس کے خفیہ ڈپارٹمنٹ کے چند اہلکار بھی اس گمنام شخص کی تلاش میں مصروف ہیں۔

انشاء اللہ وہ جلد یا بدیر گرفتار ہو جائے گا...... ادھر یہ طفل تسلیاں جاری تھیں، ادھر روح فرسا حادثہ رونما ہو گیا۔ حادثے سے ایک رات قبل...... میں ملیر والے مکان میں آ گئی تھی اور اگلے روز صبح جب میں جناح اسکوائر آنٹی کے اسکول پہنچی تو کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد اچانک دوران کلاس میری ایک اسٹوڈنٹس بچی نے قے کر دی۔ ابھی اس کی قے جاری تھی کہ اچانک تلے اوپر تین چار اور ننھے بچوں کو بری طرح الٹیاں شروع ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر میں بری طرح بوکھلا سی گئی...... کچھ سمجھدار قسم کے بچوں نے اپنے الٹیاں کرتے ساتھیوں کو سنبھالا...... میں بھی ان کی طرف لپکی پہلی والی بچی پر اب غشی طاری ہونے لگی تھی۔

میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے اور کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کیا جائے......؟ ابھی میں اپنے حواسوں پر قابو ہی پا رہی تھی کہ اچانک ٹیچر حمیدہ اور رخسانہ بھی بدحواس باختہ دوڑتی ہوئی میری کلاس میں آ گئیں۔ ہانپتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ان کی کلاس کے کچھ بچوں کو الٹیاں ہو رہی ہیں اور ایک دو کی حالت تو انتہائی نازک ہے۔ میں یہ سن کر دھک سے رہ گئی۔

دل و دماغ کو کچھ اور سوچنے کا یارا نہ تھا...... پہلا خیال یہی میرے ذہن میں آیا کہ فوری طور پر قریبی ہسپتال فون کرنا چاہئے، پھر تو دیکھتے ہی دیکھتے پورے اسکول میں کہرام سا مچ گیا۔ یہی نہیں متعلقہ ہسپتال کی ایمبولینس آتے آتے دو تین بچوں کی موت بھی واقع ہو گئی۔ میں اپنی جگہ لرز کر رہ گئی...... خدا کا شکر تھا کہ میری بچی سعدیہ ان بچوں میں نہیں تھی۔ جنہیں غالباً زہر خورانی ہوئی تھی۔ آنٹی شمشاد کی تو پہلے ہی ذہنی دباؤ کی وجہ سے حالت خراب تھی۔ اوپر سے اس جانکاہ حادثے نے انہیں دنیا و مافیہا سے ہی بیگانہ کر دیا...... انکل اسماعیل نے فوراً متاثرہ بچوں کو ہسپتالوں میں داخل کروایا۔ اس اثناء میں میں نے احمد سعید کو بھی فون کر کے بلا لیا...... پولیس بھی وہاں آ پہنچی تھی۔ نیز متاثرہ بچوں کے والدین بھی روتے پیٹتے وہاں آنے لگے۔ جنہیں متعلقہ ہسپتال لے جایا گیا۔ کچھ تو اس حد تک مشتعل ہوئے کہ آنٹی شمشاد اور انکل محمد اسماعیل سے بدتمیزی سے پیش آتے ہوئے ان پر کیس کرنے کی دھمکیاں دیں، احمد سعید اور میں بھی چونکہ انہی کے ساتھ تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی خطرناک نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ آنٹی



شمشاد کو گمنام فون پر ملنے والی دھمکیاں آج سچ ثابت ہو گئی تھیں۔

ظالم جوش انتقام میں اس حد تک اندھے ہو چکے تھے کہ انہیں معصوم بچوں پر بھی رحم نہیں آیا تھا۔ حالات پھر تیزی کے ساتھ منفی رخ اختیار کرتے چلے گئے تھے۔ باقاعدہ پولیس تفتیش اور متاثر بچوں کے میڈیکل چیک اپ سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ ان کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ پھر فوراً اسکول کا واٹر ٹینک کا معائنہ کیا گیا تو یہ دردناک بات بھی کھلتی چلی گئی کہ اس پانی میں زہریلا مواد تھا، اور وہی زہریلا پانی پی کر بچوں کی حالت بگڑی تھی عموماً بچے اپنے ہمراہ پانی کی بوتل یا چھوٹا واٹر کولر لاتے تھے۔ لہٰذا وہی بچے زہریلے پانی سے متاثر ہوئے تھے جن کے پاس اپنا پانی نہیں تھا اور انہوں نے اسکول کا پانی پیا تھا۔ اب ظاہر ہے سب بچے تو اپنے ساتھ پانی کی بوتلیں نہیں لاتے تھے۔

ادھر جب متاثرہ بچوں کے والدین تک لیبارٹری کی رپورٹ پہنچی کہ ان کے بچوں کی حالت اسکول کے پانی سے بگڑی ہے تو انہوں نے فوراً آنٹی شمشاد اور انکل اسماعیل پر ناقص صفائی کا الزام اور اپنے بچوں کی ناگہانی موت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے عدالت میں کیس کر دیا۔ لاکھ ہم قسمیں کھا کر اپنی بے گناہی کا اظہار کرتے کہ یہ ان کے خلاف دشمنوں نے ایک گھناؤنی سازش کھیلی ہے، لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آنٹی اور انکل کے خلاف رپورٹ کر دی گئی تھی اور پولیس انہیں گرفتار کرنے کے لئے آناً فاناً وہاں پہنچ گئی۔ اس اثناء میں انکل اور آنٹی نے وہاں موجود مجھے اور احمد سعید کو چلے جانے کو کہا۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں پولیس ہمیں بھی نہ گرفتار کر لے۔ ان کی اس بات نے میرا دل کاٹ کر رکھ دیا اور میں بے اختیار آنٹی اور انکل اسماعیل کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں خود کو ان کی ناگہانی آفات کا ذمہ دار سمجھ رہی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی کہ میری ہی وجہ سے وہ آج اس حالت کو پہنچے تھے۔ کمینہ بھورل مجھے اغواء کرتا اور نہ ہی آنٹی اور انکل اسماعیل اس کے خلاف کمربستہ ہو کر اسے حوالۂ پولیس کرتے۔ آنٹی اور انکل، بابا کے بعد میرے محسن تھے اور اپنے محسنوں کو غم و اندوہ کے گرداب میں پھنسا دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور یہی نہیں جب انہوں نے مجھے اور احمد سعید کو فوراً اپنے ملیر والے گھر چلے جانے کو کہا تاکہ پولیس ہمیں بھی گرفتار نہ

کر لے تو میں خود پر قابو نہیں پا سکی تھی اور آنٹی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یہ کیا ہو گیا آنٹی! یہ کیسے ہو گیا؟" میں ہچکیوں کے درمیان بولی۔ لیکن آنٹی کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا...... ایسے میں اسماعیل انکل نے مجھے اور احمد سعید کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میری بات مانو ہمارے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کروا دی گئی ہے...... ابھی پولیس ہمیں گرفتار کر کے لے جائے گی۔ اگر تم دونوں بھی یہاں موجود رہے تو تم دونوں بھی اندر ہو جاؤ گے پھر باہر ہمارا دفاع کرنے کے لئے کون ہو گا۔" ان کی بات میں وزن تھا لیکن پھر بھی ہمارا جی انہیں اس حالت میں تنہا چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا...... ایک قیامت تھی جو ہم پر ٹوٹی تھی، ایک ظلم کا پہاڑ تھا جو ہم پر گرا دیا گیا تھا۔ یہ تو ہم جان چکے تھے کہ یہ گھناؤنی سازش بھورل یا اس کے گرگے کی تھی لیکن اس وقت ہمیں اس بڑے جنجال سے خود کو نکالنا تھا۔ بہرطور میں اور احمد سعید خود پر پتھر رکھ کر واپس اپنے گھر آ گئے۔ بے چارے احمد سعید اس واقع کے بعد سے بہت زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس رات گھر آ کر کچھ نہیں کھایا پیا تھا، ساری رات ہم نے جاگ کر گزار دی۔ ہم دونوں مبہوت سے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہمیں کسی ناگہانی اطلاع کا انتظار ہو اور بالآخر وہی ہوا جس کا ہمیں خدشہ تھا۔ متاثر اور فوت ہو جانے والے بچوں کے چند با اثر والدین نے بغیر حالات کا تجزیہ کیے فوراً پولیس میں رپورٹ کروا کر آنٹی اور انکل اسماعیل کو گرفتار کروا دیا اور ان پر ناقص انتظام اور لاپروائی کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ اسکول کی رجسٹریشن تو کینسل ہونی ہی تھی۔ دونوں پر قتل کی بھی فرد جرم عائد کر دی گئی۔ احمد سعید نے بھی آنٹی اور انکل کو سزا سے بچانے کے لئے سر توڑ کوششیں شروع کر دی تھیں اور بالآخر کافی تلاش بسیار اور بھاگ دوڑ کر کے ایک قابل وکیل ڈھونڈا، جس کی فیس بھی اس کی قابلیت کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی۔ لیکن اس نازک وقت میں بھلا پیسوں کو کون دیکھتا ہے۔ انکل اسماعیل نے احمد سعید کو بینک چیک بک اپنے دستخط کر کے دی تھی۔ مقدمہ چلا، عدالتی کارروائی نے شروع میں تو کچھوے جیسی رفتار پکڑی لیکن پھر پے در پے پیشیوں کے بعد فیصلہ کن کارروائی عمل میں آئی اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ کرم ہوا کہ عدالت نے آنٹی اور انکل کو باعزت بری کر دیا۔ اس میں ان کا کافی اثر و رسوخ بھی کام آیا تھا جنہوں نے متاثرہ بچوں کے مشتعل والدین کو ان کی



بے گناہی کا یقین دلایا تھا۔ لہٰذا ان میں سے بھی کچھ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ وہ لمحہ ہمارے لئے بہت دل آفرین تھا جب میں اور سعید آنٹی اور اسماعیل انکل کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے کر آئے۔ گھر آتے ہی سب نے اللہ تعالیٰ کے حضور باجماعت شکرانے کے نفل پڑھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ آنٹی شمشاد اور انکل اسماعیل کچھ بجھے بجھے نظر آ رہے تھے اور چپ چپ سے تھے۔ ہم نے یہی سمجھا کہ پیش آمدہ منفی حالات کا ان پر اثر ہے اور یہ زخم وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی مندمل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ دونوں بیچارے اندر ہی اندر کون سے اہم فیصلے کی تپش میں سلگ رہے تھے جس پر نا چاہتے ہوئے بھی مجبوراً وہ عمل کرنا چاہتے تھے۔

وہ دونوں کچھ عرصہ تو ہمارے پاس رہے، پھر اپنے جناح اسکوائر والے مکان میں چلے گئے۔ اسکول تو بند بلکہ ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ اب گھر ہی میں زیادہ رہ کر اپنا وقت گزارتے۔ میں اور احمد سعید اب ہر ممکن ان کا دل بہلانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے لیکن باوجود اس کے ان بیچاروں کے چہروں پر پہلے جیسی بشاشت نہیں لوٹا سکے۔ وہ دونوں کسی ایسے سہمے ہوئے بچے کی طرح نظر آ رہے تھے جنہوں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو اور اب تک اس کے منفی اثرات سے نہیں نکل پائے ہوں۔ بالآخر میں اور سعید نے اس کا یہی حل سوچا کہ انکل اور آنٹی کو پہلے والی روٹین کو بحال کرنا چاہئے، تاکہ مصروفیت میں ان کا موڈ چینج ہو۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہم نے انکل اور آنٹی سے بات کرنے کا ارادہ کیا اور پھر سب سے پہلے سعید نے آغاز کرتے ہوئے انکل سے کہا۔ "انکل لگتا ہے آپ اور آنٹی نے اس بات کا اثر کچھ زیادہ ہی دل پر لے لیا ہے۔ فار گاڈ سیک انکل! اب اگنور کر دیں یہ سب، ہمارا اسکول اب بھی دوبارہ چل سکتا ہے؟ آپ اسے ایک بار پھر کھولیں۔"

سعید کی بات پر میں نے بھی لب کشائی کرتے ہوئے ان کی ہمت بندھائی۔

"انکل! سعید درست کہہ رہے ہیں...... ہمیں بھلانا ہو گا جو ہوا سو ہوا...... ہمیں پھر سے اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہئے۔" میری بات پر انکل اسماعیل بے دلی سے مسکرا کر رہ گئے تھے جبکہ آنٹی کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی اور وہ کمزور سی آواز میں بولیں۔

"نہیں ہرگز نہیں اب اسکول دوبارہ کبھی نہیں کھلے گا۔ میں دوبارہ اپنے بچوں کو کسی

گھناؤنی سازش کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتی۔"

"لیکن آنٹی اس میں آپ لوگوں کا تو کوئی قصور نہ تھا۔" میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی آنٹی درمیان میں بول اٹھیں۔

"نہیں بیٹی! یہ سب ہوا تو بہر حال ہماری وجہ سے ہی تھا۔ تم جانتی ہو اچھی طرح کہ اسکول کے بچوں کو میں اپنے ہی بچے سمجھتی تھی۔ مجھے تو اب بھی اسکول کے خالی کمروں میں معصوم بچوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے آنٹی بری طرح سسک پڑی تھیں۔

ماحول میں چند ثانیے سوگواری پھیل گئی تھی۔ پھر معاً ہی انکل نے ایک دھماکہ کیا وہ بولے۔ "میں نے اور شمی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ اسکول یہ گھر فروخت کر دیا جائے۔"

"کک...... کیا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔" احمد سعید چونک کر حیرت سے بولے۔ میں بھی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔

"ہاں بیٹا! ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس مکان کو فروخت کر دیا جائے اور ہم اب اس ملک میں رہنا بھی نہیں چاہتے...... ہم نے مستقل طور پر کینیڈا شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" آنٹی نے بھی گویا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

میں اور سعید ایک دوسرے کی طرف حیرت آمیز نگاہوں سے تکنے لگے...... پھر ہمارے منہ سے بیک وقت نکلا۔ "یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں بچو! اگر تم دونوں ہمیں خوش اور زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ہمیں اپنے ارادے سے منع نہیں کرو گے۔" انکل نے ہم دونوں کی طرف اداس نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور جانے کیا بات تھی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بیٹی! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔" آنٹی نے بمشکل یہ الفاظ کہے اور میں بے اختیار آگے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ گئی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"نہیں میری بچی! تم اس طرح آنسوؤں کی زنجیر پہن کر کیا ہمیں زندہ درگور کرنا چاہتی ہو۔" ان کے لہجے میں ایک محبت آمیز شکوہ تھا وہ پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ احمد سعید تو جیسے اپنی جگہ پتھر کے بن کر رہ گئے تھے...... ان سے کچھ بولا



ہی نہیں جا رہا تھا، پھر یوں ہوا اس رونے سسکنے میں وہ کڑا لمحہ بھی آن پہنچا، جب آنٹی نے نہ صرف اسکول سمیت اپنا مکان بھی بیچ ڈالا بلکہ ہمیشہ کے لئے کینیڈا جانے کے لئے رخت سفر ہوئے وہ بڑا رقت آمیز منظر تھا جب میں اور احمد سعید آنٹی اور انکل کو اشکبار آنکھوں سے ایئر پورٹ رخصت کرنے آئے اور جہاز پر سوار ہونے سے ذرا ہی دیر پہلے آنٹی نے مجھے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا کہ "ارے پگلی! ہم کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہے۔ آتے رہیں گے تم سے ملنے بلکہ ہمارے لئے ننھے منھے اور جیتے جاگتے کھلونے تیار رکھنا۔ جو ہمیں نانا، نانی کہہ کر پکاریں۔"

میرا دل کٹ کر رہ گیا...... مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس کے بعد آخری بار ہم لوگ ایک دوسرے سے گلے ملے۔ کچھ آنسو بہائے کچھ وعدے لئے، کچھ شکوے کئے اس کے بعد ظالم فاصلوں نے ہم لوگوں کے بیچ طویل خلیج حائل کر دی۔ میں مبہوت سی ہو کر جہاز کو آسمان کی پہنائیوں تک دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ ایک نکتے کے برابر رہ گیا تو بعد اصرار احمد سعید مجھے سنبھالے ٹیکسی میں گھر لے آئے۔ بے شک میرا ان لوگوں سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا...... لیکن تقدیر نے ہمیں ایسی مضبوط ڈور سے باندھے رکھا تھا جسے جذبۂ انسانیت کہتے ہیں اور جو میرے لئے بلاشبہ ہر رشتے ہر تعلق سے بڑھ کر ہی عزیز تھا۔ دل اب ہر طرح کی سختیاں اور دکھ جھیلنے کا عادی سا ہو کر رہ گیا تھا اور یوں اپنوں کی جدائی کا یہ داغ بھی ہم نے سہہ لیا۔

اب ہماری توجہ پوری طرح سے ننھی سعدیہ پر ہی مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ احمد سعید اب سعدیہ کو ہی اپنی اولاد سمجھتے تھے اور اس کے مستقبل کے لئے بھی اتنے ہی فکر مند رہتے تھے جتنی کہ میں۔ میں نے مکمل طور پر اب گھر داری سنبھال لی تھی اور خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی خاطر شام میں محلے کے بچوں کو بھی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا وقت اپنی دکھی چال کے ساتھ رواں دواں تھا، لیکن زندگی کو شاید ابھی اور امتحان مقصود تھے۔ اس کا خراج شاید ابھی باقی تھا...... زندگی اپنے سینے میں کٹھور وقت کی غم آمیز حسرتوں کا بوجھ دبائے گزر رہی تھی اور ادھر سعدیہ بھی تیزی سے اپنی عمر کی منازل اور اپنے تعلیمی مدارج تیزی کے ساتھ طے کرتی جا رہی تھی۔

احمد سعید نے اسے اتنی محبت اور شفقت دی تھی کہ وہ اس کو ہی اپنے حقیقی باپ کی

جگہ سمجھتی تھی۔ اگرچہ اس کے بچپن ہی سے ناپختہ مگر حساس معصوم سے ذہن میں اپنے باپ کے متعلق کئی سوال گردش کرتے رہتے تھے، لیکن وقت نے اسے باشعور ہوتے ہی بہت کچھ سکھا اور سمجھا دیا تھا۔ پھر انہیں دنوں مجھ پر کوئی زیادہ ہی افسردگی اور قنوطیت کے دورے پڑنے لگے اور حد سے زیادہ میں خود کو انجان سے دکھ میں گھلتا محسوس کرنے لگی تو میں نے اس کا علاج یہ نکالا کہ خود پر بیتے ہوئے حالات و واقعات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کا ارادہ کیا گو یہ واقعات میرے ماضی سے متعلق تھے لیکن میں اسے اپنا اعتراف نامہ بھی سمجھتی تھی۔ میں نے ایک خاصی موٹی سی فیروزی ڈائری میں اپنے ماضی کے حالات ایک داستان کی صورت رقم کرنا شروع کر دیئے تھے۔ تقریباً روزانہ میں ڈائری کے چار پانچ اور کبھی اس سے زیادہ بھی صفحات لکھ لیتی۔ میری بیٹی سعدیہ میری دوست اور ہمراز بھی تھی۔ اسے میں نے کبھی ڈائری پڑھنے سے نہیں روکا تھا۔ درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتی تھی...... وہ اب چونکہ شعور کی منزل تک پہنچ چکی تھی اس لئے ان حالات کی جان کاری اس کے لئے ضروری تھی تاکہ اس کا ذہن بھٹکنے نہ پائے اور برے بھلے کی تمیز کے دوران اسے آئندہ اپنی زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا رہے۔ یوں تو اس کا ارادہ ٹیچنگ لائن اختیار کرنے کا تھا لیکن پھر اچانک اس نے وکالت کے شعبے میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھ پر بیتے ہوئے حالات و واقعات نے اس نرم و نازک لڑکی کو اندر سے شعلہ جوالہ بنا کر رکھ دیا تھا، اور آخر ایک دن اس نے باقاعدہ اپنے خفیہ عزائم کا میرے روبرو اظہار کر ڈالا۔

"امی جان! مجھے آپ کی بیٹی ہونے پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ آپ نے جس کٹھن حالات میں خود کو مبتلائے کرب رکھتے ہوئے اور مجھے اس کرب کی پرچھائیں تک سے محفوظ کرتے ہوئے میری پرورش کی وہ بے مثال ہے، مگر امی جان! معاف کرنا آپ کی زندگی کو جس شخص نے مصائب و آلام سے دوچار کیا میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی...... میں اسے اپنی بدنصیبی اور شرمندگی ہی سمجھوں گی کہ میں ایسے فریب کار شخص کی بیٹی ہوں اور وہ شخص میرا باپ ہے، لیکن امی پلیز میرے نام کے ساتھ میری ولدیت واثق علی کی بجائے احمد سعید رہنے دیجئے گا۔ کیونکہ اس شخص نے مجھے باپ سے بڑھ کر پیار دیا ہے۔"



بیٹی کی اس بات پر میں نے غم آمیز خاموشی اختیار کر لی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ میری بچی اب بچی نہیں رہی۔ وہ فولاد میں ڈھل چکی ہے۔ جانے کیوں مجھے طمانیت کا احساس ہوا لیکن اس وقت میں بالکل دنگ رہ گئی جب سعدیہ نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور سیاہ گاؤن پہنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح تن کر میرے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔ "امی جان! میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں وکالت کا شعبہ اختیار کروں گی۔ لیکن اس وقت مجھے آپ قانون کے جس لبادے میں دیکھ رہی ہیں وہ سراپا عزم ہے۔ ایک ایسا عزم جس نے ایک مظلوم اور وفا کی پیکر عورت کو ایک نہ ایک دن انصاف دلانا اور اسے اس کا حق واپس دلانے کی ٹھان رکھی ہے اور ساتھ ہی اس شخص کو قرار واقعی سزا دلانے کے لئے کٹہرے تک کھینچنے کا ارادہ بھی شامل ہے جس نے اپنی وفا شعار، نیک سیرت اور معصوم بیوی کے حقوق غصب کر کے اسے اس وقت اپنے در سے دھتکار دیا جب وہ نازک دور سے گزر رہی تھی۔"

سعدیہ کا لہجہ بھر آیا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی مالائیں جھلملا گئیں۔ میرا دل لرز کر رہ گیا اور میں بے اختیار آگے بڑھی اور اسے گلے سے لگا لیا۔

"بس کر میری بچی! بھول جا جو ہوا سو ہوا" میں نے پیار سے اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ لیکن پھر بھی اس کے عزم کی تابناکی ماند نہ پڑی۔ وہ مجھے اپنے باپ یعنی میرے سابقہ شوہر واثق علی سے وہ سب روپیہ بینک بیلنس اور جائیداد واپس دلانا چاہتی تھی جو اس نے دھوکے سے اپنے نام کروا کر مجھے دربدر ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میری بیٹی چونکہ حق کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس لئے میں نے اسے نہیں روکا تھا...... بلکہ اس کی کامیابی کے لئے ہر سمے دعا گو رہتی تھی۔ پھر اس دوران تقدیر نے مجھے ایک آخری سانحے سے بھی دوچار کر ہی دیا۔ احمد سعید میرے اور میری بیٹی کے ساتھ شفاف اور پرشفیق سائبان کی طرح بے داغ زندگی گزار کر بالآخر ایک دن ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

حالات کی پھر کچھ ایسی ہوا چلی کہ دھیرے دھیرے داستانوں کے سب کردار ہماری زندگی سے دور ہوتے چلے گئے، جو میرے ماضی کے سچے رفیق اور مونس و غم خوار تھے، لہٰذا آخر میں سدھوری بھی اپنے شوہر اور بچوں سمیت کراچی کے بدلتے ہوئے حالات

کے پیش نظر کہیں دوسرے شہر جا بسی اور یوں میری عبرت ناک ماضی کی داستان کا ایک باب بند ہو گیا۔

آمنہ بیگم نے ایک گہری سانس لے کر اپنی فیروزی رنگ کی ڈائری بند کر کے اپنے پہلو میں رکھ دی، ماضی کی بھول بھلیوں سے وہ نکل تو آئی تھیں مگر ابھی تک اس کی اثر پذیری ان پر طاری تھی۔ ان کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی سی جھلملا رہی تھی۔ ان کی ماضی کی داستان آج اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ وال کلاک نے پانچ بجے کا اعلان کیا تو اسی لمحے باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ''شاید سعدیہ بیٹی آ گئی'' آمنہ بیگم خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھیں ڈائری کو احتیاط سے الماری میں رکھا اور دروازہ کھولنے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئیں۔

❁❁❁

''ہا ہا ہا چھوکرا! آ گیا تو ٹھیک وقت پر......'' دادو کو ٹھیک رات کے وقت اپنی اوطاق میں دیکھ کر زمیندار اختیار علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے رعونت سے کہا۔

اس وقت زمیندار کے علاوہ کمدار مولا بخش اور ایک خاکستری چہرے والا دبلا پتلا شخص بھی موجود تھا جو دادو کے لئے بالکل اجنبی تھا، زمیندار اختیار علی سامنے ایک بڑے سے پرانی طرز کے اونچے سرہان والے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، دادو چپ کھڑا تھا۔

''اڑے آ چھوکرا! میرے قریب آ کر بیٹھ۔'' زمیندار اختیار علی نے دادو کو خاموش کھڑے پا کر اشارے سے اپنے قریب بلایا تو دادو آہستگی سے آگے بڑھ کر فرش پر بچھی دری پر بیٹھ گیا، اس کی نظریں زمین پر گڑھی ہوئی تھیں اور زمیندار کی تیز نظریں اس کے بشرے پر تھیں جبکہ کمدار مولا بخش زمین کی پائنتی بیٹھا اس کے پاؤں دباتے ہوئے اسا کو گھورے جا رہا تھا۔ ذرا دیر ماحول میں گماں آمیز سناٹا چھایا رہا...... اس کے بعد زمیندار اختیار علی کی دوبارہ کھرکھرتی ہوئی آواز گونجی۔ ''تجھے بہت اہم کام کرنا ہے دادو! اگر تو نے میرا یہ کام کر دیا تو تیرا نہ صرف قرضہ معاف ہو جائے گا بلکہ تجھے انعام سے بھی نوازا جائے گا۔'' زمیندار اختیار علی کا لہجہ بڑا پراسرار تھا۔

''جی سائیں حاضر، آپ حکم کریں میں سن رہا ہوں۔'' دادو نے مؤدبانہ انداز میں



کہا۔ تاہم اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جانے اس بار زمیندار اسے کون سا کام سونپنے والا ہے۔

''وڈیرے حاجی ارسلان کا نام تو تُو نے سنا ہو گا وہی جس سے ہماری کتا جنگ ہوتی ہے۔ تو نے اس کے پاس جا کر چاکری کرنی ہے۔'' زمیندار نے کہا اور دادو اس کی بات پر ذرا چونکا، وڈیرے ارسلان کا نام اس کے لئے اجنبی نہیں تھا اسے کتے لڑانے کا بہت شوق تھا اور اس کے لئے وہ بڑی بڑی شرطیں لگایا کرتا تھا اکثر اس کے کتے جیت جاتے تھے۔ اس جنگ میں آس پاس کے گوٹھوں کے بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے حصہ لیا کرتے تھے۔ زمیندار اختیار علی بھی حصہ لیتا تھا۔

''ہا بابا! کیا سوچ رہا ہے تو پھر۔'' اسے خاموش پا کر زمیندار اختیار علی نے گونجیلی آواز میں کہا۔

دادو ذرا چونکا پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''سائیں! میں تو وڈیرے ارسلان کے پاس چاکری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پر مجھے وہاں ملازم رکھوائے گا کون؟ اور...... اور میں نے وہاں کرنا کیا ہے؟''

''شاباش چھوکرا! یہ ہوئی نا سمجھ داروں والی بات۔'' زمیندار نے توصیفی لہجے میں کہا اور پھر بتانے لگا۔ ''وڈیرے ارسلان کے ہاں تجھے یہ چاکری دلوائے گا، اس کا نام پنو ہے۔'' زمیندار نے قریب ہی بیٹھے خاکستری چہرے والے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''ویسے تو یہ وڈیرے ارسلان کا خاص آدمی ہے۔ پر نمک ہمارا کھاتا ہے۔ سمجھ رہا ہے ناں تُو ڑے چھوکرا!'' زمیندار نے دادو کو پھر متوجہ کیا اور دادو نے بوکھلا کر اپنا سر ہلا دیا۔ وہ یہ جان تو گیا تھا کہ یہ خاکستری چہرے والا شخص وڈیرے ارسلان کا غدار حواری ہے، لیکن آخر اسے کام کیا سونپا جانے والا تھا۔

دادو بری طرح الجھا ہوا تھا اور مزید یہ کہ وہ سر دست اس سلسلے میں استفسار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا درحقیقت وہ زمیندار کو اپنی وفاداری کا پورا پورا یقین دلانا چاہتا تھا اسی لئے وہ اس کی ہر بات پر ''جی سائیں! حاضر سائیں!'' کہے جا رہا تھا۔ آخر میں جب زمیندار اختیار علی اپنے پلنگ سے اٹھا تو پنو بھی ہاتھ جوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی تقلید دادو نے بھی کی تھی۔

زمیندار نے معنی خیز مگر براتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے اس کے کاندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ دھرا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا...... ''ڑے چھوکرا! یہ پنو بہت ہوشیار آدمی ہے۔ یہ پہلے تجھے وڈیرے ارسلان کے گوٹھ لے جائے گا اس کے بعد اپنے گھر میں تجھے یہ باقی کا کام سمجھا دے گا، جوتُو نے وہاں کرنا ہے۔ چل شاباش! اب تم دونوں نکل جاؤ تکڑا، رات کے اندھیرے میں ہی سارا کام نمٹا لو تو اچھا ہے۔ جاؤ اب۔'' زمیندار نے اپنی بات ختم کی تو پنو نے اپنے ساتھ کھڑے دادو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے عقب میں دادو بھی ہولیا اور اوطاق سے باہر نکل گیا۔

باہر رات تاریک تھی۔ چہار سو قبرستان جیسا مہیب سناٹا طاری تھا۔ کہیں دور قریب سے آوارہ کتوں اور گیدڑوں کے رونے چلانے کی منحوس آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پورا گوٹھ سکون کی نیند میں غرق تھا۔ صاف آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی مدھم روشنی میں پنو اور دادو کے آگے پیچھے چلتے ہوئے سائے بڑے پر اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ گوٹھ کی تاریک اور ٹیڑھی میڑھی کچی گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ گندم اور جو کے کھیتوں کے بیچ میں آ گئے۔ پھر کوئی آدھ گھنٹہ سے بھی کم وقت میں وہ زمیندار اختیار علی کے گوٹھ کی حد پار کر کے وڈیرے ارسلان کی دور تک پھیلی ہوئی مکئی گوار پھلی اور چنوں کی لہلہاتی فصلوں سے بھری پری زمینوں میں آ گئے۔ ذرا دیر کھیتوں کی مینڈھ پر چلتے رہنے کے بعد پنو اسے ایک خاصے تنگ و تاریک جھونپڑی نما مکان میں لے آیا۔ دادو ذرا جھجکا اس کے پیچھے چلتا ہوا مکان کی ایک تاریک سی کوٹھڑی میں آ گیا۔ دادو کو ماحول کی پراسراریت بے چین سی کرنے لگی۔ پنو نے نجانے کس طرح ایک لالٹین تلاش کر کے روشن کر دی۔ اس کوٹھڑی میں اب دو جھلنگا سی چارپائی نظر آ رہی تھی۔ دادو نے اندازہ لگایا کہ پنوں یہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔

''چھوکرا! تو تھوڑی دیر ننڈر (نیند) کر لے صبح تڑکے میں تجھے سب سمجھا دوں گا کہ تو نے وڈیرے ارسلان کی اوطاق میں جا کر کیا کہنا ہے۔'' اس کا لہجہ خاصا پر اسرار سا تھا۔ دادو خاموشی سے چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔

❁❁❁



پنو نے علی الصباح دادو کو جگا دیا۔ دادو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور جب وہ اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر چارپائی پر آ بیٹھا تو پنو جست کی ایک سالخوردہ سی چینک میں چائے اور پیالیاں لئے اس کے قریب آ گیا جانے کہاں سے وہ کھارے بسکٹ بھی لے آیا تھا جب دونوں اس مختصر ناشتے سے فارغ ہوئے تو پنو نے اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگائی، پھر دو تین گہرے گہرے کش لے کر اس نے بیڑی دادو کی طرف بڑھائی۔ لیکن دادو نے سر کے ہلکے اشارے سے انکار کر دیا۔

''ابھی چلتے ہیں وڈیرے ارسلان کی اوطاق میں گھبرانا بالکل نہیں سمجھا۔'' پنو نے فضا میں بیڑی کا کثیف اور گدلا دھواں اگلتے ہوئے کہا اور مزید بولا۔ ''ہوسکتا ہے یہ بھی کہ تجھے وڈیرے ارسلان کے سامنے جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس کا خاص ماڑوں (آدمی) ہے ایک رب نواز نام ہے اس کا...... وہی تیرے ساتھ گالھ (بات) کر لے گا۔ اب آخری بات سن میری گور سے۔'' اتنا کہہ کر وہ ذرا تھما۔ اس کا لحہ بہ لحہ پر اسرار ہوتا لہجہ دادو کو بے چین سا کئے دے رہا تھا وہ پھر بولنا شروع ہوا۔ ''ابھی کچھ روز پہلے وڈیرے ارسلان کا کوتی اچانک انتقال کر گیا تھا کوتی سمجھتا ہے... نہیں... اڑے تو بھی ڈھچر ہے سن کوتی کتوں کے رکھوالے کو کہتے ہیں جو ان کی سار سنبھار کرتا ہے۔ اپڑیں کوتی کی اچانک موت پر وڈیرا ذرا فکر مند ہو گیا ہے۔ کیونکہ کچھ ہی دن بعد گوٹھ کا چوکنڈے (چوک) میں میلہ لگنے والا ہے۔ میلہ تو نام کا ہو گا اصل میں تو یہاں کتوں، سوروں اور ریچھوں کی لڑائیاں کرائی جائیں گی۔ وڈیرے ارسلان نے بھی اپنے کتے چھوڑنے ہیں لڑائی واسطے۔ پر کوتی کی اچانک موت نے اسے پریشان کیا ہوا ہے۔ لہٰذا اب اس نے کوتی ڈھونڈنے کی ذمے داری مجھ پر لگائی تھی اور تجھے میں اس واسطے آج وڈیرے ارسلان کی اوطاق لے جا رہا ہوں سمجھ گیا ناں چنگی طرح سے میری گالھ

(بات)؟" اس نے کسی الجھنی میں کھوئے ہوئے دادو کے پُرتفکر چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوکا دیا تو دادو قدرے چونک کر مستفسر ہوا۔ "مگر میں..... میں تو آج تک کتوں کے قریب نہیں گیا۔ بھلا ان کی دیکھ بھال کیا کروں گا مجھے تو اس کام کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"اڑے تجربے کو گولی مار۔" پنو نے بیڑی کے دھویں کی آخری حد تک اپنے پھیپھڑوں میں پہنچنے کے بعد فضا میں اگل کر دادو سے بولا تو اسے کھانسی کا بھی ٹھکا لگ گیا۔

"اڑے بابا! تو نے کتوں کا ساتھ سونا تھوڑی ہے اور نہ ہی ساری زندگی تجھے یہ کام کرنا پڑے گا۔"

وہ کہنے لگا۔ "بس دو ایک روز کی بات ہے، میلے کے دوسرے روز یہ لڑائی شروع ہو گی۔ اس کے بعد تیرا کام ختم...... ویسے میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تجھے سب سمجھا دوں گا۔" اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے اور بیڑی کے ٹوٹے کو دور اچھالتے ہوئے دادو سے کہا۔

دادو بے چارہ عجیب مخمصے کا شکار تھا اور جتنا چاہ رہا تھا کہ زمیندار اختیار علی کا پنو کے ہمراہ یہاں بھیجنے کا پُراسرار معمہ حل ہو...... اتنا ہی معاملہ گمبھیر اور اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتا جا رہا تھا۔

"آخر مجھے اتنے تھوڑے عرصے کے لئے وڈیرے ارسلان کے کتوں کا رکھوالا کس مقصد کے تحت بنایا جا رہا ہے۔ مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے...... یہ اتنی مختصر مدت میں زمیندار اختیار علی کیا کھچڑی پکانا چاہ رہا ہے۔" بالآخر دادو نے قدرے بیزار ہو کر کہا۔

"توں پہلے وڈیرے کے کتوں کو سنبھال میلے سے ایک روز پہلے رات کو میں تیرے پاس آؤں گا۔ چل ابھی میرے ساتھ..... تکڑا..... آ جا۔"

پنو کا لہجہ حد درجہ معنی خیز تھا۔ دادو کے جی میں تو آئی کہ وہ پنو سے ایک دم سب کچھ اگلوا لے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا یہ ارادہ تبدیل کر دیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ پھر وڈیرے کی اوطاق تک پہنچتے پہنچتے پنو نے دادو کو مزید کچھ باتیں سمجھائیں۔ پنو کی بات درست ثابت ہوئی۔ وڈیرا ارسلان اس وقت وہاں موجود نہ تھا البتہ اس کا



مصاحب خاص رب نواز وہاں موجود تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ چہرے مہرے سے وہ خاصا کرخت مزاج نظر آ رہا تھا۔

"کیا نام ہے تیرا چھوکرے؟" اس نے اپنی گھورتی ہوئی نظریں دادو کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"داد محمد نام ہے سائیں میرا۔" دادو نے پنو کے کہنے کے مطابق اپنا عام نام چھپاتے ہوئے بتایا۔

"پہلے بھی شیروں کو سنبھالنے والا کام کیا ہے۔" تیز لہجے میں پوچھا گیا۔

"جج..... جی..... شش..... شیر؟" دادو رب نواز کے منہ سے شیروں کا سن کر ذرا گڑبڑا سا گیا۔ تب پاس کھڑے پنو نے اسے ٹھوکا دیا اور غصیلی سی سرگوشی کی۔ "سائیں کتوں کا پوچھ رہا ہے شکاری کتوں کا۔"

"ہا..... ہا..... سائیں..... اس سے پہلے شہر کے وڈے بنگلوں کے کتے سنبھالتا تھا۔" دادو نے جلدی سے کہا تو رب نواز اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ "اوئے بنگلوں کے کتے تو چوکیداری کے لئے ہوتے ہیں۔ میں شکاری کتوں کی بات کر رہا ہوں جو شیروں کی طرح چیر پھاڑ کرتے ہیں۔"

دادو ایک لمحے کو اس کی بات سن کر سٹپٹا سا گیا..... تو پنو جلدی لقمہ دیتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ "سس..... سائیں..... چند روز کی تو بات ہے ذرا چھوکرے کو آزما لو۔ اگر وڈے سائیں نے آکھیا (کہا) تو میں کسی دوسرے چاکر کا بندوبست کر لوں گا۔ ویسے یہ آپ کے شیروں (کتوں) کی دیکھ بھال کر لے گا۔"

رب نواز نے ایک لمبی "ہوں" کے ساتھ پنو کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور بولا..... "چنگا پھر لے جا اسے فارم اور کام سمجھا دے۔ جاؤ اب....." اس کے کہنے کی دیر تھی کہ پنو دادو کا ہاتھ پکڑے اوطاق سے باہر نکل آیا۔

دادو کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا اسے ایکا ایکی کسی بڑی سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دانستہ کسی بڑے اور گھناؤنے چکر میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے، مگر باوجود اس کے سردست اس نے اپنے لب سی رکھے تھے وہ چپ چاپ پنو کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک بڑے میدان میں آ گیا۔ بھربھری مٹی والے اس

میدان میں اسے ایک دو اونچی عمارتوں کے قریب ہی بڑی سی کچی کوٹھڑی نظر آئی۔ جس کے گرد خاردار باڑ سی لگی ہوئی تھی۔ پنو حیران و پریشان داوو کو اسی کوٹھڑی کے اندر لے آیا۔ یہ کوٹھڑی کا خاصا کشادہ سا صحن تھا...... ایک ناگوار سی تیز بو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ بالکل ویسی جیسی جانوروں کے جسموں سے اٹھتی ہے۔ داوو نے غیر محسوس انداز میں اپنی ناک سکیڑ لی۔ سامنے دائیں طرف ایک بڑے سے کمرے کا دروازہ تھا جو خاصا بڑا تھا۔ وہ اس وقت کھلا ہوا تھا...... اس کی چھت غائب تھی لہٰذا اندر کا نظارہ داوو نے بآسانی کر لیا تھا...... اندر کمرے کی سامنے کی ایک کی دیوار پر بڑے بڑے آہنی کنڈے نصب تھے اور ان کی زنجیروں کے ساتھ چار عدد لمبے تڑنگے اور خونخوار کتے ان دونوں کی طرف دیکھ کر غرانے لگے۔ داوو کو یہ کتے شکاری سے زیادہ جنگلی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی جسامت عام کتوں سے دگنی تھی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ہلکورے لے رہی تھی۔ داوو نے قدرے بوکھلا کر اپنے ساتھ کھڑے پنو سے کہا۔ ''پپ...... پنو...... یہ جنگلی کتے تو مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ میں بھلا ان کی کیسے رکھوالی کروں گا۔''

''اڑے کچھ نہیں کہتے یہ تجھے...... شکر کر کہ یہ صرف چار ہی ہیں جنہیں خاص طور پر میلے کے دن لڑائی کے لئے چنا گیا ہے۔ ورنہ تو یہ پورا کمرہ کتوں سے بھرا رہتا ہے۔'' پنو نے جیسے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ہولے سے اس کا شانہ بھی تھپتھپایا۔ پھر ذرا دیر خاموشی کے بعد پنو نے ماہرانہ انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو داوو محمد! صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ ان کتوں کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں اپنی نظریں مت جمانا۔ ورنہ یہ بھونک بھونک کر اور غرا غرا کر تیرا مغز کھا جائیں گے۔ جب بھی ان کے قریب جائے تو کبڈی...... کبڈی...... کی گردان کی جاتی ہے بالکل اسی طرح انہیں منہ سے بچکارے (پچکارے) دیتے رہنا یہ خاموش رہیں گے۔''

اتنا بتا کر وہ داوو کو پھر باہر اجڑے پجڑے صحن میں لے آیا۔ ایک جگہ دیوار کے کونے میں پکی اینٹوں کا چولہا سا بنا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی چار یا پانچ بڑی بڑی بالٹیاں اور کھلے پیندے والے مٹی کے آب خورے بھی دھرے تھے۔ پنو نے چولہے اور لوہے کی بالٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''صبح تڑکے موگو قصائی آتا ہے



گدھے گاڑی پر بہت سے پھیپھڑے اور گوشت لے کر...... وہ اس سے لے کر ان بالٹیوں میں تھوڑا پانی ڈال کر چولہے پہ چڑھا دینا اور جب اچھی طرح ابال آ جائے تو ان کتوں کے آگے ڈال دینا۔ بس وہ ایک دن کسی نہ کسی طرح گزار لے اور ہاں سن کتوں کو کھولنے کی کبھی کوشش نہیں کرنا۔ میلے کے روز وڈیرہ ارسلان خود اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں آئے گا جو اسے کھول کر اپنے ساتھ لے جاویں گے۔''

پنو نے اپنی بات ختم کی تو داوو الجھے ہوئے لہجے میں قدرے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ میں بات نہیں آ رہی۔ اتنے تھوڑے دنوں کے لئے مجھے یہاں رکھنے کا کیا مقصد ہے آخر۔''

''او چھوکرے! تو آم کھانے سے مطلب رکھ اپنا کام کرنا اور نکل جانا تو گڑتی (فکر) نہ کر میں نے کہا نا...... میلے سے ایک روز پہلے رات کو تیرے پاس آؤں گا۔ چل آ تجھے تیرے رہنے کا کمرہ بھی دکھا دوں، پھر اپنا کام شروع کر دے۔'' پنو نے کہا اور داوو خاموش ہو رہا۔

۞۞۞

باہر تیز ہوائیں بدروحوں کی طرح چیختی چلاتی اپنا سر پٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، بھیدوں بھری تاریک رات دبے قدموں کسی پر اسرار بھاری بھرکم عفریت کی طرح سرک رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اور اخیر راتوں کے چاند کی مدھم روشنی پورے گوٹھ کو ٹھنڈی طلسماتی چاندنی میں لپیٹے ہوئے دھیمے دھیمے لوری دیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں ایک سایہ اجرک کی بکل مارے وڈیرے ارسلان کے فارم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے دیکھ لئے جانے کا ڈر ہو۔ وہ اب فارم کے احاطے میں آ گیا تھا۔ پھر قریب ہی کی بڑی سی کوٹھڑی نما بوسیدہ سی عمارت میں گھس گیا۔ یہاں مدھم سی روشنی تھی، جو قریب میں بنے ایک چھوٹے سے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ غڑاپ سے اندر گھس آیا۔ یہ پنو تھا جو حسب وعدہ میلے سے ایک روز قبل رات میں داوو سے ملنے آیا تھا۔ داوو قریب ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا لہٰذا پنو کے در آتے ہی ایک دم اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"میں ہوں پنو!" پنو نے اجرک اتار کر اپنا نام بتایا۔ پھر دادو کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا اور محتاط لہجے میں بولا۔ "داد محمد! بابا ہوشیار ہو جا تیرے کام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔" دادو بے چارہ اس کے پر اسرار لہجے پر پہلے تو ذرا گھبرا سا گیا پھر جواباً سرگوشی میں بولا۔ "ہاں بول کیا کرنا ہے۔" دادو کی بات سن کر پنو نے جلدی سے اپنی جیب سے کپڑے کی ایک میلی سی چھوٹی پڑیا نکالی اور اسے دادو کو تھماتے ہوئے بولا۔ "اسے سنبھال اور میری بات ذرا دھیان سے سن۔" دادو ہمہ تن گوش ہو گیا البتہ وہ پوٹلی اس نے اپنی گود میں رکھ لی تھی۔

پنو سرگوشی میں بتانے لگا۔ "دیکھ داد محمد! کام بہت آسان ہے، مگر ہوشیاری سے کرنا اس پوٹلی میں ایک بوٹی ہے اس میں سے آدھی بوٹی صبح تڑکے ان چاروں کتوں کو پانی میں گھول کر پلا دینا۔ اس کا اثر گھنٹے بھر بعد ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا۔ پھر جب وڈیرے ارسلان کے آدمی ان چاروں شکاری کتوں کو اپنے ساتھ میلے کے ایک میدان میں لے جائیں گے۔ جدھر زمیندار اختیار علی بھی اپنے کتوں کے ساتھ موجود ہو گا۔ دونوں وڈیروں کے کتوں کی آپس میں جنگ ہو گی...... تو اس عرصے میں پوٹلی میں بچی کھچی بوٹی کسی طرح وڈیرے کے کپڑوں میں رکھ دینا۔ اس کے بعد تیرا کام ختم ہو جائے گا اور تو وہاں ایک منٹ کے لئے بھی نہ رکنا اور کہیں بھاگ جانا سمجھا۔" پنو تفصیل بتا کر خاموش ہوا تو دادو اس کی صراحت بھری گفتگو سن کر پریشان سا ہو گیا اور قدرے سہمے ہوئے لہجے میں پنو سے بولا۔

"پنو! ذرا کھل کر تو مجھے بتا یہ کیا چکر ہے سارا تا کہ میں اپنا کام صحیح طریقے اور ہوشیاری سے نمٹا سکوں۔"

پنو اس کی بات سن کر چپکا بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "لگتا ہے تجھے ساری بات بتانا ہی پڑے گی۔ لے سن...... زمیندار اختیار علی دراصل وڈیرے ارسلان کو مروانا چاہتا ہے یہ جو بوٹی ہے ناں...... جو تُو وڈیرے ارسلان کے شکاری کتوں کو کھلائے گا وہ انہیں بدمست کر دے گی پھر جب تو یہی باقی کی آدھی بوٹی نہایت ہوشیاری سے وڈیرے ارسلان کے کپڑوں میں رکھ دے گا یا مل دے گا تو وہ بدمست کتے ارسلان پر چڑھ دوڑیں گے اور پل بھر میں اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔"



دادو پنو کی بات سن کر سرتاپا لرز اٹھا۔ "لل...... لیکن...... زمیندار سائیں! وڈیرے ارسلان کو کیوں مروانا چاہتا ہے۔"

"اڑے بابا! ہو گی آپس میں کوئی پرانی دشمنی ہمیں کیا؟ ہم کو چھوکرا آم کھانے سے مطلب رکھنا ہے۔" پنو نے جواباً جھٹکے دار لہجے میں کہا، اور دادو گم صم سا ہو گیا...... لمحہ بھر بعد پنو دوبارہ گم صم اور الجھے ہوئے دادو کے متفکر چہرے پر اپنی چندی سی آنکھیں جماتے ہوئے بولا۔ "اڑے بابا! سمجھ گیا نا چھوکرا اب میں تسلی کے ساتھ جاؤں میرا یہاں زیادہ رکنا صحیح نہیں اور ہاں خیال رکھنا ہے یہ نصف مقدار میں بوٹی کتوں کو کھلانے کے بعد گھنٹے کے اندر اندر ہی وڈیرے ارسلان کے کپڑوں میں چھپا دینا۔ ورنہ بدمست کتے تجھ پر چڑھ دوڑیں گے...... چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر پنو کوٹھڑی سے نکل گیا۔

ادھر دادو اپنی جگہ چارپائی پر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ اس کے بشرے سے اب ذرا بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ کچھ دیر قبل پنو سے مخاطب رہنے والا ڈرا سہما دادو وہی شخص ہے جو چار و ناچار یہ خطرناک کام کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ جیسے ہی پنو رخصت ہوا دادو کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے اب وہاں ایک ابال اور تپش کی کیفیت عود کر آئی تھی۔

زمیندار اختیار علی کے گھناؤنے عزائم سے آگاہ ہوتے ہی دادو کا پورا وجود غصے اور جوش سے سلگ اٹھا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ زمیندار اختیار علی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا ہے۔ وڈیرے ارسلان سے تو اپنی کوئی پرانی دشمنی نکال رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کا پتہ بھی صاف کرنا چاہتا تھا، جس کا ثبوت زمیندار کی اس گھناؤنی سازش سے عیاں تھا کہ جب دادو اختیار علی کی بات پر عمل کرتے ہوئے وڈیرے ارسلان کو اسی کے شکاری کتوں سے مروا کر فرار کی راہ لے گا تو کیا ارسلان کے آدمی اسے زندہ چھوڑ دیں گے۔ دادو کو اندازہ تھا، اچھی طرح کہ وہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ دادو جتنا عیار زمیندار اختیار علی کی اس گھناؤنی چال کے خفیہ عوامل پر غور و خوض کرتا چلا جا رہا تھا اتنا ہی اس پر کچھ ماضی کے حوالے سے بھی انکشاف ہونے لگے تھے۔ جس سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ زمیندار اختیار علی کے دل میں ابھی تک اس کے خلاف بغض کم نہیں ہوا تھا...... وہ ہنوز اس سے خائف تھا۔ جبھی اس نے اس کے

ذریعے ایسی سازش تیار کی تھی، مگر یہ وہ سب باتیں تھیں جن کا دادو کو بہر حال پہلے ہی کچھ ادراک ہو چلا تھا کہ زمیندار اختیار علی کسی نہ کسی طرح اس کا پتہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ لیکن دادو اپنے سینے کے سلگتے آتش فشاں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے عزم مصمم کر بیٹھا تھا کہ وہ زمیندار اختیار علی سے معصوم اور بے گناہ سسی کا بدلہ ضرور لے کر رہے گا۔ نیز اس نے ایک چھوٹے سے قرض کی بناء پر جو ستم اس کے ماں باپ پر کیا اور چالاکی اور دھوکے سے زمین ہتھیائی اس کی بھی سزا اسے دے کر رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ کم از کم زمیندار اختیار علی کے آدمی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

باہر تاریک رات اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی اور اس کے دل میں ایک منصوبہ بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اس نے آہستگی سے پنو کی دی ہوئی پوٹلی کھول کر دیکھی تو اسے کتھئی رنگ کی ایک آٹے جیسی گندھی ہوئی بوٹی نظر آئی۔ اس نے بو سونگھی تو اسے حیرت ہوئی کہ وہ کسی بھی قسم کی بدبو سے عاری تھی۔ بہرطور اس نے پوٹلی دوبارہ بند کر کے رکھ لی۔ وہ اب سونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نے صبح تڑکے وڈیرے ارسلان کے آدمیوں کے پہنچنے سے پہلے اس میں سے نصف بوٹی اس کے شکاری کتوں کو کھلانی تھی۔

❁❁❁

صبح ہو چکی تھی اور وڈیرہ ارسلان بذات خود اپنے حواریوں کے ساتھ اپنے چاروں شکاری کتوں کو لے جا چکا تھا۔ ان کے جاتے ہی دادو بھی اس مقام تک جا پہنچا تھا جدھر میلے کی رونقیں عروج پر تھیں۔ مگر دادو کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اب چھپتا چھپاتا ایک ایسے کھلے میدان کی طرف آ گیا تھا جہاں لوگوں کا ایک انبوہ کثیر موجود تھا۔ یہاں مختلف گوٹھوں کے وڈیرے زمیندار اپنے چھوٹے چھوٹے پنڈال سجائے بڑے کروفر کے ساتھ موجود تھے۔ ان میں ایک جانب وڈیرہ ارسلان اور زمیندار اختیار علی بھی اپنے اپنے پنڈالوں کے سائبان تلے سرکنڈوں کے مونڈھوں پر براجمان اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے۔ یوں تو میدان کے بیچوں بیچ رن پڑ چکا تھا اور مختلف حریفوں کے خونخوار جانوروں کی لڑائی شروع ہو چکی تھی، مگر اصل مقابلہ وڈیرے ارسلان اور زمیندار اختیار علی کے بیچ ہونا تھا۔

پہلے پانچ کتوں اور ایک ریچھ کے درمیان خون ریز جنگ شروع ہوئی، جس میں



ریچھ نے لہولہان ہوتے ہوئے بھی تین کتوں کو بری طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ پھر اس کے بعد جب مزید تین کتوں اور ایک جنگلی سور کا مقابلہ اختتام کو پہنچا تو پھر وڈیرے ارسلان کے شکاری کتوں اور زمیندار اختیار علی کے کتوں کا مقابلہ شروع ہوا۔

دونوں طرف کے کتوں کی تعداد برابر تھی۔ مجمع میں گویا شور سا مچ گیا۔ وڈیرے ارسلان اور زمیندار اختیار علی کے حواری بڑھ چڑھ کر اپنے اپنے کتوں کو ہشکاری اور ہلاشیری دے رہے تھے۔ دادو ایک جانب دبکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ عجیب احساس جوش تلے تمتما رہا تھا۔ اسے مجمع کی ہلڑ بازی سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ اپنا نصف ''کام'' انجام دے چکا تھا، لیکن پنو کی تاکید کے مطابق اس نے صبح تڑکے ہی وڈیرے ارسلان کے چاروں شکاری کتوں کو وہ بوٹی پانی میں گھول کر پلا دی تھی اور اب باقی نصف اس کے پاس محفوظ تھی۔ جسے اس نے وڈیرے ارسلان کے کپڑوں میں نہایت ہوشیاری سے مل دینی تھی لیکن دادو وہ باقی کی نصف بوٹی بجائے ارسلان کے کپڑوں میں لگانے کے زمیندار اختیار علی کے کپڑوں پر ملنا چاہتا تھا تاکہ وڈیرے ارسلان کے بدمست کتے بجائے اسے چیر پھاڑ کرنے کے زمیندار اختیار علی کو ہلاک کر ڈالیں۔ دادو اب اس بات پر نہایت مسرت سی محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے تقدیر نے ظالم اختیار علی کو سزا دینے کا بڑا اچھا موقع دیا ہے اور وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائے گا اور اختیار علی کی چال اس پر ہی الٹ دے گا۔

کسی نے درست ہی کہا ہے کہ جو کسی دوسرے کے لئے گڑھا کھودتا ہے وہ خود ہی گر جاتا ہے۔ زمیندار اختیار علی نے وڈیرے ارسلان کے لئے گڑھا کھودنا چاہا مگر اب اس میں وہ خود گرنے والا تھا۔ کیونکہ دادو اب بوٹی کا باقی ماندہ سفوف اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبائے دھیرے دھیرے زمیندار اختیار علی کی پرشور پنڈال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سامنے میدان میں شکاری اور جنگلی کتوں کی لڑائی زور و شور سے جاری تھی۔ لوگ ہلڑ بازی اور ہلا شیری کرتے ہوئے بے پناہ شور مچا رہے تھے۔ خود اختیار علی بھی مقابلے کے جوش میں عام آدمیوں کے درمیان جیسے پھنس سا گیا تھا۔ دادو کو ایسا ہی موقع درکار تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اجرک میں چھپا رکھا تھا۔ اس کا دل اپنے کام کو جلد سے جلد انجام تک پہنچانے کے احساس جوش تلے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنا

کام اب جلدی نمٹا دینا چاہتا تھا...... کیونکہ دادو جانتا تھا کہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد بوٹی شکاری کتوں پر اپنا خطرناک اثر دکھانا شروع کر دے گی اور وہ پاگل ہو جائیں گے اور بقیہ نصف بوٹی کی بو پر وہ وحشتناک ہو کر اس کی تلاش میں دوڑ پڑیں گے۔ لہٰذا اب باقی کی نصف بوٹی دادو کی مٹھی میں تھی۔ وہ اسے اب وڈیرا ارسلان کی بجائے زمیندار اختیار علی کے کپڑوں پر جلد سے جلد لگا کر بھیانک انجام کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔
وڈیرے ارسلان کے کتوں کو پاگل ہونے میں بس اب ذرا ہی دیر تھی اور دادو جلدی جلدی نہایت ہوشیاری سے زمیندار اختیار علی کے پُر شور اور پُر ہجوم پنڈال میں آ گیا۔ پھر لوگوں کے درمیان پھنستا پھنساتا ہوا زمیندار اختیار علی کے عقب میں ملک الموت کی طرح نمودار ہوا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے بڑی ہوشیاری سے زمیندار اختیار علی کے کپڑوں میں بوٹی مل دی اور واپس گھوم کر دوسری طرف کے مجمع میں آ کر کھڑا محو تماشا ہو گیا۔

زمیندار اختیار علی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ جو خطرناک بساط اس نے وڈیرے ارسلان کے خلاف بچھائی تھی وہ اب اس پر الٹ دی گئی تھی۔ زمیندار اختیار علی اپنے تئیں وڈیرے ارسلان کے انجام کا نظارہ کرنے کے لئے اپنے مجمع سے ذرا باہر نکلا۔ سامنے ہی وڈیرہ ارسلان بھی اپنے حواریوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں کبھی ایک دوسرے کے نخوت بھرے چہروں پر گڑسی جاتیں تو کبھی درمیان میں لڑتے کتوں پر مرتکز ہو جاتیں۔

دادو نے نہایت ہوشیاری سے زمیندار اختیار علی کے کپڑوں سے اپنی مٹھی میں پکڑی ہوئی بوٹی مل دی اور فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ دل تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ وہ یہیں کھڑا ہو کر زمیندار اختیار علی کا بھیانک انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن پنوں نے اسے سختی سے متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اپنا کام کرنے کے بعد وہ فوراً اس جگہ سے کئی میل دور نکل جائے...... کیونکہ وہ بوٹی اتنے خطرناک اثرات رکھتی تھی کہ اگر شکاری کتوں کو ذرا بھی اس کی بو محسوس ہو جاتی تو وہ دادو کو بھی چیر پھاڑ سکتے تھے۔ لہٰذا دادو اپنا کام کرتے ہی وہاں سے فوری رفو چکر ہو گیا۔ اسے اب زمیندار کے عبرتناک انجام کا انتظار تھا جس کی خبر کوئی دم کو اسے ملنے والی تھی۔ تاہم اس کے دل میں یہ خدشہ بھی سر



ابھار رہا تھا کہ اگر زمیندار اختیار علی پاگل کتوں کے خونیں حملوں سے بچ گیا تو یقیناً وہ سمجھ جائے گا کہ اس کی چال کو اس پر الٹنے والا کون ہو سکتا ہے۔
لیکن دادو بھی انہی گوٹھوں کی فضاؤں میں پلا بڑھا تھا، وہ ایسی جادو اثر بوٹیوں کے اثرات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس بوٹی کو کھانے کے بعد اس کتے میں اس بوٹی کو مزید نہ صرف کھانے کا جنون سوار ہو جاتا ہے بلکہ اسے میلوں تک اس بوٹی کی بو آتی ہے اور وہ پل بھر میں دوڑتا ہوا اس تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔
دادو اپنے گھر کی کوٹھڑی میں کھری چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ اس وقت اکیلا تھا۔ اس کے ماں باپ غالباً ماما وسایا کے ساتھ حسب معمول "ڈیرے" پر گئے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک ماما وسایا ہاتھ میں گڑگڑی تھامے حواس باختہ اندر داخل ہوا۔
"اڑے چھوکرا! بابا قہر ہو گیا۔" وہ اپنے بھانجے دادو کو قریبی چارپائی پر لیٹے پا کر بلند آواز میں بولا تو دادو یکدم ٹھٹھک کر اٹھ بیٹھا۔
"کیا ہوا ماما! خیر تو ہے۔" اس نے ماما وسایا کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اڑے گھوڑا اڑے! اپڑیں سائیں وڈے کو وڈیرے ارسلان کے شکاری کتوں نے مار ڈالا۔" ماما وسایا نے بتایا تو دادو کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ تاہم وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ "کک...... کیا...... کہہ رہے ہو ماما۔"
"ہاؤ بابا سچ کہہ رہا ہوں...... ادھر میدان میں ہاہا کار مچ گئی ہے اور پورا گوٹھ رو رہا ہے۔ لگتا ہے اب اس گوٹھ پر جنگ کے بادل چھانے والے ہیں۔" ماما چند ثانیے اپنی پھولی سانسوں پر قابو پانے کے بعد دوبارہ بتانے لگا۔ "سائیں اختیار علی کے مرتے ہی اس کے آدمیوں نے مشتعل ہو کر وڈیرے ارسلان کے چاروں شکاری کتوں کو گولیوں سے بھون دیا، پھر تو جیسے قہر ہو گیا۔ جکھرانیوں نے سیدھے فائر کھول دیئے بابا! دونوں دھڑوں میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی، جس میں جکھرانیوں کے بھی کچھ ماڑوں (آدمی) پھٹی (زخمی) ہوئے اور ایک موقع پر مر گیا۔ اپڑیں زمیندار اختیار علی کا خاص آدمی مولا بخش بھی جکھرانیوں کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ بس اب تو مرشد سائیں خیر کرے...... یہاں سے تو اب ہمیں کوچ کرنا پڑے گا۔" آخر میں ماما وسایا اپنا ماتھا پیٹتے

ہوئے چارپائی پر گر سا گیا جبکہ دادو کی سماعت میں اس پوری روداد کی تفصیل اترتے ہی اس نے ایک گہری اور طمانیت بھری سانس خارج کی اور زمیندار اختیار علی کی ہلاکت کے ساتھ ساتھ اس کے ''گماشتے'' مولا بخش کی جکھرانیوں کے ہاتھوں موت کا سن کر بے اختیار اس کے دل سے ''خس کم جہاں پاک'' جیسے الفاظ نکلے تھے۔ وہ جانتا تھا جنگ کے یہ بادل عارضی ہیں، پھر سب کچھ معمول پر آ جائے گا اور اس عارضی جنگ کے بعد ظلم و جبر کے وہ بادل بھی چھٹ جائیں گے۔ جنہوں نے ایک عرصے سے سینکڑوں غریب ہاریوں کی زندگی پر عذاب ناک ظلم و ستم کی بارش کر رکھی تھی اور ان سب غریب و مجبور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہوگا جن کا بال بال زمیندار اختیار علی کے ''خود ساختہ'' قرضے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا اور سب سے اہم بات جو دادو کے لئے یک گونہ دلی طمانیت کا باعث بن رہی تھی...... وہ معصوم سسی کی بھولی بھالی صورت تھی...... جو ہر سے اس کی نظروں کے سامنے بے بسی کے آنسوؤں کے ساتھ رقصاں ہو کر ایک بہن کے ناتے سردھان مانگتی تھی۔ آج دادو نے ایک بہن کا سردھان ان دونوں شیطانوں اختیار علی اور مولا بخش کو موت کی وادیوں میں اتار کر لے لیا تھا۔ جنہوں نے معصوم سسی کی عزت کو مٹی میں رولا تھا وہ اب خود پیوند خاک ہو گئے تھے۔

دادو جانتا تھا کہ پورا گوٹھ ہی نہیں بلکہ چوہدے کے سارے گوٹھوں میں اس وقت کھلبلی اور افراتفری مچی ہوئی ہے۔ لہٰذا گوٹھ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ ماما وسایا کا بھی یہی خیال تھا کہ اب فی الفور اس گوٹھ کو خیر باد کہہ دینا چاہئے۔ مگر وہ شہر جانے کے حق میں نہ تھا اور نہ ہی دادو کے ماں باپ اس بات پر راضی تھے۔ دراصل ماما اللہ وسایا اور دادو کے ماں باپ کا ارادہ ایک دوسرے دیہات کی طرف جانے کا تھا...... لیکن دادو ان سب کو اپنے ساتھ شہر لے جانے پر بضد تھا۔

''دیکھ میڈا پٹ دادو! ہم بڈھے ہو چکے ہیں شہر کے شور شرابے کے ہم عادی نہیں ہیں۔ ہمارا بڑھاپا کھراب نہ کر ہمیں انہی جنگلوں میں سکون سے مرنے دے۔ تیری وڈی مہربانی ہوگی۔'' دادو کے باپ نے کپکپاتے ہوئے کہا تو دادو کا وجود اندر سے کٹ سا گیا۔ تب اس نے انہیں شہر لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''پر اب جائیں کہاں؟'' دادو نے اچانک کہا تو اس کا باپ لمحے بھر کچھ سوچنے کے



بعد بولا۔ ''میں تو کہتا ہوں ادھر ہی رہتے ہیں۔ کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں...... بھلا ہم بڈھوں سے کوئی کیا بیر رکھے گا۔'' اس کی بات پر ماما وسایا نے ایک نظر چونک کر اپنے بہنوئی کو دیکھا لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے وہ اس کی بات سے متفق ہو رہا تھا۔

''کیوں ڑے وسایا! کیا کہتا ہے تو۔'' معاً دادو کے باپ نے ماما وسایا سے تائید چاہی اور ماما نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب پھر اس دن دادو نے شہر کا قصد کیا۔ اس بار شہر کی لاری میں بیٹھتے ہوئے اس کے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ آج معصوم سسی کا روتا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ کر اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنا تھا۔ بلکہ اس کے تصور میں شمائلہ کا گل رو چہرہ رقصاں ہو گیا تھا، جو اسے اپنی جانب بلاتا اور پکارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا...... ہمیشہ کے لئے اور پھر کبھی نہ بچھڑنے کے لئے۔

❁❁❁

ایڈووکیٹ رانا الطاف کی کوششیں بالآخر بار آور ثابت ہوئیں۔ ہائی کورٹ میں دائر کی گئی پرویز کی سزائے موت کو عمر قید میں بدلنے کی اپیل، دو تین پیشیوں میں ہی منظور کر لی گئی تھی۔ ایڈووکیٹ رانا الطاف بلاشبہ ایک کہنہ مشق اور منجھے ہوئے وکیل تھے۔ عدالت میں انہوں نے جج کے سامنے ایسے ایسے ابہام کا سہارا لیتے ہوئے انہیں اجاگر کیا کہ جج صاحب کو نہ صرف پرویز کی سزا میں تخفیف کرتے ہی بنی بلکہ خورشید احمد قتل کیس کے سلسلے میں جج صاحب خود بھی تذبذب کا شکار ہو گئے تھے اور رانا الطاف کے بھرپور دلائل نے انہیں احساس دلایا تھا کہ بظاہر تو خورشید احمد کا قاتل ملزم پرویز حوالۂ قانون ہو چکا ہے مگر اس کی حیثیت کٹھ پتلی جیسی ہے۔

بہر طور ایڈووکیٹ رانا الطاف اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ کمال اور سعدیہ کو بھی خوشی ہوئی تھی بلکہ وہ سب ملزم پرویز کی بیوی فریدہ کو اس کے شوہر کی سزائے موت عمر قید میں بدلنے کی خوشخبری سنانے گئے تھے اور ساتھ میں اسے تسلی دیتے ہوئے اس عزم کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ انشاء اللہ اصل مجرم کو بھی ضرور گرفتار کروا کر ہی دم لیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پھر پرویز کی سزا میں مزید تخفیف ہو جائے۔

❁❁❁

"سعدیہ! تم آگ اور پانی کا کھیل، کھیل رہی ہو...... ذرا بچ کے رہنا کہیں شرلاک ہومز والا یہ ایڈونچر تمہیں پھنسا ہی نہ دے۔" کمال نے قریب بیٹھی اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دیتی ہوئی وکیل سعدیہ سے کہا تو سعدیہ نے اپنی دوسری آنکھ میں لینس لگاتے ہوئے مسکرا کر ازراہِ تفنن کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تم ڈاکٹر واٹسن کی طرح مجھے آکر چھڑا لینا پھر......"

وہ دونوں اس وقت ایڈووکیٹ رانا الطاف کے چیمبر میں موجود تھے۔ سعدیہ، کمال سے اپنی "عثمان ٹریڈرز" میں ڈرامائی طور پر ملنے والی نوکری کے بارے میں ذکر کر چکی تھی اور تبھی کمال نے ازراہِ تشویش محتاط تبصرہ کر ڈالا تھا جسے سعدیہ نے مذاق میں اڑا دیا تھا۔

"مگر تم وہاں ایسا کیا کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرو گی جبکہ وہاں تم ایک معمولی سی پوسٹ پر متعین ہو۔" کمال کے لہجے میں الجھن آمیز پریشانی تھی۔

"میں ہاتھی کے لئے چیونٹی بنوں گی اور اس کی سونڈ میں گھس کر دماغ میں جا پہنچوں گی! سمجھے کچھ......" سعدیہ، کمال کو تشویش میں مبتلا دیکھ کر اسے زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی، مگر کمال بھی لگتا تھا کہ بحث کے موڈ میں ہے۔

لہٰذا جواباً دوبارہ بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تم "عثمان ٹریڈرز" میں ایک معمولی سی ملازمت کے دوران واثق علی کے گرد کوئی جال پھیلا سکو گی جبکہ واثق علی جیسے گرگ باراں دیدہ لوگ اپنے جرم کی ہوا بھی کسی کو لگنے نہیں دیتے۔ سعدیہ نے بظاہر غور سے کمال کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی بات سنی تھی۔

لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا کر کسی غیر مرئی نقطے پر مرتکز کرتے ہوئے گہرے لہجے میں بولی تو اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ شامل تھی۔

"میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کمال...... کہ مجھے واثق علی جیسے گرگ باراں دیدہ مجرم کے چرنوں میں جگہ مل گئی ہے۔ باقی اس کی شہ رگ تک پہنچ کر اسے کاٹنا میرا کام ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ کمال کو حیران و پریشان چھوڑ کر "بائی بائی" کہنے کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلاتی ہوئی چیمبر سے نکل گئی۔ وہ باہر نکلنے کے لئے ہمیشہ دفتر کا خفیہ دروازہ ہی استعمال کرتی تھی۔



❁❁❁

آفتاب احمد نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔ اس نے سعدیہ کو فوری اپنی اسٹینو مقرر کر لیا تھا۔ سعدیہ نے بھی آفتاب احمد کا "شکریہ" ادا کرتے ہوئے اپنی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اگرچہ اس نے آفتاب احمد پر اپنے حسن کا جادو چلا تو دیا تھا، لیکن وہ اس سے خائف بھی رہتی تھی۔ مزید ستم یہ کہ وہ اس کا آفتاب کے سامنے اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو ہر لحہ دل پھینک نوعمر عاشقوں کی طرح اس کے سامنے آنکھیں بچھائے رہتا تھا۔ اب یہ سعدیہ کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کیسے اس "بوڑھے عاشق" کو "طرح" دیتی آ رہی تھی۔ بلکہ گزرتے سمے کے ساتھ اب کسی حد تک پریشانی بھی لاحق ہو چلی تھی کہ کہیں یہ کمبخت آفتاب جو اس کے اہم مقصد میں ایک طرح سے مددگار بھی ثابت ہوا تھا، مصیبت نہ بن جائے...... کچھ یہی وجہ تھی کہ سعدیہ اب اپنی خفیہ کارروائی کو جلد سے جلد انجام تک پہنچانا چاہتی تھی۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس نے وہاں کے دیگر کارکنوں کو اپنے حسن اخلاق سے گرویدہ کیا۔ یہاں تک کہ کمپنی کے گوداموں کے ملازمین میں بھی کافی حد تک گھل مل گئی تھی۔

لیکن اس "گھلنے ملنے" میں اس نے ایک "بارعب" حد ضرور قائم کر رکھی تھی، لیکن باوجود اس کے وہ جانتی تھی کہ اس کا یوں ہر کس و ناکس سے ملنا اسے کسی بھی وقت نامعقول قسم کی بدمزگی سے دوچار کر سکتا تھا لیکن وہ ان "خرافات" کو ایک حد تک طول دینے پر مجبور تھی اور نہایت ہوشیاری سے اپنے اہم مقصد کے حصول کی خاطر اس پل صراط سے گزر رہی تھی۔ اسی دوران اس نے اپنے اصل ہدف واثق علی اور اس کے معمولات پر بھی نگاہ رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

اگرچہ سعدیہ کو واثق علی کے قریب جانے کا موقع کم بلکہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہی ملتا تھا، لیکن وہ پھر بھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایم ڈی سے دور رہ کر بھی اس پر گہری نظر رکھنے کی کوششیں جاری رکھی ہوئی تھیں بلکہ ایک دن تو موقع پا کر وہ ایم ڈی واثق علی کے آراستہ و پیراستہ آفس میں اس کی غیر موجودگی میں داخل ہو گئی اور یہ موقع اسے ایم ڈی کی پرسنل سیکرٹری مس ندا نے دیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو سفارشی طور پر بھرتی ہوئی تھی اور چونکہ سفارش پر بھرتی ہوئی تھی اس لئے کچھ زیادہ ہی اس زعم میں اتراتی

بھی تھی۔ مزاجاً مغرور اور اپنی تعریف میں رطب اللسان رہنے والی وہ ایک خاصی طرحدار لڑکی تھی۔

حسین بھی بلا کی تھی۔ سعدیہ نے سب سے پہلے اس کے ساتھ ہی بنانے کی کوشش کی تھی اور یہ وہی جانتی تھی کہ اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ بہر طور ایم ڈی کے آفس میں داخل ہونے کا ذریعہ سعدیہ نے بڑی چالاکی سے ندا کو ہی بنایا تھا...... جس کے لئے سعدیہ کو پہلے تو ندا کی شان میں تعریفوں کے پل باندھنے پڑے تھے۔ پھر کہیں جا کر وہ مانی تھی۔

"اللہ...... ندا! تم کتنی خوش نصیب ہو کہ ایم ڈی اے صاحب کے خوبصورت آفس کا روزانہ نظارہ کرتی ہو۔ کبھی مجھے بھی نظارہ کروا دو۔" اس کی بات سن کر ندا قدرے پھول سی گئی۔ تاہم قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔ "تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن ایم ڈی صاحب کی بڑی سختی سے ممانعت ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی بھی فرد آفس میں قدم نہ رکھے۔"

"کیا تمہیں بھی نہیں؟" سعدیہ کسی خیال کے تحت "اسٹارٹ" لیتے ہوئے بولی۔

"نہیں خیر مجھے تو نہیں۔" ندا نے اپنے اسٹائلش بالوں کو ادا سے جھٹکتے ہوئے کہا تو سعدیہ نے ایک اور پتہ پھینکا۔

"ویسے ندا! میں نے تو سنا تھا کہ اس سے پہلے جو ایم ڈی صاحب کی پرسنل سیکرٹری تھی اسے تو ان کی غیر حاضری میں ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ واقعی تم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔ حالانکہ وہ لڑکیوں کے معاملے میں ریزرو رہتے ہیں۔ مگر تم واحد لڑکی ہو جس نے آتے ہی ان کی برسوں کی روایت توڑ ڈالی۔" سعدیہ رکی تو ندا جیسے اپنی تعریف پر پھول سی گئی۔ "ارے ہاں ندا یاد آیا...... چلو اس بات کو رہنے دو میں نے تو بس ایسے ہی بچکانہ خواہش کا اظہار کر ڈالا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کل ہی طارق روڈ سے اپنے لئے بڑی اچھی پرفیوم لی تھی۔" سعدیہ نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے اسے پھر للچایا۔ "اور اتفاق دیکھو ندا کہ بالکل ویسی ہی پرفیوم میری ایک تمہاری ہی جیسی عزیز سہیلی نے مجھے گفٹ کر دی۔ میں نے سوچا اب دو میں کیا کروں گی۔ کیوں نہ ایک تمہیں دے دوں۔"



ندا اس کی بات سن کر خوش ہو گئی۔ "اچھا۔"

"کل میں لے آؤں گی تمہارے لئے رکھ چھوڑی تھی میں نے......" سعدیہ اتنا کہہ کر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگی۔ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے ذرا سوچتے ہوئے قدرے جھجک کر سعدیہ سے کہا۔ "تم ایسا کرنا آج ڈیوٹی آف ہونے کے بعد میرے پاس چلی آنا میں باس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی گھر جاتی ہوں۔ اس عرصے میں میں خود تمہیں باس کے آفس کا نظارہ کروا دوں گی۔" بالآخر اس نے کہا اور سعدیہ اندر سے نہال سی ہو گئی۔ مگر ہنوز اس کے پھینکے ہوئے پتے میں ایک سقم رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ سعدیہ درحقیقت تنہا ہی واثق علی کے آفس کا "نظارہ" کرنا چاہتی تھی اور ندا کی موجودگی میں وہ دوران "نظارہ" اس کی تلاشی نہیں لے سکتی تھی۔ بہر طور اس نے اس کو ہی کافی جانا اور ڈیوٹی آف ہونے کے بعد آنے کا وعدہ کر کے اپنی سیٹ پر چلی آئی۔ اپنی سیٹ پر آنے کے بعد اس کا کام میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی بے چین نظریں بار بار وال کلاک کی طرف اٹھ رہی تھیں، جدھر ابھی تین بجے کا وقت ہوا تھا۔ ڈیوٹی ٹائم پورے پانچ بجے تک کا تھا اور ابھی آف ہونے میں پورے دو گھنٹے تھے۔ معاً اس کے انٹرکام کی بیل گنگنائی۔ جس کی آواز پر پہلے تو وہ چونکی پھر اچانک وہ بیزار سی نظر آنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کس کی کال تھی۔ لہٰذا دل پر جبر کر کے اس نے ریسیور کانوں سے لگایا تو دوسری طرف سے جنرل منیجر آفتاب احمد نے اسے اپنے کمرے میں آنے کا آرڈر دیا۔

"جی اچھا سر!" کہتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جب وہ آفتاب احمد کے کمرے میں داخل ہوئی تو حسب معمول اسے اپنا منتظر پایا۔ "جی سر کوئی کام ہے؟" سعدیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تو جواباً آفتاب احمد چند ثانیے اسے عجیب نظروں سے تکتا رہا۔ پھر یکدم مسکراتے ہوئے اپنی چیئر سے اٹھا اور اس کے قریب آ کر اس کے شانے پر آہستگی سے ہاتھ رکھنا چاہا تو غیر ارادی طور پر سعدیہ فوراً چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور بدحواس ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اتنا ہی کہہ پائی۔ "جج...... جی سر...... کیا مطلب؟"

آفتاب احمد نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور اپنی خجالت چھپاتے ہوئے مسکرا کر

قدرے بے تکلفی سے بولا۔ ''ارے بھئی! کیا ضروری ہے میں تمہیں کسی کام سے ہی بلاؤں۔ کیا ویسے نہیں بلا سکتا اپنے لئے......''

اس نے سعدیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو سعدیہ کو اس کی نگاہوں میں عجیب جذبے کی لہر رقص کرتی نظر آئی۔ وہ معتدل لہجے میں بولی۔ ''سر میں تو آپ کے پاس کام کے سلسلے میں ہی آ سکتی ہوں...... کیا میں جاؤں سر۔''

''ارے! یہ کیا بات ہوئی اچھا آؤ یہاں بیٹھو۔ میرے ساتھ میں اپنے کارکنوں کے معاملے میں مساوات کا قائل ہوں۔ یہ اعلیٰ و ادنیٰ کی سوچ میں نہیں رکھتا۔ آؤ شاباش......'' سعدیہ کے جی میں تو آئی کہ وہ کہہ دے کہ ''باہر مجھ سے بھی ادنیٰ کارکن چپڑاسی موجود ہے، اسے بھی پھر اندر بلا کر اپنے پاس بٹھا لیں۔'' لیکن وہ اپنی اس خواہش کو دبا گئی۔ تاہم وہ ذرا فاصلہ دے کر صوفے پر براجمان ہو گئی۔ اس کا دل کسی انجانے خدشے کے تحت دھک دھک کر رہا تھا۔ سعدیہ کے بیٹھتے ہی آفتاب دوستانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''چلو کوئی بات کرو آفس ٹاکنگ کے علاوہ۔''

''سر یہ آفس ہے بلا وجہ باتیں بنیں گی۔'' سعدیہ نے دانستہ نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا تو آفتاب احمد جیسے اسی جملے کا منتظر تھا۔ ترت بولا۔

''چلو پھر آج کا ڈنر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کرتے ہیں۔'' سعدیہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی کہ معاً ٹیبل پر رکھے فون کی بیل بجی۔ بیل جس سیٹ کی گنگنائی تھی وہ شاید اس سے واقف تھا لہٰذا پھرتی کے ساتھ اٹھا اور ریسیور کانوں سے لگا لیا۔ پھر دوسری طرف کی آواز سنتے ہی مؤدبانہ انداز میں ''جی سر...... او کے سر...... ابھی آتا ہوں سر......'' کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اب اس کے چہرے سے خاصی بیزاری جھلک رہی تھی۔ لیکن اس کا جواب سن کر سعدیہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے ''خس کم جہاں پاک'' کا دل میں ورد کیا تھا، پھر آفتاب اس کی جانب متوجہ ہو کر قدرے عجلت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم اب اپنی سیٹ پر جاؤ ایم ڈی صاحب نے مجھے بلایا ہے ڈنر کا پروگرام یاد رکھنا پھر کبھی ٹائم سیٹ کریں گے۔''

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ سعدیہ جلدی سے صوفے سے اٹھ کر باہر نکل گئی جیسے اندر



آفتاب احمد کی بجائے کوئی بھوت بیٹھا ہو...... درحقیقت سعدیہ سردست آفتاب احمد کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ یہی وہ مہرہ تھا جو اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ تر نوالہ بن جاتی۔ وہ ابھی تک بڑی خوبصورتی سے ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب جیسے شخص کو کس طرح بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی سیٹ پر آ کر براجمان ہو گئی۔ پھر جب ڈیوٹی ٹائم ختم ہوتے ہی وہ ندا کے پاس اس کا وعدہ یاد دلانے پہنچی تو ندا نے اسے مایوس نہیں کیا اور بولی۔ ''سعدیہ! باس جا چکے ہیں...... تم ان کے آفس کا نظارہ کر آؤ۔ کیا یاد کرو گی، کس سخی دوست سے پالا پڑا ہے۔''

''تم نہیں چلو گی میرے ساتھ؟'' سعدیہ نے یونہی پوچھا تو ندا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے قدرے شیخی سے کہا۔

''میں تو روز ہی نظارہ کرتی ہوں۔ تم جاؤ میں ادھر ہی ہوں۔'' پھر سعدیہ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

۞۞۞

دفتر کا کمرہ اندر سے واقعی شاندار اور پیراستہ تھا۔ لیکن وکیل سعدیہ کو اس سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جس مقصد کے لئے یہاں آئی تھی اسے پورا کر کے جلد از جلد لوٹنا چاہتی تھی۔ کہیں مدا اس کی تاخیر پر اندر ہی نہ گھس آئے اور ظاہر ہے پھر اس کی موجودگی میں سعدیہ اپنا ''کام'' نہیں کر پاتی۔ بہر طور سعدیہ نے پہلے تو بغور پورے آفس کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا جہازی سائز ٹیبل پر اور عین ریوالونگ چیئر کے سامنے ایک کمپیوٹر بائیٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی اس کے کی بورڈ بھی موجود تھا۔ وہ ذرا قریب آئی تو اس کی نظر ایک ٹیلیفون سیٹ پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ ٹیلیفون سیٹ سے ایک دوسرا تار میز کی نچلی دراز میں ایک موراخ کے ذریعے اندر غائب ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے مختلف دراز کھول کر ان کی تلاشی لی اور تب اسے ایک اوپر کی دراز میں آنسرنگ مشین نظر آئی۔ اس نے مشین کا ایک چھوٹا سا بٹن دبایا تو اندر کہیں نصب چھوٹا سا کیسٹ خود کار انداز میں ریوائنڈ ہو کر چل پڑا اور ساتھ ہی ایک کھر کھراتی ہوئی آواز ابھری۔ ''مسٹر واثق علی! آپ شاید موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا میرا پیغام نوٹ کر لیں میں ایکس تھری ون بات کر رہا ہوں...... آج سے ٹھیک آٹھ روز بعد یعنی پندرہ تاریخ کو مسٹر براؤن آپ سے مال کی ڈیلنگ کے سلسلے میں پہنچنے والے ہیں۔ ایک روز قبل وہ آپ سے خود رابطہ کر کے وقت ملاقات اور جگہ کا تعین کریں گے۔''

پھر آواز آنا بند ہو گئی سعدیہ نے بٹن آف کر دیا۔ اس نے فوری سوچتے ہوئے اندازہ لگایا کہ آج بارہ تاریخ تھی یعنی ابھی دو تین روز تھے۔ اس پر اسرار شخص مسٹر براؤن سے ملاقات میں۔ یہ ذہن نشین کرنے کے بعد وہ مزید ادھر اُدھر تلاشی لیتی ہوئی دیوار گیر شیلف کی جانب بڑھی تو اچانک وہاں ''چھیڑ چھاڑ'' کے دوران پورا شیف خود کار انداز میں سرکتا چلا گیا اور اب وہاں ایک چیسٹ (سیف) سا نظر آ رہا تھا۔ بلاشبہ



وہ کوئی خفیہ آہنی چیسٹ (سیف) تھا جو اندرونی دیوار پر نصب تھا۔ اس کے ساتھ ہی نیلے پلاسٹک کے کور والی چھوٹی سی پاکٹ سائز ڈائری ایک مختصر سے رخنے کے اندر چپکی ہوئی تھی۔ سعدیہ کا دل فرط جوش سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جلدی سے ڈائری کھولی۔ وہ جان گئی تھی اس میں اس خفیہ سیف کے نمبرز درج ہوں گے۔ کیونکہ بعض کاروباری افراد اپنے خفیہ چیسٹ کا نمبر بھول جانے کے ڈر سے ایسی جیبی ڈائریوں میں درج کر لیتے ہیں۔ سعدیہ کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس نے ڈائری میں سے ایک اندازے کے مطابق چند نمبر ملائے اور بالآخر تھوڑی کوشش کے بعد چیسٹ کھل گیا۔ مگر چیسٹ کے کھلتے ہی سعدیہ چونک سی گئی۔ اندر چوکور خلا میں ایک فلاپی ڈسک موجود تھی۔ سعدیہ کا دل یکبارگی ایک خیال سے دھڑک اٹھا اور اس نے فلاپی ڈسک کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنا سر پُرموج انداز میں دھیرے سے ہلایا اور پھر بڑی تیزی کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ ڈسک اٹھا لی جو ایک چوکور اور ٹرانسپیرنٹ کور میں محفوظ تھی۔ ڈسک کو جلدی سے سعدیہ نے اپنے پرس کے اندر رکھا پھر بڑی پھرتی سے اس نے چیسٹ دوبارہ بند کیا۔ مگر پھر ایک بات پر وہ پریشان سی ہو گئی...... کیونکہ اب مسئلہ شیف کو خود کار طریقے سے واپس اپنی جگہ لانا تھا، لیکن سعدیہ اس کے میکانزم سے یکسر نابلد تھی۔ وہ کھل تو حادثاتی طور پر گیا تھا، مگر اب دوبارہ اسے واپس اپنی جگہ پر لانا سعدیہ کو ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنی عقل سلیم سے کام لیتے ہوئے اور اپنی یادداشت کو کریدتے ہوئے سوچا کہ جس جگہ اس کا اچانک غیر ارادی طور پر ہاتھ مس ہوا تھا اس جگہ کو ٹٹولنا چاہئے۔ لہٰذا اس خیال کے آتے ہی سعدیہ نے فوراً مذکورہ جگہ پر پھر ''چھیڑ چھاڑ'' شروع کی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ شیلف کے اس مطلوبہ خانے میں جدھر موٹی موٹی کتابوں کی طرح نظر آنے والی فائلیں رکھی ہوئی تھیں ایک موٹی کتاب نما فائل اپنی جگہ پر سختی سے نصب تھی۔ سعدیہ نے یونہی ذرا دائیں بائیں ہلانے کی کوشش کی تو یکدم شیلف ہلکی سی گھر گھراہٹ کے ساتھ دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا۔ ''گویا یہ شیلف کو سرکانے کا خود کار آلہ تھا۔''

سعدیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا پھر اگلے ہی لمحے دروازے پر سعدیہ کو آہٹ سی سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بھی آہستگی کے ساتھ کھل گیا۔ سعدیہ کا دل

زور سے دھڑکا سامنے ندا موجود تھی۔ "ارے بھئی! اب آ بھی جاؤ چوکیدار آنے والا ہے۔" اس نے سعدیہ کی طرف دیکھ کر کہا اور سعدیہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی ہوئی مسکرا کر باہر نکل آئی۔ "اللہ کتنا خوبصورت آفس ہے باس کا۔" سعدیہ نے اپنا لہجہ توصیفی بناتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے بعد وہ دونوں عمارت سے باہر آ گئیں۔ ندا نے رخصت ہوتے وقت سعدیہ کو اپنی "پرفیوم" والا وعدہ یاد دلایا اور پھر چلی گئی۔

❁❁❁

"ارے بھئی وکیل صاحبہ تم تو واقعی سراغ رساں نکلیں۔ بڑا زبردست کام کیا ہے تم نے آج۔" کمال کے لہجے میں ستائش تھی۔ وہ اس وقت اپنے ڈیڈی ایڈووکیٹ رانا الطاف کے دفتر میں کمپیوٹر مانیٹر کے سامنے موجود ماؤس سرکا رہا تھا اور سامنے مانیٹر پر بکھرے رنگین الفاظ کو پرشوق نظروں سے تکے جا رہا تھا...... اس کا چہرہ فرط جوش سے تمتمایا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی کرسی پر سعدیہ بھی پرجوش سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھی مانیٹر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کمال کے حوصلہ افزا تبصرے نے اسے نہال سا کر دیا تھا۔ وہ واثق علی کے آفس سے فلاپی ڈسک چرا کر سیدھا کمال کے پاس آئی تھی۔ اگرچہ وہ خود تو کمپیوٹر وغیرہ سے نابلد تھی مگر کمال کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ کم از کم اتنا کمپیوٹر وغیرہ کے متعلق ضرور جانتا ہوگا کہ فلاپی ڈسک میں محفوظ سیکرٹ فائلز کو پڑھ سکے اور اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ کمال نے تھوڑی ہی سی دیر میں فلاپی ڈسک کو اوپن کر ڈالا تھا۔

"کچھ مجھے بھی بتاؤ کمال! کیا ہم اپنی مطلوبہ کوشش میں کامیاب ہو گئے ہیں۔" سعدیہ بے چینی سے جوش میں بولی۔

کمال نے جواباً دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ اس کی نظریں ہنوز مانیٹر پر تھیں...... پھر وہ ذرا دیر بعد سعدیہ سے مخاطب ہو کر قدرے جوش سے بولا۔ "سعدیہ! تم اپنے مقصد دیرینہ میں سو فیصد کامیاب ہو گئی ہو۔ اس فلاپی ڈسک میں واثق علی کے اس سارے کالے دھندے کی تفصیل ہے جو وہ اپنے کاروبار کی آڑ میں کرتا رہا ہے۔"

"آخر کچھ تو بتاؤ؟" سعدیہ دوبارہ بے چینی کے ساتھ مستفسر ہوئی تو کمال نے بتانا شروع کیا۔ "اس فلاپی ڈسک میں ان سیکرٹ فلائکوں کی تفصیل ہے جن میں غیر قانونی



مال کی ترسیل اور نامی گرامی اسمگلروں کے نام کے علاوہ ان کے اکاؤنٹ نمبرز بھی درج ہیں...... جن سے واثق علی کے روابط ہیں۔ جن میں مسٹر کنگ اور دیگر الا بلا پراسرار اور غیر ملکی اسمگلروں کے علاوہ مسٹر براؤن نامی اس شخص کا نام بھی ہے جس کا خفیہ پیغام تم نے واثق علی کے دفتر میں اس کی آنسرنگ مشین میں سنا تھا۔" کمال اتنا کہہ کر چپ ہو رہا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں انسپکٹر ثناء اللہ کو یہ سب بتا دینا چاہئے تاکہ فوری کارروائی وہ واثق علی کے خلاف کر سکے۔"

"نہیں کمال! فی الحال ہمیں یہ سب اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہئے۔" سعدیہ اس کے خیال کو نفی کرتے ہوئے بولی اور مزید پرخیال لہجے میں گویا ہوئی۔ "واثق علی جیسے مگرمچھ کو پھانسنے کے لئے ہمیں ابھی اپنا جال مزید مضبوط کرنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟" کمال اس کی بات پر چونکا اور مزید بولا۔ "میں سمجھتا ہوں واثق علی اس فلاپی ڈسک کے ہاتھ آ جانے سے مکمل طور پر اب ہمارے قابو میں آ چکا ہے اور اب تمہیں اس کی ملازمت کرنے کا ڈرامہ ختم کر دینا چاہئے۔"

سعدیہ، کمال کی بات سن کر عجیب گہرے اور پراسرار انداز میں مسکرائی۔ اس کی نگاہیں کہیں خلا میں مرکوز تھیں...... پھر وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "کمال! ابھی میرا ڈرامہ ختم نہیں ہوا۔ میں اب بھی اس کے دفتر ملازمت کرنے جاتی رہوں گی اور یہ فلاپی ڈسک بھی دوبارہ اس خفیہ چیسٹ میں رکھنے کی کوشش کروں گی ابھی میں نے اس کے ساتھ ایک اور گیم بھی کھیلنا ہے۔"

کمال کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ آخر سعدیہ مزید اس کے خلاف اور کیا کرنا چاہتی تھی۔ کون سا پراسرار کھیل اب کھیلنا چاہتی تھی۔ جبکہ واثق علی کو قانون کی گرفت میں لانے کے لئے اس فلاپی ڈسک سے بڑھ کر اور کون سا موثر ثبوت باقی رہ گیا تھا۔ تاہم وہ چونک کر مستفسر ہوا۔ "سعدیہ میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔ ترپ کا پتہ تمہارے ہاتھ لگ چکا ہے اب اس ڈرامے کو طول دینے کا کیا مقصد ہے؟"

"کمال! میرا مقصد محض واثق علی کو کٹہرے تک ہی پہنچانا نہیں ہے۔" سعدیہ گم صم لہجے میں بولی تو کمال ہونقوں کی طرح استفہامیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "میں اسے ویسا ہی گھاؤ لگاؤں گی جو اس نے میری ماں کے دل پر لگایا تھا۔" سعدیہ اتنا

کہہ کر چند ثانیے رکی پھر کمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کمال! تم سے میری ایک درخواست ہے کہ سردست اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا جب تک میں پورے ڈرامے کا پردہ نہ اٹھا دوں۔ مطلب یہ کہ انسپکٹر ثناء اللہ سے ابھی اس بات کا ذکر مت کرنا کہ واثق علی کے غیر قانونی دھندوں سے متعلق سیکرٹ فائلز کی فلاپی ڈسک ہمارے ہاتھ لگ چکی ہے۔''

سعدیہ کی بات سن کر کمال چند لمحے خاموشی کے بعد مخاطب ہو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے چونکہ یہ پورے کا پورا ڈرامہ تم خود تنہا پلے کر رہی ہو۔ لہٰذا اس کے تکنیکی رموز وغیرہ سے بھی تم ہی واقف ہو گی کہ کب اسے لاسٹ ایپی سوڈ (Last Episode) میں داخل کرنا ہے۔ مگر مجھے بھی تو اپنی اس مہم میں شامل کرو ناں۔ فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا ہوں۔'' آخر میں کمال نے قدرے اکتا کر کہا۔ لیکن سعدیہ جانتی تھی کہ اس نے لفظ ''فارغ'' بیٹھنے کا محاورۃً کہا ہے۔ جبکہ وہ آج کل چھوٹے موٹے کیسوں میں الجھا ہوا تھا اور سعدیہ کے حصے کے کچھ کیسوں کی پیروی بھی وہی کر رہا تھا۔ مگر باوجود اس کے کمال کی مرضی یہی تھی کہ وہ اس خطرناک کھیل میں جو سعدیہ ''عثمان ٹریڈرز'' میں کھیل رہی تھی اسے بھی اپنے ساتھ شریک کرے۔ کیونکہ کمال اس کے اکیلے ''عثمان ٹریڈرز'' میں ملازمت کرنے سے مطمئن نہ تھا۔ بہر طور جواباً لمحہ بھر توقف کے بعد سعدیہ نے جیسے اسے خوش کرنے کی غرض سے کہا۔ ''بے فکر رہو کمال تمہیں بھی اب اپنے جوہر دکھانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ انسپکٹر ثناء اللہ سے محض اس بات کا ذکر ضرور کرنا ہو گا کہ میں نے واثق علی کے دفتر میں آنسرنگ مشین سے جو ٹیپ شدہ گفتگو مسٹر براؤن نامی شخص کی خفیہ ڈیل سے متعلق سنی ہے اسے ٹریس کرنے کے لئے تم دونوں مل کر کوئی لائحہ عمل ضرور تیار کرنا چاہئے۔'' سعدیہ اتنا کہہ کر ذرا تھمی تو کمال کچھ سوچنے کے انداز میں سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے مختصراً بولا......

''مثلاً؟''

''آنسرنگ مشین کے ٹیپ شدہ خفیہ پیغام کے مطابق کوئی مسٹر براؤن واثق علی سے ضرور ملاقات کرے گا۔'' سعدیہ نے مزید کہنا شروع کیا۔ ''اب ان دونوں کی ملاقات کب اور کس جگہ ہو گی اس کا تعلق بھی واثق علی کو ایک دن قبل اس سے رابطہ کر کے بتانا



ہو گا۔ اب اندرونی طور پر میرا کام یہ ہو گا کہ کسی طرح میں ان لوگوں کی گفتگو ٹریس کر لوں اور اس کے بعد تمہیں انفارم کر دوں اور تم دونوں اپنے طور پر ''ٹریپ'' کرنے کی کوشش کرو۔'' سعدیہ، کمال کو آئندہ کے لائحہ عمل کی صراحت سے آگاہی دینے کے بعد خاموش ہو گئی اور پھر چند ثانیے توقف کے بعد دوبارہ بولی۔ ''میں اب کوشش کروں گی کہ اس فلاپی کو دوبارہ واثق علی کے خفیہ چیسٹ میں رکھ دوں تاکہ اسے علم ہی نہ ہو سکے کہ کسی نے یہاں کوئی ''چھیڑ چھاڑ'' کرنے کی سعی کی ہے ورنہ وہ محتاط ہو سکتا ہے۔''

کمال اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی پر تفکر سی پرچھائیں اس کے خاموش چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ سعدیہ یہ بھانپتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور جب وہ بولی تو اس کے ملائم سے لہجے میں محبت کی حلاوت گھلی ہوئی تھی۔ ''کمال! میں جانتی ہوں تم میری طرف سے خاصے فکر مند ہو۔ لیکن کمال یہ سب ہونے دو۔ فتح ہمارا مقدر ہے۔ ماضی کی ناانصافیوں کے ازالے کا وقت قریب ہے۔ مجرم تختۂ دار پر چڑھنے والا ہے۔ سزا ہونے کو ہے۔ ہو جانے دو یہ سب حق و باطل کی اس جنگ میں جیت بہر حال حق ہی کی ہو گی۔'' سعدیہ کہتی رہی اور کمال اپنے چہرے پر عجیب پر اسراری سی خاموشی سجائے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی باتوں کے تناظر میں کچھ اخذ کرنا چاہ رہا تھا۔ کمال اس بات سے ہمیشہ متفکر رہا تھا کہ کہیں جوش انتقام میں سعدیہ اپنے آپ کو ہی نقصان نہ پہنچا لے۔ سعدیہ کمال کے چہرے کی پر اسرار خاموشی کو بھانپ چکی تھی اور جانتی تھی کہ کمال کی اس پر مرکوز نگاہیں اس وقت کسی فکر میں مبتلا تھیں۔

❁❁❁

سعدیہ اگلے دن علی الصباح دفتر پہنچی۔ اس کی پہلی کوشش یہی تھی کہ وہ فلاپی ڈسک کو کسی طرح خاموشی کے ساتھ دوبارہ اپنی جگہ رکھ دے۔ وہ اس کی ایک کاپی کروا چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت صرف چوکیدار ہی موجود ہو گا، مگر جب وہ اوپر اپنے آفس پہنچی تو سرتاپا لرز اٹھی۔ انتہائی غیر متوقع طور پر اس وقت ایم ڈی یعنی واثق علی اپنے کمرے میں موجود تھا اور کسی سے مصروف گفتگو تھا۔ حیرت انگیز طور پر ندا بھی موجود تھی۔ وہ سعدیہ کو اتنی صبح دیکھ کر قدرے چونک کر بولی۔ ''ارے تم اتنی جلدی آ گئیں۔'' سعدیہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں بس صبح سویرے جاگنا مجھے اچھا

لگتا ہے...... اللہ اس طرح روزی میں برکت دیتا ہے۔ ویسے بائی دی وے یہ صبح سویرے تو ہم جیسے ملازموں کو آنا سوٹ کرتا ہے لیکن باس کو بھلا اتنی صبح......"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔" ندا نے سعدیہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اکثر باس کو کسی پارٹی سے بزنس ڈیل کرنا ہوتی ہے تو وہ انہیں اتنی ہی صبح ملنے کا وقت دیا کرتے ہیں۔"

اس کی بات پر سعدیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا کہ "آخر اتنی صبح کس پارٹی کے ساتھ یہ کیسی اور کون سی بزنس ڈیلنگ ہو رہی تھی؟" سعدیہ کے اندر یہ سوال ابھرا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا دھیان فوراً ہی اصل مقصد کی طرف موڑتے ہوئے فکرمندی سے سوچا۔ "اب کس طرح فلاپی ڈسک کو دوبارہ واثق علی کے خفیہ چیسٹ میں رکھا جائے۔" اس پریشانی میں وہ چلتی ہوئی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اثنائے راہ ندا بھی وہاں سے کھسک گئی۔

سعدیہ اب تنہا اپنی میز پر بیٹھی تھی۔ اسے ہر لمحے اس بات کا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر خفیہ اور قدرے مشکوک "بزنس ڈیل" کے دوران واثق علی کو فلاپی کی ضرورت پڑی اور اسے وہ نہ ملی تو شاید وہ پورے دفتر میں ہی بھونچال آ جائے اور کوئی بعید نہیں کہ واثق علی جیسا گرگ باراں دیدہ شخص کا پہلا شبہ اپنے ملازمین بالخصوص نئے ملازمین پر ٹھہرے اور یوں سعدیہ کے لئے بھی مشکل کا باعث ہو۔ ابھی سعدیہ نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اچانک واثق علی کی پرسنل سیکرٹری ندا ہراساں اور پریشان سی اس کے قریب پہنچی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"خیر تو ہے؟" سعدیہ نے اپنے اندر کے انجانے خوف کو دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"خیر ہی تو نہیں۔" وہ بولی۔ "سعدیہ باس کی ایک اہم فلاپی ڈسک کہیں کھو گئی ہے اور ان کا سارا نزلہ مجھ پر گرا ہے۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھ رہے ہیں کہ کل میرے یہاں سے جانے کے بعد کیا کوئی نامعلوم شخص آیا تھا۔ وہ کون تھا یہ حرکت اسی کی ہو سکتی ہے۔" ندا کی بات پر سعدیہ دھک سے رہ گئی۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا۔" سعدیہ نے تھوک نگلتے ہوئے ندا سے پوچھا۔

"ابھی تو میں نے کچھ نہیں بتایا مگر۔"



"مگر کیا؟"

"دیکھو سعدیہ! میں تم پر الزام نہیں لگاتی کہ یہ حرکت تم کر سکتی ہو اور نہ ہی میں نے کسی سے ایسا کوئی ذکر کیا ہے۔ لیکن سعدیہ یہ بات زیادہ عرصے چھپے بھی نہیں رہ سکتی۔ لگتا ہے باس کے لیے وہ فلاپی ڈسک کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتی ہے۔ جب ہی تو اس کی باقاعدہ تلاش کے لئے باس نے اپنے کمرے سے فنگر پرنٹس لینے کا فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں کسی ماہر کو بھی بلایا ہے۔" ندا نے اپنی طویل گفتگو کو سنسنی خیز موڑ پر پہنچا کر دم لیا تو سعدیہ اندر سے لرز کر رہ گئی۔ وہ گھور کر بولی۔ "کیا؟"

"ہاں سعدیہ! مجھے بھی اصل پریشانی اس بات کی ہو رہی ہے کہ اگر تمہارے فنگر پرنٹس وہاں سے مل گئے تو بہت برا ہوگا۔" ندا کے لہجے میں حد درجہ تشویش تھی۔ وہ ہنوز یہی سمجھ رہی تھی کہ باس کے کمرے سے وہ اہم فلاپی ڈسک کسی اور نے ہی چرائی ہو گی۔ جبکہ سعدیہ تو محض آفس دیکھنے کے شوق میں اندر گئی تھی۔ مگر سعدیہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا وہ اب ایک لمحے کو بھی وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ کیا پتہ کسی بھی لمحے باس اپنے کارکنوں کے فنگر پرنٹس لینے کے لئے دفتر کے سارے ملازموں کو اپنے فنگر پرنٹس دینے کا پابند کر سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی سعدیہ نے عافیت اسی میں جانی کہ وہاں سے ترنت نکل جائے اور پھر اس نے ایسا ہی کیا وہ سیکرٹری ندا کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔

❁❁❁

شام کو دادو کراچی پہنچتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر یوسف کے کلینک میں پہنچا۔ ڈاکٹر اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ یہ کلینک شائلہ کے محلے میں ہی تھا۔ جہاں دادو پہلے بھی بطور ڈسپنسر کام کر چکا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب دادو مقتول خورشید احمد کے مکان کی بالائی منزل میں رہتا تھا۔ یہاں سے کلینک نزدیک ہی پڑتا تھا۔ اس عرصے میں کلینک میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ کلینک کچھ وسعت اختیار کر چکی تھی۔ پہلے اندر دو کمرے تھے اب تیسرا بھی کمرہ بن چکا تھا جو لیبر روم کے طور پر مستعمل تھا اور یہاں ایک نرس ٹائپ کی مڈوائف "زچہ و بچہ" کی دیکھ بھال کے طور پر تعینات تھی گویا کلینک کے ساتھ ساتھ چھوٹا سا میٹرنٹی

ہوم بھی بن چکا تھا۔ یہ ساری معلومات دادو کو وہاں ڈاکٹر یوسف کے انتظار میں بیٹھے کے دوران ایک کمپاؤنڈر سے حاصل ہوئی تھیں یہ وہ کمپاؤنڈر تھا جو دادو کے ساتھ بطور ڈسپنسر کام کرتا تھا۔ اس نے ہی دادو کو یہ خوش کن اطلاع بھی دی تھی کہ ڈاکٹر یوسف کو مزید ایک ہوشیار ڈسپنسر کی ضرورت تھی۔ جو یہاں شبینہ ڈیوٹی دے اور اس ضمن میں ڈاکٹر یوسف دادو کو اکثر یاد کیا کرتے تھے اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ڈاکٹر یوسف دادو پر مکمل بھروسہ کرتا تھا۔ بہرطور ذرا دیر بعد جب ڈاکٹر یوسف کلینک پہنچا تو دادو کو دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ دادو نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور مؤدبانہ کھڑا رہا۔

”بیٹھو دادو! کہو کیسے آنا ہوا؟“ ڈاکٹر یوسف نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! بس آپ کی محبت کھینچ لائی۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے عرض کی تھی کہ مجھے ایک بار پھر اپنی چاکری میں رکھ لیں۔“

دادو دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو ڈاکٹر یوسف بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرخیال انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے ذرا دیر بعد بولا۔ ”دیکھو دادو! میں تمہارے کام سے پوری طرح مطمئن رہا ہوں۔ تم خود بھی دیکھ رہے ہو کہ میرا کام اب پہلے سے بڑھ گیا ہے اور اس صورتحال کے پیش نظر مجھے واقعی تمہارے جیسے ڈسپنسر کی ضرورت ہے۔ جو شام کے ساتھ ساتھ رات کی ڈیوٹی میں بھی ادھر ہی رہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے۔“ اتنا کہہ کر ڈاکٹر یوسف خاموش ہوا تو دادو کو اپنی امیدوں پر اوس پڑتی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ شہر میں رہنے کے لیے اسے ڈاکٹر یوسف کی کلینک میں نوکری کا ملنا ضروری تھا۔ تاہم وہ خاموشی سے ڈاکٹر یوسف کی اگلی بات کا منتظر رہا۔

لمحہ بھر بعد ڈاکٹر یوسف نے اپنا سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”میں اس بار ایسا ڈسپنسر رکھنا چاہ رہا ہوں جو مستقل میرے ساتھ رہے، یا پھر کم از کم پانچ سال تو رہے جبکہ تم پہلے بھی چھوڑ کر جا چکے ہو اگرچہ میں تمہاری مجبوری سے واقف ہوں مگر پھر بھی بہر حال تم اس شہر کے رہنے والے نہیں ہو اور ظاہر ہے کہ اپنے گاؤں جانے کے لئے چھٹیاں مانگتے رہو گے۔ جبکہ سر دست میرے پاس اس کی گنجائش نہیں۔“

ڈاکٹر یوسف نے اپنی بات ختم کی تو دادو کو کچھ آس سی محسوس ہوئی اور وہ پر زور لہجے



میں بولا۔ ”سر آپ بے فکر رہیں جس قسم کا ڈسپنسر آپ چاہتے ہیں میں انشاء اللہ اس پر پورا اتر کر دکھاؤں گا میں خود بھی اب ایسی ہی مستقل نوکری کا خواہاں ہوں۔ جہاں پوری یکسوئی اور مستقل مزاجی سے نوکری کروں اور مجھے رہائش بھی میسر آئے۔ رہی بات میرے گوٹھ جانے کی میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا کہ میری کچھ مجبوریاں تھیں اس لئے ان دنوں میرا گوٹھ میں آنا جانا اور وہاں طویل عرصے کے لئے رہنا ضروری تھا۔ مگر اب میں ہمیشہ کے لئے اپنے گوٹھ کو خیر باد کہہ کر آگیا ہوں۔“

دادو نے اپنی بات ختم کی تو ڈاکٹر یوسف قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب؟ گوٹھ میں کیا اب تمہارا کوئی نہیں رہا؟“

”نہیں جی ایسی بات تو نہیں ہے میرے ماں پیو وہاں ہیں۔ لیکن میں اب انہیں مستقل ادھر لے آؤں گا۔ مگر پہلے اپنے پاؤں جمالوں۔“ دادو نے بتایا اور ڈاکٹر یوسف کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”ڈاکٹر سائیں! میں بڑی آس امید کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں انشاء اللہ پکا خادم بن کر رہوں گا...... پوری محنت اور تندہی سے کام کروں گا۔“ ڈاکٹر کو کسی گہری سوچ میں غلطاں دیکھ کر دادو نے کہا۔

درحقیقت ڈاکٹر یوسف کو بذات خود دادو جیسے ہی لڑکے کی تلاش تھی۔ وہ اس کے کام اور ذہانت سے واقف تھا۔ لہٰذا بالآخر اس نے دادو کو بطور ڈسپنسر اور شبینہ وارڈ سرونٹ متعین کر لیا۔

دادو یک دم خوش ہو گیا اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ کلینک کے اوپر ایک پرانی سی چھوٹی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی، جو اسٹور وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ وہ اسے رہنے کے لئے دے دی گئی۔ جسے کلینک ٹائم کے بعد دادو نے اپنے ساتھی کمپاؤنڈر کے ہمراہ صاف اور رہنے کے قابل بنانے کا پروگرام رکھا۔ اب کلینک میں مریضوں کا آنا جانا شروع ہو چکا تھا اور دادو نے اس وقت بڑی تندہی کے ساتھ ڈسپنسری کا کام سنبھال لیا۔

❁❁❁

کلینک کا ٹائم آف ہوتے ہی ذرا ستانے کے بعد دادو نے ماجد کی مدد سے کلینک

کے اوپر اسٹور کی صفائی شروع کر دی اور گھنٹے ڈیڑھ کے بعد اسے رہنے کے قابل بنا لیا۔ پھر ماجد کے جانے کے بعد دادو اپنے کمرے میں آ کر جھلنگا سی چارپائی پر رلی بچھا کر لیٹا تو اچانک اُس کے تصور میں شمائلہ کا رخ سیمیں در آیا۔ اس کا دل فوراً شمائلہ سے ملنے کے لئے مچل اٹھا۔ وہ اسے آج ہی اپنے آنے کی اطلاع اور نوکری ملنے کی خوشخبری دینا چاہتا تھا۔ قریب ہی اس کا گھر تھا، مگر چونکہ اب رات ہو چکی تھی، اس لیے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ شہر آتے ہی اسے کمال اور سعدیہ بھی یاد آنے لگے تھے۔ وہ اس کے محسن تھے۔ بھلا وہ انہیں کیسے بھول سکتا تھا۔ شمائلہ کی فکر اسے زیادہ ستا رہی تھی۔ نجانے بے چاری کہاں کس حال میں ہوگی باپ کے بہیمانہ قتل کے بعد وہ کس قدر آزردہ اور نڈھال سی ہو گئی تھی۔ دادو کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلد سے جلد شمائلہ سے مل کر اس کی آزردگی کو خوشی میں بدلنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شمائلہ کو اس کا بے چینی سے انتظار ہوگا۔ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو جائے گی۔ یہی نہیں وہ اس وقت بھی اسے ضرور یاد کر رہی ہوگی۔ اس کے خیال الفت کے آتے ہی دادو کا دل سرشاری سے بھر گیا...... حالانکہ وہ کافی تھک چکا تھا...... لیکن "تصورِ جاناں" نے اسے سونے ہی نہیں دیا۔

۞۞۞

"ارے دادو تم کب آئے؟ دادو کو دیکھتے ہی شمائلہ کھل اٹھی اور کھنکتی ہوئی آواز نے دادو کی سماعتوں میں شہد سا انڈیل دیا۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور دادو سیدھا شمائلہ کے ہاں پہنچا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر شمائلہ ہی نے کھولا تھا اور دادو کو دیکھتے ہی اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں یکبارگی ملن کے دیپ جل اٹھے تھے اور اس کے گلابی رخساروں پر شفق سی پھوٹنے لگی تھی۔ "آؤ...... آؤ دادو اندر آ جاؤ۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر میٹھی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے راستہ دیا۔

"خالہ نعمت گھر پر موجود ہیں؟" دادو نے ہولے سے پوچھا۔

"نہیں وہ پڑوس میں گئی ہوئی ہیں...... اندر تو آؤ۔" شمائلہ نے جواباً کہا تو دادو بولا۔

"شمائلہ! میں بس تمہیں اپنے آنے کی اطلاع دینے آیا تھا اب چلتا ہوں دوبارہ



ادی سعدیہ اور بھائی کمال کے ساتھ ہی آؤں گا۔" اس کی بات پر ایک لمحے کو شمائلہ کا چہرہ بجھ سا گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ دادو اپنی شرافت اور سادہ لوحی کی وجہ سے اندر نہیں آ رہا۔ تاہم اس نے پوچھا۔ "دادو تم رہ کہاں رہے ہو؟" تب دادو نے اسے مختصراً ڈاکٹر یوسف کے کلینک میں نوکری ملنے کا بتایا اور اس سے اجازت چاہی۔ درحقیقت دیدار یار کے بعد دادو کا وہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی خوئے شرافت کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہ رہا تھا اور پھر یوں دونوں ایک دوسرے کی جانب پیاسی نگاہوں سے تکتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

۞۞۞

سعدیہ "عثمان ٹریڈرز" سے لوٹ کر سیدھی چیمبر آئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے جلدی جلدی واش روم میں جا کر اپنا میک اپ صاف کیا اور آنکھوں سے لینز اتار کر فارغ ہوئی تھی کہ کمال بھی وارد ہو گیا اور سعدیہ کو غیر متوقع طور پر وہاں موجود پا کر ٹھٹھک گیا۔ "ارے تم آج دفتر نہیں گئیں۔" اس نے پوچھا تو سعدیہ ایک گہری اور تھکی تھکی سانس کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پہلے چائے پلاؤ۔ پھر ساری تفصیل بتاتی ہوں...... یوں سمجھو بال بال بچی ہوں۔"

"کیا؟ خیریت تو ہے؟" کمال نے تفکر آمیز لہجے میں کہا اور انٹرکام پر سیکرٹری کو چائے کا کہا۔

"بتاؤ تو سعدی آخر ہوا کیا؟" بالآخر کمال اس کے قریب رکھی کرسی پر براجمان ہو کر بولا۔ اس کے لہجے سے تشویش ہویدا تھی۔ تب پھر سعدیہ نے اسے وہ ساری کتھا سنا ڈالی۔ جو آج علی الصباح "عثمان ٹریڈرز" میں اس پر بیتنے والی تھی۔ سعدیہ کی پوری گفتگو سننے کے بعد کمال نے بھی ازراہِ تشکر اپنے حلق سے ایک تشفی آمیز سانس خارج کی۔ اثنائے راہ چائے بھی آ گئی۔

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تمہیں بروقت اس بات کا علم ہو گیا کہ واثق علی اپنے کارکنوں کے فوری طور پر فنگر پرنٹس لینا چاہتا ہے۔ ورنہ تو تم پھنس جاتیں۔" کمال نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

سعدیہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھی۔ اس لئے اس نے محض اپنا سر دھیرے سے

بلانے پر اکتفا کیا۔ اسی دوران چائے بھی ختم ہو گئی۔

"میرا خیال ہے اب تو ہمیں واثق علی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک ہی دینی چاہئے۔"

کمال نے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اظہار خیال کیا تو سعدیہ ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے پرخیال لہجے میں بولی۔ "اب تو ایسا ہی کرنا پڑے گا..... لیکن اس سے قبل میں واثق علی سے ذرا بلی چوہے والا کھیل کھیلنا چاہتی ہوں۔" اس کی بات سن کر کمال چونکا مگر کچھ بولا نہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خالصتاً سعدیہ کا ذاتی معاملہ ہے۔

❁❁❁

وکیل سعدیہ کے ملیح چہرے پر اس وقت غضب کی تمتماہٹ تھی۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں ہی موجود تھی۔ رات کا گیارہ بجے کا عمل تھا اس کی ماں آمنہ بیگم اپنے کمرے میں سونے کے لئے جا چکی تھی۔ جبکہ سعدیہ اپنے کمرے میں فون کے پاس بیٹھی ہوئی عجیب نظروں سے اسے تکے جا رہی تھی، پھر اچانک گہری سانس کھینچ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور اس کا نمبر پنچ کرنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد دوسری طرف سے کسی کی نیم غنودہ سی آواز ابھری۔

"ہیلو! واثق بات کر رہا ہوں۔"

اس کی آواز کو سن کر سعدیہ کا دل صرف ایک لمحے کو دھڑکا پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ریسیور پر کہا۔ "مجھے نہیں پہچانا واثق علی صاحب!" سعدیہ کے لہجے میں ہلکی سی طنز کی آمیزش نمایاں تھی۔

دوسری طرف سے واثق علی کی بھنائی ہوئی آواز گونجی۔ میں مذاق بالکل پسند نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے فضول قسم کے فون سننے کا شوق ہے۔ نان سینس...... اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

سعدیہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ری ڈائل کا بٹن دبا دیا۔ "ہیلو" اس بار مختصراً مگر گمبھیر لہجے میں کہا گیا تھا...... دوسری جانب بلاشبہ واثق علی ہی تھا۔ "اگر تمہیں فلاپی ڈسک چاہئے تو دوبارہ فون رکھنے کی غلطی مت کرنا واثق علی۔" سعدیہ نے محسوس کیا



دوسری جانب یکدم گمبھیر سی خاموشی اختیار کر لی گئی تھی۔ سننے والا شاید یکبارگی سناٹے میں آ گیا تھا۔ فلاپی ڈسک کے ذکر نے گویا ایٹم بم دھماکے کا کام کیا تھا۔ سعدیہ نے زیر لب طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جیسے محظوظ ہوتے ہوئے دوبارہ کہا۔ "کیوں واثق علی! چپ کیوں لگ گئی۔"

تب دوسری طرف سے پہلی بار واثق علی کی بوکھلائی ہوئی سی آواز ابھری۔ "تت...تم کون ہو اور...... اور...... فلاپی ڈسک کے بارے میں کیا جانتی ہو۔"

اس کی بات سن کر سعدیہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ سعدیہ نے وقت ضائع کئے بغیر دوٹوک لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ فلاپی ڈسک میرے قبضے میں ہے واثق علی! جس کے اندر تمہارے سیاہ کرتوتوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ویسے حیرت ہے تم نے مجھے ابھی تک پہچانا نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کا بڑے ڈرامائی انداز میں پہلے بھی سامنا ہو چکا ہے۔ جب تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتے تھے۔"

سعدیہ نے بڑی ہوشیاری سے واثق علی کو وہ بات یاد دلائی تھی جب خورشید احمد قتل کیس کے سلسلے میں عدالت میں اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر واثق علی نے سعدیہ کو اپنا وکیل صفائی مقرر کرنا چاہا تھا اور سعدیہ نے ڈرامائی انداز میں واثق علی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر اپنی ماں اور اپنی شناخت کروائی تھی، لیکن اس کے باوجود کٹھور باپ کے دل میں اپنی بیٹی کا درد نہیں جاگا تھا۔ وہ سعدیہ کو بری طرح دھتکار کر چلا گیا تھا۔

اگرچہ سعدیہ کو ایسا کوئی شوق نہ تھا کہ وہ اپنے باپ واثق علی کے دل میں اپنی محبت جگانے کی کوشش کرتی۔ کیونکہ اسے اپنے باپ سے شدید نفرت تھی۔ سعدیہ کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ اس کا باپ اسے پہچان کر بھی اسے گلے نہیں لگائے گا...... جس نے پیسے کی خاطر اپنی بیوی کو دھتکار دیا ہو۔ بھلا اس سے کسی انسانی و جذباتی رشتے کی توقع ہی فضول تھی۔ اس دن اپنے باپ کو گھر بلانے کا مقصد ہی سعدیہ کا یہ تھا کہ وہ اسے یہ باور کرا دینا چاہتی تھی کہ وہ یعنی سعدیہ عنقریب اپنی ماں پر اس کے شوہر (واثق علی) کی زیادتیوں کا بدلہ لے کر رہے گی اور آج فون پر سعدیہ نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے قابل نفرت باپ واثق علی کو وہ بات یاد دلاتے ہوئے اپنی شناخت کروائی تھی اور اس کے منہ سے فلاپی ڈسک کا سن کر دوسری طرف واثق علی سناٹے میں آ چکا تھا۔ وہ

سعدیہ کی بات سن کر اسے پہچان بھی چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لمحہ بھر خاموشی کے بعد واثق علی کی بوکھلائی ہوئی آواز ابھری۔

"تت...... تم سعدیہ ہو وکیل سعدیہ بب...... بیٹی تم......" واثق علی نے بدحواسی میں بھی مکاری سے کام لیتے ہوئے ایک جذباتی کمزوری کا سہارا لینا چاہا تو سعدیہ زہر خند انداز میں دوبارہ مسکرائی اور استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"بڑی جلدی آپ کو بیٹی کی یاد آ گئی۔ ویسے بائی دی وے کیا آپ "بیٹی" کے معنی جانتے ہیں واثق علی صاحب۔" سعدیہ نے آخری الفاظ قدرے چبا چبا کر ادا کئے تھے۔

"ی...... یہ...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی! دیکھو وہ فلاپی ڈسک تمہارے کام کی نہیں ہے اسے میرے حوالے کر دو لیکن یہ تمہارے پاس آئی کس طرح؟" وہ اب فریب کاری پر اترا ہوا تھا اور سعدیہ دانستہ فون پر درمیانی وقفے کو طول دیتی ہوئی چپ رہی تو دوسری جانب سے واثق علی کی لرزتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"بیٹی دیکھو......"

"مت کہو مجھے بیٹی! میں اس وقت صرف اور صرف وکیل سعدیہ بات کر رہی ہوں۔ جس کی ماں کو تم نے دھوکا اور فریب دے کر بے خانماں کر ڈالا تھا...... اب اپنا اور اپنی ماں کا حساب تمہیں چکانا ہوگا۔ واثق علی صاحب! میں عنقریب وہ ڈسک پولیس کے حوالے کرنے والی ہوں۔" سعدیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو واثق علی یکدم بدک گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی لرزیدہ اور کپکپاتی ہوئی آواز ابھری۔ "نن...... نہیں...... بیٹی تم ایسا مت کرنا میں کہیں کا نہیں رہوں گا...... دیکھو کیا تم اپنے باپ کو معاف نہیں کر سکتیں آخر میں تمہارا باپ ہوں بیٹی۔"

"او...... بڑی جلدی خیال آ گیا۔ بیٹی کا......" سعدیہ نے طنز آمیز لہجے میں کہا اور مزید اضافہ کیا۔ "کیا اس وقت تمہیں اپنی بیٹی کا خیال نہیں آیا...... جب میری ماں کو تم نے اس کا سب کچھ غصب کر کے اور ان کے حق پر ڈاکہ ڈال کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے واسطے چھوڑ دیا تھا...... اس لئے بھول جاؤ کہ تم مجھے بیٹی کے رشتے کا پاس دلا کر بے وقوف بنا سکتے ہو ہاں ایک رعایت تم سے کر سکتی ہوں۔"

"بب...... بتاؤ...... جلدی" دوسری طرف سے غالباً واثق علی نے بھی وقت ضائع



کرنا مناسب نہیں جانا اور مختصراً بولا۔

"میں ایک شرط پر تمہیں وہ ڈسک لوٹا سکتی ہوں اس کے لئے تمہیں مجھ سے ایک سودا کرنا پڑے گا۔"

"کیسا سودا؟" واثق علی نے بہ عجلت پوچھا۔

"اس ڈسک کے بدلے میں تمہیں میری ماں کا وہ سب روپیہ پیسہ لوٹانا ہوگا جو تم نے دھوکے سے ہتھیا لیا تھا۔" سعدیہ نے اپنی بات ختم کی تو دوسری طرف ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی، پھر واثق علی کی آواز سنائی دی۔

"مم...... میں نے تو تمہاری ماں سے کوئی روپیہ نہیں ہتھیایا تھا اس نے تمہیں غلط بتایا ہوگا۔"

"واثق علی صاحب! میں اتنی بچی نہیں ہوں...... سب جانتی ہوں میں...... تمہیں بھی اور اپنی ماں کو بھی...... میرا خیال ہے تم وقت ضائع کر رہے ہو پھر ٹھیک ہے کورٹ میں تم سے ملاقات ہوگی۔" سعدیہ نے کہا اور تاثر یہی دیا کہ فون بند کرنے والی ہے...... مگر دوسری طرف سے واثق علی نے ہکلاتے ہوئے فوراً کہا۔

"نن...... نہیں...... بتاؤ کتنا پیسہ چاہئے...... لاکھ دو لاکھ۔"

اس کی بات سن کر سعدیہ نے کرختگی سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چبائے اور اسی لہجے میں بولی۔ "پورے تین کروڑ واثق علی صاحب! بولو منظور ہے۔" سعدیہ نے کہا اس وقت اس کا چہرہ شدت جوش سے تمتما رہا تھا وہ چہرہ اس سے ایک وکیل سے زیادہ زخم کھائی ہوئی شیرنی سے مشابہہ ہو رہا تھا۔

"مجھے تھوڑی مہلت چاہئے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ہرگز نہیں۔" سعدیہ قطعیت سے بولی۔ "صرف کل صبح تک کی مہلت ہے تمہارے پاس...... تین کروڑ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بعد وہ ڈسک تمہیں مل جائے گی۔ اور سنو مجھے تنہا مت سمجھنا، اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو خود کو قانون کی گرفت سے نہیں بچا پاؤ گے۔ میں صبح دس بجے تک انتظار کروں گی بصورت دیگر کورٹ میں ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر سعدیہ نے ریسیور رکھ دیا وہ بری طرح ہانپ گئی تھی۔

⊛⊛⊛

اگلے دن دس بجے سے کچھ منٹ پہلے ہی واثق علی نے سعدیہ کو اپنا اکاؤنٹ چیک کرنے کو کہا۔ لگ بھگ گھنٹے بھر بعد سعدیہ کو جب اطمینان ہو گیا کہ واثق علی نے حسب وعدہ تین کروڑ کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی ہے تو اس نے واثق علی کو ڈسک لوٹانے کے لئے شام تک کا وقت مانگا اگرچہ اس پر واثق علی نے بحث کرنی چاہی...... لیکن کیونکہ گیند بدستور سعدیہ کے کورٹ میں تھی اس لئے اسے سعدیہ کی یہ بات بھی ماننی پڑی اور خاموش ہو گیا...... یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سعدیہ فوراً کمال سے ملنے کو چل دی۔ اس کا ملیح چہرہ اس وقت عجیب تاثرات سے پر تھا۔

⊛⊛⊛

یہ اس دن شام کے پانچ بجے کا وقت تھا...... سعدیہ اپنے گھر کے کمرے میں ٹیلی فون کے قریب بیٹھی تھی۔ غالباً اسے کسی کے فون کا انتظار تھا پھر معاً ہی فون کی بیل گنگنائی۔ سعدیہ نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ ''انسپکٹر ثناء اللہ بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے انسپکٹر ثناء اللہ کی جوش میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ویری گڈ! بس ذرا آخری بار میں واثق علی سے بات کر لوں۔ اس کے ٹھیک پانچ منٹ بعد تم اپنی کارروائی شروع کر دینا۔'' سعدیہ نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا تو انسپکٹر دوبارہ بولا۔

''ٹھیک سعدیہ صاحبہ! ہم سب وہیں موجود ہیں تم اپنا آخری کام بخوبی نمٹا لو۔''

اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر سعدیہ نے ایک نمبر ملایا...... چند لمحوں بعد ہی دوسری جانب سے واثق علی کی قدرے گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''ہم...... میں واثق علی بول رہا ہوں بیٹی! خدا کے لئے اب تو میری ڈسک واپس کر دو۔ میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں رقم بھی جمع کروا دی ہے۔'' اس کی بات پر سعدیہ کے چہرے پر معاندانہ سی مسکراہٹ رقص کر گئی۔

''بڑی جلدی ہے تمہیں ڈسک لینے کی... ابھی تو میرا آخری ادھار باقی ہے واثق علی!''

اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا اور واثق علی کی مرتعش آواز ابھری۔



''کیا مطلب؟''

''میری بات غور سے سنو واثق علی!'' سعدیہ کے لہجے میں صدیوں پرانا حساب چکانے والی سختی عود کر آئی۔ بولی ''یاد کرو اچھی طرح سے وہ کٹھور لمحہ جب تم نے انتہائی بے حسی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری ماں کا دھوکے سے سب کچھ غصب کر کے دھتکار دیا تھا۔ بالکل اسی طرح میں بھی تمہیں دھتکار رہی ہوں۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گلنے سڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ واثق علی...! پولیس تم تک پہنچنے ہی والی ہو گی بلکہ پہنچ چکی ہو گی۔''

اس کے ساتھ ہی سعدیہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اس کے فرطِ جوش سے مرتعش چہرے پر ایسی کیفیات کروٹیں لینے لگی تھیں جیسے وہ چشمِ تصور میں واثق علی کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہی ہو۔

دراصل سعدیہ نے بڑی چالاکی سے تین کروڑ کی رقم واثق علی سے لینے کے بعد بجائے اسے ڈسک لوٹانے کے انسپکٹر ثناء اللہ کے حوالے کر دی تھی اور ساتھ ہی اسے واثق علی کو فوری گرفتار کرنے کا بھی گرین سگنل دے دیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب برسوں بعد طمانیت لوٹ آئی تھی۔ ایسی طمانیت جو دکھ بھرے ماضی کی سلگتی راکھ تلے دبی رہی تھی اور آج وہ راکھ سرد ہو چکی تھی۔

⊛⊛⊛

واثق علی کی گرفتاری کے کچھ عرصے بعد کمال اور سعدیہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو چکے تھے۔ حجلۂ عروسی میں حسب عادت کمال سعدیہ کو ستا رہا تھا۔ ''ارے بھئی وہ مان گئے میدان مار کر ہی چھوڑا لیکن مجھے ایک شکایت ہے تم سے......''

''کون سی؟'' سعدیہ نے اپنا گھونگھٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کھنکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم نے مجھے اپنی جنگ میں شامل نہیں کیا اور تنہا ہی میدان مارا۔'' سعدیہ اس کی بات پر چونک کر دھیرے سے بولی۔

''ایسی بات نہیں کمال! میری اس پوری جنگ میں تمہاری اور انکل (ایڈووکیٹ رانا الطاف) کی پوری پوری مدد شامل تھی اور تمہاری وجہ سے تو میرا مورال بڑھتا رہا تھا۔''

سعدیہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور کمال نے بے اختیار محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے قریب کر لیا۔

❁❁❁

جس روز کمال اور سعدیہ کی شادی طے پائی تھی...... اسی روز دادو اور شائلہ بھی ہمیشہ کے لئے زندگی کے ساتھی بن گئے تھے۔ دادو گوٹھ سے اپنے ماں باپ اور ماما اللہ وسایا کو بھی لایا تھا۔ عین شب ملاپ دادو نے شائلہ سے پیار کے لہجے میں کہا۔

"شائلہ! پتہ ہے ہم اپنی زال (بیوی) کو مرد کی قسمت کا جھومر سمجھتے ہیں اور مجھے یقین ہے تم سے شادی کرنے کے بعد میری تقدیر کا تارا ضرور چمک اٹھے گا۔"

اس کی بات سن کر شائلہ کے شہابی گالوں پر ان گنت شفق رنگوں کی قوس قزح پھوٹ پڑی تھی۔

(ختم شد)